Title - HINDUSTAN KI POLITICAL ECONOMY

Creator - Amar Nath Bali.

Publisher - Punjabi Press (Lahore).

Date - 1923.

Pages - 312

Subjects - Muashiyaat - Siyasiyaat .

ہندوستان کی
پولیٹیکل اِکانومی

امرناتھ بالی ایم اے

Revised Price

ہندوستان کی پولیٹیکل اکانومی

از

امرناتھ بالی ایم اے (کلکتہ) پروفیسر آف اکانومکس ڈی اے وی کالج لاہور

جسے

ٹیکسٹ بک کمیٹی / پنشنل بورڈ آف ایجوکیشن پنجاب لاہور

کے لئے

لاجپت رائے پرتھوی راج ساہنی تاجران کتب لاہور نے

شایع کیا

پنجابی پریس لاہور میں باہتمام لالہ دیوان چند پرنٹر چھپوایا

فہرست مضامین

(از بھائی پرمانند جی - ایم - اے)

قومی تعلیم کے لئے ایک ہی شرط ہے کہ تمام قومی تعلیم شروع سے لے کر آخر تک قومی زبان میں دی جائے - سرکاری سلسلہ تعلیم قومی نہ ہونے کی وجہ سے اگرچہ کالجوں میں اعلےٰ تعلیم دی جاتی ہے - مگر وہ انگریزی کے ذریعہ ہونے سے قومی نہیں کہلا سکتی - یہی سبب ہے - کہ باوجودیکہ وہ تعلیم اتنی دیر سے جاری ہے - ہماری زبان میں اعلیٰ تعلیمی کتابیں نہیں ملتیں ؞

پنجاب کے جاتیہ شکھشا پریشد کے لئے قدرتی طور پر پہلا قدم یہ تھا - کہ مختلف علوم پر ہندوستانی زبان میں کتابیں مہیا کیجائیں چنانچہ ابتدائی تعلیم کے متعلق چند پہلی کتابیں لکھی جا چکی ہیں - قومی تعلیم کا خیال پھیلنے سے ایسے نوجوان پیدا ہو گئے ہیں - جو کہ اپنی زبان میں کتابیں پڑھنے کی خواہش رکھتے ہیں - مگر ان کے سامنے بڑی دقت یہ ہے - کہ ایسی کتابیں دستیاب نہیں ہوسکتیں - ملک میں علوم کی ترقی کرنے کا پہلا زینہ یہی ہوگا - کہ ہم اپنی ملکی زبان کو بیش قیمت اور اعلےٰ کتابوں سے مالدار کر دیں - اس غرض کو سامنے رکھکر جاتیہ شکھشا پریشد کی طرف سے میں نے پروفیسر امرناتھ بالی سے درخواست کی کہ وہ پولیٹیکل اکانومی کے مضمون پر ہندوستانی نقطہ خیال

سے ایک کتاب لکھ دیں۔ میں ان کا شکرگزار ہوں۔ کہ اُنھوں نے میری درخواست کو قبول کر لیا۔ اور مجھے خوشی ہے۔ کہ وہ کتاب چھپ کر اس وقت ناظرین کے پیش کی جاتی ہے۔ اور ہندی زبان میں بھی چھپ رہی ہے ؞

پروفیسر امر ناتھ بالی کی تعریف میں مَیں یہاں پر لکھنا غیر ضروری سمجھتا ہوں۔ پنجاب اور کلکتہ یونیورسٹیوں کے امتحان میں اُنھوں نے بڑی شاندار کامیابی حاصل کی ہے۔ اور اب وُہ دیانند کالج میں یونیورسٹیوں کے اعلیٰ پروفیسروں میں سے ہیں۔ میں طلبا اور تمام شائقین سے سفارش کرتا ہوں۔ کہ وہ کتاب کے مطالعہ سے فائدہ اُٹھائیں ؞

"بھائی پرمانند"

دیباچہ از مصنف

ہندوستان کی پولیٹکل اکانومی اردو میں لکھنے کا خیال پہلے پہل ۱۹۱۲ء میں پیدا ہوا۔ جب شریمان لالہ لاجپت رائے جی نے لیکھاک کو تلک سکول آف پالیٹکس میں ہندوستانی اقتصادیات پر لیکچر دینے کے لئے مقرر کیا۔ اس سے پہلے ورنیکلر میں کتاب لکھنا تو درکنار اس میں پولیٹکل اکانومی پر لیکچر دینا بھی محال نظر آتا تھا۔ لیکن یہ سلسلہ تلک سکول کے پروگرام میں تبدیلی کے سبب سے دیر تک جاری نہ رہ سکا۔ اور اردو میں پولیٹکل اکانومی پر مضمون طیار کرنے کا خیال مجھے بھی چھوڑنا پڑا۔ اور شاید یہ کتاب اب بھی نہ لکھی جاتی۔ اگر میرے پوجنیہ بزرگ بھائی پرمانند جی میرے ذمہ یہ کام نہ لگاتے۔ یہ کتاب دو ماہ کے قلیل عرصہ میں لکھی گئی ہے۔ اور جلدی میں لکھی گئی ہے۔ مضامین کو دہرانے اور اعداد کو آخری تاریخ تک لانے کا موقعہ نہیں ملا۔ مضمون کے اصطلاحی الفاظ کو اردو جامہ پہنانا یا اُن کا مطلب اردو میں ادا کرنا ایک بڑی مشکل کا کام رہا ہے۔ کیونکہ اردو میں اس مضمون پر پہلے کوئی کتاب نہ تھی۔ ایسے بھی میری اردو کی لیاقت بہت محدود ہے اس لئے ٹوٹی پھوٹی بے محاورہ اردو میں مطلب کو سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ "پولیٹکل اکانومی" کی تھیوری اور ہندوستان کی پولیٹکل اکانومی دو علٰحدہ مضمون ہیں اور ان میں سے ہر ایک پر ایک علٰحدہ واضح کتاب لکھی جا سکتی ہے۔ لیکن بھائی جی کے کہنے پر یہاں دونوں کو ملانے کی کوشش کی گئی ہے۔ جس سے کتاب کی ترتیب میں فرق واقع ہو گیا ہے۔ قیمتوں کے تقرر پر بہت کم لکھا جا چکا ہے اور ہندوستانی پیداوار کا مضمون ذرا لمبا ہو گیا ہے۔ اور جو مضمون کتاب کے درمیان نہیں آ سکتے تھے۔ وہ متفرق میں دیئے گئے ہیں جو ہندوستانی اقتصادیات پر جتنی کتب بھی لکھی جا چکی ہیں۔ وہ چند ایک کو چھوڑ کر شاذونادر ہی ملکی اور نسلی تعصب سے مبرا ہوتی ہیں۔ اور یہ نقص ہر قسم کی سرکاری و غیر سرکاری کتب میں پایا جاتا ہے۔ جس سے مضمون کے غیر جانبدارانہ مطالعہ میں اور سچائی تک پہونچنے میں دقت ہوتی ہے۔ اس کتاب میں اس تعصب سے اوپر اٹھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اور انگلستان کے مالی و اقتصادی تعلقات

ہیں جہاں کہیں بے انصافی کی بو پائی جاتی ہے۔ وہاں نکتہ چینی سے پرہیز نہیں کیا گیا لیکن جہاں شک وشبہ کی گنجائش نہیں۔ وہاں یہ بات بھی واضح کر دی گئی ہے۔ ایک اور بات قابل نوٹ یہ ہے۔ کہ ہندوستانی پیداوار۔ تجارت۔ کرنسی اور قیمتوں کے اعداد جو دئے گئے ہیں۔ وہ سارے کے سارے سرکاری رپورٹوں پر مبنی ہیں۔ اور یہ بات قابل افسوس ہے۔ کہ ہندوستان میں اس قسم کے اعداد جمع اور شایع کرنے کا ابھی تک کوئی غیر سرکاری ذریعہ نہیں ہے۔ جس سے اعداد کی درستی پرکھی یا تائید کی جاسکے۔ یہ کتاب قومی یونیورسٹیوں۔ سکولوں اور کالجوں کے طالبعلموں کے لئے ہی نہیں لکھی گئی۔ اپنے دیش کے مالی و اقتصادی حالات کا جاننا ہر ایک شہری کا فرض ہے۔ پولیٹیکل بے چینی کی تہ میں بسا اوقات اقتصادی وجوہات ہوتی ہیں۔ ان وجوہات کو سمجھنے اور مالی حالات کو جاننے کے لئے عام لوگوں کو جو خاص مطالعہ نہیں کر سکتے۔ یہ کتاب مفید ثابت ہوگی۔ مجھے اس کتاب کے لکھنے میں کئی سجنوں سے مدد ملی ہے۔ جن میں سے پنڈت سری رام جی شرما کی امداد خاص طور پر قابل شکریہ ہے۔ پنڈت سری رام جی ایک اعلے درجہ کے مضمون نویس ہیں۔ اور اُن کے مضامین اکثر اُردو رسالوں اور اخباروں میں شایع ہوتے رہتے ہیں۔ جن میں سے چند ایک اس کتاب میں بھی دئے گئے ہیں۔ ان کے علاوہ دو تین اور مضمون بھی انھوں نے میری درخواست پر اس کتاب کے لئے لکھے ہیں۔ اور دیگر طرح بھی کتاب کی ترتیب وغیرہ میں مجھے امداد دی ہے۔ لالہ موہن لال جی۔ بی۔ اے پروفیسر قومی مہاودیالہ لاہور نے بھائی پرمانند جی کی آگیا نوسار اس کتاب کا آریہ بھاشا میں ترجمہ کر دیا ہے۔ اُمید ہے کہ ہندی کی ایڈیشن بھی جلد طیار ہو جائے گی ؞

امرناتھ بالی۔ ایم۔ اے (کلکتہ)

ڈی۔ اے۔ وی۔ کالج۔ لاہور

۱۹۔ فروری ۱۹۲۳ء

ہندوستان کی پولیٹیکل اکانومی

ہندوستان کی آرتھک یا مالی دشا پر وچار کرنے سے پہلے جو مشکل درپیش آتی ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ اس مطالعہ میں ہمیں کسی نہ کسی سائنس کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ جس سے کہ ہم نکتہ چینی یا رائے ظاہر کرنے کے لیئے کوئی معیار مقرر کر سکیں مالی مطالعہ کے لیئے مغرب کی پولیٹیکل اکانومی کا سہارا لینا ازبس ضروری ہے۔ بہت سے معاملات ہمیں ان کے اصولوں کی کسوٹی پر پرکھنے ہونگے۔ پیشتر اس کے کہ ہم کوئی رائے قائم کر سکیں یا کسی Economic [illegible] مالی معیار پر نکتہ چینی کر سکیں لیکن ایسا کرنے سے پیشتر ہمیں یہ ثابت کرنا چاہیئے۔ کہ مغرب کی پولیٹیکل اکانومی کے اصول ہندوستان کے حالات پر بھی اسی طرح حاوی ہیں۔ جس طرح مغرب کے حالات پر۔

کیونکہ اگر یہ ثابت نہ ہو سکے۔ اور ہندوستان کے تمدنی۔ ملکی و مالی حالات وخیالات مغرب کے تمدن و معراج سے جدا ہوں۔ تو ان اصولوں کو ہندوستان پر برتنا ایک سخت غلطی ہوگی۔ وہ باتیں جو مغرب کے حالات کے مطابق ہیں وہ مشرق کے نہ صرف علیحدہ و متبائن شدہ حالات میں درست نہیں ہو سکتیں

اسی خیال کو لیکر ہندوستان کے چند اک Economists کا خیال ہے۔ کہ مغرب کی پولیٹیکل اکانومی کے اصول ہندوستان پر نہیں برتنے چاہئیں۔ اس دعوے کو دو طرح پیش کیا جاسکتا ہے۔

پہلی بات جو کہی جاسکتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ ہندوستان میں سوسائٹی کی بناوٹ اور صنعتی ساخت مغرب کی سوسائٹی کی بناوٹ و صنعتی ساخت سے بالکل علیحدہ ہے یعنی جس کو انگریزی میں Economic organisation کہتے ہیں۔ وہ دونوں ملکوں کی بالکل جداگانہ ہے۔ مثال کے طور پر (۱) پہلے آبادی کی تقسیم کو لیجئے۔ انگلینڈ میں 78.01 فی صدی آبادی شہروں میں رہتی ہے۔ جرمنی میں 45.6 فی صدی لیکن ہندوستان کی شہری آبادی صرف 9.5 فی صدی ہے اور اگر ہم شہر کی اور بھی تنگ تعریف کریں۔ یعنی وہ جگہ جہاں کم از کم ایک لاکھ آدمی بستے ہوں تو ہندوستان میں صرف 30 ایسے شہر نکلتے ہیں - اور ان تیس شہروں کی کل آبادی 2.2 فی صدی کل آبادی کا ہے۔ انگلینڈ میں ایسے شہروں کی آبادی کل آبادی کا 45 فی صدی ہے۔ جرمنی میں 21 فی صدی فرانس میں 14 فی صدی۔

پیشہ وار تقسیم سے بھی ایسے ہی نتائج نکلتے ہیں۔

انگلستان میں ۱۹۱۱ء کی مردم شماری کی رو سے

آبادی کا 58 فیصدی حصہ صنعتی کاموں میں لگا ہوا تھا۔
" 13 " تجارت میں
" 8 " زراعت میں
" 14 " نوکری پیشہ تھا۔

ہندوستان میں آبادی کا 71 فی صدی زراعت اور چراگاہی میں اور باقی ماندہ اور سب پیشوں میں ہے جس میں سے صرف ایک فی صدی حصہ ایسا ہے۔ جو ایسے کارخانوں اور کانوں وغیرہ میں لگا ہوا ہے۔ جو مغرب کے طریق پر چلائے جاتے ہیں یعنی 31347001/4 آبادی میں سے تقریباً 22 کروڑ 7 لاکھ صرف خام اشیا کی پیداوار میں مصروف ہیں۔ صرف 3 کروڑ 53 لاکھ صنعتی پیشوں میں ہیں۔ ایک کروڑ 71 لاکھ کی تجارت میں اور ایک کروڑ 91 ہزار سرکاری نوکری و آزاد پیشوں میں ہیں۔

ان اعداد و شمار سے صاف ظاہر ہے۔ کہ ہندوستان کی صنعتی ساخت جہاں تک آبادی کی تقسیم کا شہروں اور دیہات سے اور مختلف پیشوں سے تعلق ہے۔ مغرب کی صنعتی ساخت سے بالکل علیحدہ ہے۔ ایک دو اور باتیں جو مندرجہ بالا اعداد سے عیاں ہیں وہ یہ ہیں۔ کہ ہندوستان جہاں ایک

(۱) زراعتی ملک ہے وہاں انگلستان ایک صنعتی ملک ہے۔

(۲) صنعتی ملک ہونے سے فیکٹری یا ایک کارخانہ انگلستان کی ساری آبادی کا ایک چھوٹا سا نمونہ پیش کرتا ہے یعنی انگلستان میں جہاں Unit of Economic organisation ایک کارخانہ ہے۔ وہاں ہندوستان کی آبادی کا اکائی ایک گاؤں ہے۔

(3) جہاں انگلستان کی فیکٹری اپنے ممبروں کے لیئے ساری ضروریات مہیا کرنے میں ناکافی ہے۔ اور اس لیئے اس کو ضرورت ہے کہ وہ اپنی ساختہ شدہ اشیاء باہر بھیجے۔ اور کھانے پینے کی چیزیں اندر منگوائے

وہاں ہندوستان کا ایک گاؤں ایک Self Sufficient unit ہے یعنے اپنے ممبروں کی ساری ضروریات کو پورا کرتا ہے اور اگر اس کا تعلق باہر کی دنیا سے کچھ عرصہ کے لئے توڑ دیا جائے۔ تو بھی اس کا گذران چل سکتا ہے۔

(۷) انگلستان کی آبادی زیادہ تر کارخانوں میں منقسم ہونے سے ایک سوسائٹی یا سرمایہ دار اور مزدوروں کی جماعت کا نقشہ پیش کرتی ہے۔ جہاں سوچنے۔ کارخانہ چلانے اور اشیا بنانے کا کام مختلف آدمیوں پر منقسم ہے۔ مزدور کا کام صرف مقررہ وقت کام کرنا اور تنخواہ لینا ہے۔ نفع و نقصان کی ذمہ واری دوسروں کے کندھوں یعنی سرمایہ داروں کے کندھوں پر ہے۔

ہندوستان میں زیادہ تر آبادی کاشتکار ہے۔ سارا کام زمیندار اپنے کنبے کی مدد سے کرتا ہے۔ اور خود ہی نفع و نقصان کا مالک ہے۔ دوسرے الفاظ میں Entrepreneur یا سرمایہ دار کا کام اور مزدور کا کام جہاں ولایت میں دو مختلف شخصوں کا کام ہے وہاں ہندوستان میں یہ دونوں فرائض ایک ہی شخص کے کندھے پر ہیں۔

ولایت اور ہندوستان کی صنعتی ساخت میں اتنے بھید ہونے سے ولایت کے صنعتی و حرفتی حالات میں پیدا شدہ پولیٹیکل اکانومی یا Economic[illegible] کی تھیوری ایسے شخصوں کے خیال میں ہندوستان پر [illegible] نہیں ہو سکتی۔

[illegible] یا [illegible] اور [illegible] خیال ہے جو عام طور پر پیش کیا جاتا ہے [illegible] ہندوستان اور ولایت کی سوسائٹی بناوٹ میں

یورپ کے Economic ideal طور پر جدا ہے۔ بلکہ
یعنی دنیاوی نکتہ خیال اور معیار بھی مغرب اور مشرق کے آپس سے مختلف
ہیں۔ جہاں پر مغرب والے مادہ پرست اور Materialism
پر اعتقاد رکھتے ہیں۔ وہاں ہندوستان والے روحانیت پسند ہیں اور
Spiritualism پر اُن کا وشواس ہے۔

مثال کے طور پر مغرب والے اپنی ضروریات کو بڑھانے کی فکر میں
رہتے ہیں۔ اور ہندوستان کا اعتقاد اپنی ضروریات زندگی کو جہاں تک
ہو سکے۔ گھٹاتا ہے۔ جہاں ولایت میں دولت پیدا کرنے پر زیادہ زور دیا
جاتا ہے۔ وہاں ہندوستان کا مادی اور اخلاقی معیار اس بات پر زیادہ
مصر ہے۔ کہ دولت کی تقسیم قوم کے مختلف حصوں میں واجب اور ٹھیک
ہو۔

اور اسی طرح ہندوستان میں دولت اور پیداوار آزاد مزدوروں
کے ہاتھوں سے ہے۔ جبکہ مغرب میں دوسروں کے ماتحت کام کرنے والے
مزدوروں کے ہاتھوں میں ہے۔

اس لئے ان باتوں کو مدّنظر رکھتے ہوئے کہ جب آدرش ہی دونوں
قوموں کے علیحدہ ہیں۔ اور ہندوستان والے مادہ پرست ہیں ہی
نہیں یہ کہنا پڑتا ہے کہ مغرب کی
اکانمک تھیوری ہندوستان پر عائد نہیں ہو سکتی۔

پروفیسر رادھا کمل مکرجی نے اپنی کتاب Foundations of
Indian Economics میں اس نکتہ خیال کو بڑی خوبی سے بیان
کیا ہے۔ اور یہ نکتہ خیال کی وضاحت مسٹر جسٹس راناڈے نے اچھی طرح

سے کی ہے۔

اب یہ دونوں نکتہ خیال ٹھیک ہوں۔ تو ہمیں ہندوستان کے مالی اور اقتصادی حالات لکھتے وقت اپنے لئے علیحدہ معیار اور اصول قائم کرنے پڑیں گے۔ نہ صرف یہ بلکہ ہندوستان کی آئندہ مالی ترقی کے لئے تجاویز بھی مختلف سوچنی پڑیں گی۔ اور یہ ماننا پڑیگا کہ جن امور سے مغرب نے مالی طور پر حیرت انگیز ترقی کی ہے۔ ہندوستان کے لئے وہ امور شاید ضرر رساں ہوں۔

ہمارے خیال میں ان دونوں قسم کے نکتہ خیالوں میں مبالغہ آمیزی سے کام لیا گیا ہے۔ ہندوستان کے اقتصادی حالات اور صنعتی ساخت یورپ کے صنعتی ساخت اور اقتصادی حالات سے اتنی مختلف نہیں ہے جتنی کہ بیان کی گئی ہے اور نہ ہی eeon omme ideals یا مادی آدرش میں دونوں قوموں میں اتنا فرق ہے جتنا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے۔

پہلا اعتراض ۲۵ یا ۵۰ سال پہلے کیا جا سکتا ہو تو ہو اب تو اس میں بہت کم سچائی ہے۔ مثال کے طور پر دیہات کی علیحدہ زندگی کا بالکل نہیں تو کم از کم بہت حد تک خاتمہ ہو گیا ہے۔ ہر ایک گاؤں اپنی روزانہ ضروریات زندگی کے لئے شہروں بلکہ غیر ملکوں کے دست نگران ہو رہا ہے۔ مٹی کا تیل۔ دیا سلائی۔ سوئی دھاگہ۔ ہل کے پھالے۔ صابن۔ پہننے والوں کی جوتیاں۔ چھاتے۔ کپڑے وغیرہ بے شمار چیزیں اب باہر سے آتی ہیں۔ اور ان کی بہم رسانی پر اگر کبھی بار رکاوٹ ہو تو گاؤں والوں کو اب اتنی ہی تکلیف ہوتی ہے۔ جتنی مغرب میں ایک کارخانہ میں کام کرنیوالوں کو

اگر ان کو شہروں سے علیحدہ کر دیا جاوے۔

(2) پہلے جو رسم و رواج سے چیزوں کی قیمتیں اور مزدوروں کی مزدوریاں (پنجابی میں جس کو سیپ بولتے ہیں) مقرر تھیں۔ ان کی جگہ اب قیمتیں اور مزدوریاں Competition یا مقابلہ سے مقرر ہوتی ہیں اور ہر وقت تجارتی حالات کے مطابق کم اور زیادہ ہوتی رہتی ہیں۔

(3) جہاں پہلے قیمتیں اور تنخواہیں غلّہ میں ادا کی جاتی تھیں۔ اب نقدی نے ان کی جگہ لے لی ہے۔ لوگوں کی اور خاص کر مزدور کی نقل و حرکت بھی ملک کے مختلف حصوں میں آگے کی نسبت اب بہت بڑھ گئی ہے۔ اور اپنی حالت کو درست بنانے اور مالی ترقی کے واسطے مزدور اب دیہات سے شہروں میں اور ایک صوبے سے دوسرے صوبے میں جانے کو ہر وقت تیار رہتے ہیں۔ ریلوے۔ تار برقی۔ سڑکوں اور ڈاک خانہ نے ان تبدیل شدہ حالات کو لانے میں بہت امداد دی ہے۔ اور اگر غدر سے پہلے کا کوئی سویا ہوا آدمی آج اپنی نیند سے اٹھے۔ تو اس کیلئے ہندوستان کو پہچاننا بہت مشکل ہو جاوے۔

ہندوستان زمانہ تبدیلی سے بہت جلد گذر کر اپنی جگہ یورپ کے ملکوں کے شانہ بشانہ لے رہا ہے۔ اور اس کی مالی اور اقتصادی ترقی بھی اب تک تو اس ہی لائن پر جا رہی ہے۔ جس پر یورپ کے ملکوں کی۔ اس لئے آج کل صنعتی حالات میں دونوں ملکوں میں کوئی بہت بڑا فرق نہیں۔ اس لئے مغرب کے حالات میں پیدا شدہ اکانمک تھیوری ہندوستان کے اقتصادی حالات کو سمجھنے کے لئے بھی اتنی ہی مفید اور کارآمد ہے بلکہ ضروری ہے جتنی کہ مغربی ممالک کے حالات کو سمجھنے کے لئے۔

باقی رہا مالی نکتہ خیال یا مالی ورزش کا سوال ہمارے خیال میں اس میں پہلے نکتہ خیال کی نسبت بھی کم سچائی ہے۔ اگرچہ بچوں سے لے کر بوڑھوں اور بڑے بڑے لکھوں تک کے دل میں یہ خیال سما رہا ہے۔ پلیٹ فارم اور پریس سے تقریباً روزانہ یہ بات ہمارے کان میں پڑتی ہے کہ مغرب والے مادہ پرست ہیں اور ہندوستان والے روحانیت پرست اگرچہ بہت سے اشخاص جو ایسے کلمے منہ سے نکالتے ہیں۔ ان لفظوں کے شاید معنوں کو بھی نہیں سمجھتے۔ مادہ پرستی کا اگر دولت پیدا کرنے اور جمع کرنے سے مطلب ہے۔ تو ہندوستان والے بھی اتنے ہی مادہ پرست ہیں۔ جتنے مغرب والے ہندوستان کا اوسط آدمی اپنی ضروریات کو بڑھانے میں اگر اس کے پاس زر ہو اتنا ہی خواہاں ہے جتنا کہ ایک انگریز اور دولت جمع کرنے میں جو تکالیف ہوں۔ اُن کو دور کرنے میں ایک اوسط انگریز کی طرح وہ بھی آسمان کے قلابے ملانے کی فکر میں رہتا ہے۔ اگرچہ یہ بات دوسری ہے کہ صدیوں کی غلامی سے اور پولیٹیکل حالات ناموافق ہونے سے اُس میں انگریز جیسی ہمت اور حوصلہ نہیں رہا۔ ہندوستان کا ساہوکار۔ سرمایہ دار مزدور۔ ڈاکٹر۔ تاجر اور کسان مغربی ممالک کے ساہوکار۔ سرمایہ دار۔ مزدور ڈاکٹر تاجر اور کسان سے ہرگز اپنے خیالات جذبات اور خواہشات میں مختلف نہیں۔ ہندوستان میں کتنے آدمی ہونگے۔ جن کو دولت جمع کرنے کا موقعہ ہو اور وہ اس سے فائدہ نہ اٹھائیں؟ اور کیا ایسے آدمیوں کی مغرب میں کمی ہے۔ مہاتما گاندھی و مہاتما منشی رام اگر ہندوستان میں ہیں۔ تو کیا مغرب میں ایثار نفس انسان نہیں ہیں۔ جو دن رات مخلوق خدا کی راہ میں لگے ہوئے ہیں۔ مانا کہ ایسے آدمیوں کی ہندوستان میں کثرت ہے۔

لیکن کیا ایسے نفس کش اور تپسوی پرشوں کی موجودگی سے ایک قوم کی قوم کو ہی تپسوی کہا جا سکتا ہے ؟۔ یہ افرادی طور پر اچھے ہیں لیکن ہم نے مطالعہ کرنا ہے بہ حیثیت مجموعی قوم کا یا اوسط ہندوستانی کا ۔ اور جب ہم اس طرح مطالعہ اور مقابلہ کرتے ہیں تو ہمیں چنداں فرق نہیں دکھتا ۔

اس لئے یہ کہا جا سکتا ہے ۔ کہ مادہ پرستی وغیرہ الفاظ جن کا استعمال روزمرہ کیا جاتا ہے ۔ بہت حد تک یا تو مغرب اور مشرق دونوں کے لئے ٹھیک ہیں یا دونوں کے لئے غلط ۔ کم از کم عملی جیون میں ہندوستان اور انگلستان کی آبادی کے دنیاوی پہلو میں کوئی فرق نہیں ۔ زبانی ہم جتنا مرضی ہے کہہ لیں ۔ دراصل انسانی خصلت تمام دنیا میں ایک جیسی ہے جذبات و خواہشات مختلف نہیں اور دنیاوی کاروبار کی اغراض بھی وہی ہیں ۔ اپنی حالت مالی کو آسودہ تر بنانے کی ہندوستان میں بھی اتنی ہی زبردست خواہش ہے جتنی انگلینڈ میں ۔ اور اگر ہندوستان میں زیادہ تر آبادی کی ضروریات محدود ہیں ۔ اور زندگی سادہ ہے ۔ تو اسکی کارن لوگوں کی غربت اور ملک کا افلاس ہے نہ کہ ہندوستانیوں کی دیدہ دانستہ کش نفسی ۔ باقی رہا یہ سوال کہ ہندوستان میں پیدائش دولت کی نسبت تقسیم دولت پر زیادہ زور ہے ۔ سو اس میں بھی بہت کم سچائی ہے ۔ دولت کی مختلف جماعتوں میں تقسیم یہاں بھی اتنی ہی پر از غیر انصافی ہے جتنی مغرب میں سرمایہ دار کا مزدور کے ساتھ ۔ زمیندار کا مزارعہ کے ساتھ ۔ مالک کا نوکر کے ساتھ ویسا ہی برا سلوک ہے ۔ بلکہ زیادہ برا ہے جتنا مغرب میں ۔ اور وہی Exploitation لوٹ کھسوٹ بھی مذہب لوگوں کی امیروں کی فائدے کے لئے یہاں ہے جیسی کہ

مغرب میں۔

اس طرح یہ صاف ظاہر ہے کہ ہندوستان اور مغربی ممالک کی انڈسٹریل آرگنیشن اور مالی آدرش یعنی Economic ideals میں بہت کم فرق ہے۔ اس لئے ہندوستان کے اقتصادی حالات کو سمجھنے افلاس اور غربت کی گتھی کو سلجھانے۔ اور آئندہ ترقی و حصول دولت کے لئے ذرائع سوچنے اور برتنے میں ہمیں بھی ان ہی اصولوں کا استعمال کرنا پڑیگا۔ جن کا وعظ Political Economy کرتی ہے۔ اور جن اصولوں پر چل کر مغرب نے مالی طور پر اتنی حیرت انگیز ترقی کی ہے۔ اگرچہ ایسا کرتے ہوئے کبھی ہم ہندوستانیوں کے خاص حالات کو نظرانداز کرنے میں منجانب حق نہ ہونگے۔

کسی مادی شے کے بنانے کے لئے چار چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے جن کو انگریزی میں معاونِ پیداوار یعنی Factors of production کہتے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک مکان کی تعمیر کو لیجیئے۔ سب سے پہلے مٹی۔ چونا سرخی۔ لکڑی اور کچھ لوہے کی ضرورت ہے۔ ان اشیا کے بغیر مکان کی تعمیر کا خیال لانا ہی فضول ہے۔ لیکن یہ اشیا قدرت کی طرف سے انسان کو مفت عطا ہوئی ہیں۔ اور جس صورت میں قدرت نے ان کو ہمیں دیا ہے۔ اس صورت میں مکان کی تعمیر میں وہ چنداں مفید بھی نہیں ہیں۔ مٹی کو جب تک کھود کر لا کر جس جگہ مکان بنوانا ہو وہاں لایا نہ جاوے وہ ہمارے کسی فائدہ کی نہیں۔ پھر ضرورت ہے کہ لکڑی کی کاٹ چھانٹ کی جاوے اور جب ضرورت دروازے کھڑکیاں اور شہتیر کی صورت میں اس کو لایا جاوے۔ یہ ان سب کاموں کے لئے انسانی محنت یا مزدوری کی

ضرورت ہے۔ اس لئے جہاں قدرت کی طرف سے مفت عطا ہوئی ہوئی چیزوں کو ہم پہلا ذریعہ دولت پیدا کرنے کا کہینگے۔ وہاں محنت مزدوری کو دوسرا یا ذریعہ کہینگے۔ پہلے factor کو بعض اوقات انگریزی میں صرف land یا زمین ہی کہا جاتا ہے۔ لیکن اس سے مراد ساری قدرت کی اشیاء ہیں۔ جو خام حالت میں انسان کو مفت مل گئی ہیں۔ اور جن کا استعمال انسان کرتا ہے۔ مثلاً دریا سمندر۔ زمین جنگل۔ جھیلیں۔ آگ۔ ہوا۔ پانی۔ دھاتیں وغیرہ۔

اب صرف مزدوری اور خام اشیا مٹی وغیرہ ہی دستیاب ہوں۔ تب بھی مکان بنوانا مشکل ہے۔ مٹی کی اینٹیں بنانے کے لئے سانچوں کی ضرورت ہے۔ لوہے سے آرہ وغیرہ اور ہتھیار بنانے کی ضرورت ہے۔ درختوں کی چھالوں سے رستے پہلے ہونے چاہئیں جب یہ چیزیں ہوں تب اُن کی مدد سے ہم خام اشیاء کو قدرتی حالت میں لا سکتے ہیں۔ سانچے۔ ہتھیار رستے وغیرہ بالواسطہ طور پر مکان میں نہیں لگائے جاتے۔ وہ ایسی دولت ہیں جن کا استعمال اور دولت پیدا کرتا ہے یعنی مکان بنانا۔ ایسی چیزوں کو یا دولت کو سرمایہ کہتے ہیں۔ انگریزی میں اس کو Capital کہتے ہیں۔ اس لئے ثابت ہوا۔ کہ مکان کی تعمیر کے لئے ایک تیسرے factor کی ضرورت ہے۔ لیکن زمین سرمایہ اور مزدوری تینوں کے ہوتے ہوئے بھی ایک انجینئر کی ضرورت رہتی ہے۔ جو اپنے دماغ میں مکان کا ایک مکمل نقشہ تیار کرے۔ اور اس بات کا فیصلہ کرے کہ مصالحہ کتنا چاہئے۔ مزدور کتنے چاہئیں۔ اور سرمایہ کتنا لگیگا۔ اور ان تینوں کی مناسب تعداد کے استعمال پر نگہبانی کرے۔ انجینئر اگر نہ ہو تو مزدور۔

سرمایہ کی مدد سے اینٹ۔ پتھر۔ لکڑی اور لوہے کے انبار تو لگا دینگے۔ لیکن باترتیب مکان نہیں بن سکیگا۔ اس لئے ایک مکان کے بنانے میں ان چار چیزوں کی ضرورت ہے۔ مکان کیا کسی مادی شے کی پیداوار میں یا ملک میں دولت کے اضافہ کے لئے ان چاروں ذریعوں کو ہونا وشیک ہے۔ زمین سرمایہ۔ مزدوری۔ اور انجنئیر جو سارے کام کی ذمہ داری اپنے کندھوں پر لے۔ ایسے شخص کو پولیٹیکل اکانومی میں Entrepreneur کہتے ہیں اور بعض اوقات اس کو صرف نظام ترتیب یا Organization ہی کہا جاتا ہے۔

ایک ملک کی دولت کا انحصار ان چاروں چیزوں پر ہے۔ اور اُن کے کم و بیش ہونے پر اس ملک کی دولت کی کمی و بیشی کا انحصار ہے جس ملک میں یہ چیزیں بافراط ہیں۔ وہاں کے باشندے دانشمند اور ملک فارغ البال ہوگا۔ اور جہاں ان کی کمی ہے۔ یا ان میں کوئی نقص ہے وہاں غربت ڈیرہ لگائے رکھیگی۔ ان چاروں ذریعوں کے تناسب سے ہی ملک ترقی کر سکتا ہے کسی ایک سے نہیں۔ انگلینڈ میں مزدور چست و ہوشیار۔ سرمایہ بافراط ہے Organization کی کسی طرح بھی کمی نہیں لیکن سوائے کوئلہ لوہا اور چند اک دھاتوں کے قدرتی اشیاء کی ہندوستان کے مقابلہ میں کمی ہے۔ لیکن برطانیہ کی وسیع سلطنت اس کمی کو دور کر دیتی ہے۔

امریکہ ان چاروں چیزوں میں بڑھا ہوا ہے۔ قدرتی وسائل لاانتہا ہیں۔ مزدوری اور سرمایہ کی کمی نہیں۔ اور امریکہ کے کارخانے

اولوالعزمی میں کسی سے پیچھے نہیں۔ اس لئے دنیا کی تجارتی و صنعتی دوڑ میں امریکہ کے آگے رہنے کا بہت امکان ہے۔

ہندوستان کی پیداوار صنعتی و زراعتی کا مطالعہ کرنے سے پیشتر ان چاروں ذریعوں فیکٹرز کا جن پر ملک کی موجودہ دولت اور پیداوار اور آئندہ ترقی کا انحصار ہے مطالعہ کرنا ازبس ضروری ہے۔

اس مطالعہ سے اُن سب اسباب پر روشنی پڑیگی۔ جو ہندوستان کے مادی ترقی کے راستے میں سدِ راہ ہیں۔ اور جن کو دُور کرنے سے ہمارے ملک کی غربت و افلاس کا یقینی علاج ہوسکتا ہے۔

قدرتی دولت

برٹش انڈیا کا کل رقبہ 8 لاکھ 63 ہزار اور چھ سو مربع میل

کاشت شدہ رقبہ 3 لاکھ 82 ہزار نو سو پچھتر ” ”

قابل کاشت رقبہ ایک لاکھ 61 ہزار تین سو اکیاون ” ”

جنگلات ایک لاکھ 4 ہزار 88 مربع میل

ناقابل کاشت رقبہ 2 لاکھ پندرہ ہزار ایکسو چھیاسی مربع میل

کل ہندوستان کا رقبہ جس میں برما کو شامل کرلیں تو 17 لاکھ 50 ہزار مربع میل سے کچھ اوپر ہے۔ جو روس کو چھوڑ کر سارے یورپ کے رقبہ سے بارہ ہزار مربع میل زیادہ ہے۔ صوبہ وار مقابلہ کیا جاوے تو

برما۔ آسٹریا ہنگری کے برابر ہے۔

بمبئی۔ سپین کے برابر۔

یوپی، و بہار اڑیسہ۔ دونوں اٹلی سے بڑے ہیں۔

پنجاب۔ مدراس۔ بلوچستان۔ ممالک متوسط اور برار۔ راجپوتانہ ان میں سے ہر اک صوبہ برطانیہ کلاں سے بڑا ہے۔ جغرافیہ کے طور پر ملک تین بڑے حصوں میں منقسم ہے۔

شمال کی طرف کوہ ہمالہ اور اس کا نچلا علاقہ ترائی ہمالیہ ۱۶۰۰ میل لمبا ایک دیوار کی صورت میں کھڑا ہے۔ پولیٹیکل اہمیت کے علاوہ۔ یہ پہاڑ ہندوستان کا ایک قسم کا اقتصادی پاسبان ہے۔ موسمی ہوا یا برسات سے لدی ہوئی ہوائیں اس سے ٹکر کھا کر وہیں برس جاتی ہیں۔ اور اس طرح شمالی ہندوستان کے لئے ایک پانی کا ذخیرہ مہیا کرتی ہیں۔ اس کی ہمیشہ رہنے والی برف شمالی ہند کے دریاؤں کو لاانتہا پانی دیتی ہیں جن سے وہ سارا سال اپنی روانی جاری رکھتے ہیں۔

ہمالیہ اور ترائی سے اتر کر شمالی ہند کا بڑا میدان شروع ہوتا ہے جو 150 سے ۲۰۰ میل تک چوڑائی میں ہے اور جس کو بجا طور پر ہم دریا سندھ۔ گنگا اور برہم پتر کی وادیاں کہہ سکتے ہیں۔ جتنا مشرق کی طرف جاویں یہ میدان نم اور پانی سے بھرا ہوا ہے۔ اور مغرب کی جانب خشک اور ریتلا ہوتا جاتا ہے۔ ہندوستان کی سب سے بڑھ کر زرخیز زمین اسی شمالی ہند میں ہے اور تقریباً ہر اک قسم کی فصل با افراط ہوتی ہے۔ پرانے زمانہ میں "آریہ ورت" اسی علاقہ کو کہتے تھے۔ جنوب کی طرف جزیرہ نما ہند یا جس کو دکن کا علاقہ کہتے ہیں۔ شروع ہوتا ہے۔ وندھیاچل پہاڑ اس کو شمالی ہند سے جدا کرتا ہے اور اس کے مشرق اور مغرب کی طرف مشرقی اور مغربی گھاٹیں یا چھوٹی پہاڑیاں ہیں۔ یہ علاقہ اونچا سطح مرتفع کی صورت میں ہے جس کی اوسط اونچائی 1500 فٹ ہے۔ سات بڑے دریا اس

میں بہتے ہیں جن سے چند گہری وادیاں بنتی ہیں۔
شمالی ہند کے مختلف حصوں کی زمین مختلف اوصاف رکھتی ہے اور سارے شمالی ہند کی زمین دکن سے جدا اوصاف والی ہے لیکن ایک بات جو ساری ہند کی قابل کاشت زمین کی بابت کہی جا سکتی ہے۔ وہ اس کی مقابلاً خشکی ہے جس سے پانی کی بہم رسانی ہندوستان کی زراعت میں ایک ضروری امر ہو جاتا ہے۔

ایک ملک کی قدرتی دولت کا اندازہ صرف اس کی سطح زمین سے ہی نہیں لگتا۔ بلکہ زمین کے نیچے والی دولت یعنی دھاتیں وغیرہ بھی اتنی ہی ضروری ہیں۔ بلکہ سچ پوچھو تو آج کل دنیا کے مختلف ممالک کی دولت زیادہ تر اس کی زمینی خزانہ پر منحصر ہے۔

ہندوستان کے زمینی خزانہ کا ابھی پورا پورا پتہ نہیں ملا لیکن موجودہ پیداوار اور تحقیقات سے جو پتہ چلتا ہے وہ یہ ہے کہ ہندوستان اس امر میں بھی کسی ملک سے بھی پیچھے نہیں۔

ایک مصنف نے کہا ہے۔ کہ "اگر ہندوستان کو دنیا سے جدا کر لیا جاوے اور اس کی زمینی دولت کی حفاظت باہر کے مقابلہ سے کی جاوے تو اس میں شک نہیں کہ ہندوستان اپنی مہذب ساری ضروریات خود ہی مہیا کر سکتا ہے۔" لیکن باوجود ہندوستان کے اس امر میں دولت مند ہونے کے یہ بات قابل افسوس ہے کہ موجودہ پیداوار مختلف دھاتوں کی بہت کمی ہے جس سے اس ملک کی صنعتی ترقی رکی ہوئی ہے۔ در اصل ابھی تک پورے طور پر نا جیولوجسٹوں نے ہی اس طرف اپنی توجہ کو کھینچا ہے اور انہوں نے بھی صرف ان اشیا کو نکالا اور بنانا شروع کیا جو ممالک غیر یا انگلینڈ

بھیجی جا سکتی تھیں۔ ملک کی اپنی کسی بھی صنعت کے لئے کوشش نہیں کی گئی۔

کوئلہ کی کانیں زیادہ تر جھریا اور رانی گنج میں ہیں۔ حیدرآباد۔ ممالک متوسط ریاست ریوا۔ آسام۔ ڈنڈوت ضلع جہلم میں بھی کوئلہ پایا جاتا ہے۔ لیکن تھوڑی مقدار میں۔ کوئلہ کی کل پیداوار ۱۹۱۹ء میں 2 کروڑ 26 لاکھ 62 ہزار 37 ٹن تھی جس کی مجموعی قیمت 2560 ر۹ ر۱۱ ر۱۰ روپیہ تھی (بحساب ۱۰ روپیہ فی پونڈ)

ہندوستان کی موجودہ کوئلہ کی پیداوار دنیا کی باقی ممالک کے مقابلہ میں کتنی کم ہے وہ مندرجہ ذیل اعداد سے خاص ہے۔

برطانیہ کلاں		272000000
امریکہ	"	443000000
جرمنی	"	231,000,000
باقی دنیا جس میں ہندوستان بھی شامل ہے		94000,000 ٹن

یہ تعداد ۱۹۱۱ کے ہیں۔

صوبہ وار کوئلہ کی پیداوار مندرجہ ذیل نقشہ سے ظاہر ہے۔

بہار و اڑیسہ	15,119,812
بنگال	5,777,632
آسام	291734
ممالک متوسط	447021
حیدرآباد	662196
پنجاب	41893

لوہا اچھی قسم کا ملک کے تقریباً ہر اک حصہ میں پایا جاتا ہے لیکن کہیں بھی کوئلہ کی کانوں کے پاس نہیں جس سے کہ پورا فائدہ اُٹھایا جا سکتا۔ سنگھ بھوم صوبہ بہار میں سب سے بڑی لوہے کی کان ہے۔ اگرچہ بنگال میں میسرا کار میں اور ممالک متوسط میسور۔ برما۔ مہابلشور۔ اور مالوا میں بھی اس کی کافی مقدار ہے

مٹی کا تیل زیادہ تر آسام۔ برما۔ اور بلوچستان میں ہے ضلع کوہاٹ صوبہ سرحد میں بھی گھٹیا قسم کے تیل کی کانیں ہیں لیکن موجودہ پیداوار ہندوستان کی بھی ضروریات کو پورا نہیں کر سکتی۔ ۱۹۱۶ میں کل تیل برما۔ آسام اور پنجاب میں 816ر65ر503 گیلن پیدا ہوا جس کی مجموعی قیمت بحساب ۱ روپیہ فی پونڈ 18343080 روپیہ تھی۔ صوبہ وار پیداوار مندرجہ ذیل تھی:۔

برما	263728807 گیلن
آسام	11808679 〃
پنجاب	114330 〃

نمک کی سب سے بڑی کان کھیوڑہ پنجاب میں ہے لیکن جنوبی برما اور ہزاری باغ میں بہت تھوڑی مقدار میں ہوتا ہے۔

تانبا سیبہ۔ بنگال ممالک متوسط۔ اور جنوبی برما میں۔ ۱۹۱۸ میں کل 52535446 روپیہ کا نکالا گیا اور چاندی 0642784 روپیہ کی ہند میں۔

ایلومنیم کثرت سے برما اور دکن میں ہے۔

ابرق کی ساری دنیا کے کل پیداوار میں سے نصف سے بھی زیادہ ہندوستان میں ہوتی ہے۔ زیادہ مقدار ہزاری باغ اور ضلع گیا صوبہ بنگال میں ہوتی ہے مدراس کے ضلع نیلور میں سے بھی نکلتا ہے۔

۱۹۰۷ میں ہندوستان کی نکاس دنیا کے سارے ممالک سے زیادہ تھی۔ جبکہ یہ ۹ لاکھ ٹن سے بڑھ گئی۔ آج کل ہندوستان روس سے دوسرے درجہ پر ہے بمبئی۔ مدراس۔ وزیگاپٹم۔ حیدرآباد۔ برما اور چھوٹا ناگپور میں بھی پایا جاتا ہے

"یہ بات قابل نوٹ ہے کہ مینگانیز کی نکاس 1992 کے قریب میں شروع ہوئی۔ جبکہ کل 674 ٹن نکالا گیا تھا۔ یہ دھات شیشہ کا سبز رنگ دور کرنے اور فولاد بنانے میں کام آتی ہے۔ ۱۹۱۹ میں پیداوار صرف 5 لاکھ 37 ہزار ٹن تھی۔

شورہ زیادہ تر بہار میں ہوتا ہے۔ لیکن ملکی پیداوار اب گھٹتی جاتی ہے پوٹاس ہندوستان میں کم پایا جاتا ہے۔

سونا کولر کان میسور میں ہوتا ہے۔ حیدرآباد اور ڈھل بھوم صوبہ بہار میں چند ایک کانیں ہیں۔ تھوڑی سی مقدار ہندوستان کے دریاؤں میں سے ریت دھو دھو کر نکالی جاتی ہے۔

۱۹۱۹ میں کل مقدار ہندوستانی سونے کی تقریباً 5,72,260.56 اونس تھی جس کی مجموعی قیمت بحساب ۱۰ روپیہ فی پونڈ 2256039 روپیہ تھی۔

قیمتی پتھروں میں سے ہیرے زیادہ تر مدراس اور ممالک متوسط میں۔ جواہر شمالی برما میں۔ اور نیلم کشمیر میں پائے جاتے ہیں۔ ۱۹۱۹ میں ہیرے وغیرہ 158577 قیراط 870ء18 روپے کے نکالے گئے۔

برما میں ایک نئی صنعت یعنی ڈلفرم کا کھودنا ۱۹۰۹ میں شروع کیا گیا ۱۹۱۹ میں اس کی نکاس 7735 ٹن تھی جس کی قیمت 539544 پونڈ تھی یہ اعلیٰ قسم کا فولاد تیار کرنے میں کام آتی ہے۔ کل دنیا کی پیداوار کا $\frac{1}{4}$ حصہ برما میں سے نکلتا ہے اور مستقبل شاندار ہے۔

ہندوستان کی زمینی دولت کے اس مختصر سے بیان سے یہ صاف عیاں ہے کہ تقریباً تمام دھاتیں تھوڑی زیادہ مقدار میں ملک کے مختلف حصوں میں پائی جاتی ہیں۔ جن کو قدرت نے خاص طور پر مالا مال کیا ہے اور باقی صوبے ایسے ہیں جن کے تمام قدرتی وسائل یہ ظاہر کرتے ہیں کہ وہ زراعت اور کاشت کے لئے موزوں ہیں۔ صوبہ بہار و بنگال دھاتوں اور کوئلہ کے بارے میں بہت خوش قسمت ہیں۔ ممالک متوسط اور برما اور جنوبی ہند بھی اس دولت میں مالا مال ہیں لیکن ان کے دبے ہوئے خزانوں تک ابھی انسان کا ہاتھ نہیں پہنچا۔

ہندوستان کی قدرتی دولت میں دریا بھی اپنا حصہ ادا کرتے ہیں۔ شمالی ہند کے شاندار دریا لاکھوں میل اراضی کو سیراب کرتے ہوئے اور تجارت کے لئے قدرتی شاہراہ بناتے ہوئے سمندروں میں گرتے ہیں۔

دریائے گنگا کی وادی دنیا کے زرخیز سرزمین وادیوں میں سے ہے۔ اور نہایت پرانے زمانے سے گنگا تجارتی شاہراہ بنی رہی ہے۔ سندھ کا علاقہ دریائے سندھ کی پیدائش ہے۔ جیسا کہ جنوبی بنگال پیداوار ہیں۔ دریائے گنگا کی۔ مشرقی بنگال کی کاشت اور تجارت برہم پتر پر مبنی ہے۔ اور پنجاب میں دریاؤں کا سلسلہ ایسا ہے جیسا کہ قدرت نے صوبہ کے لئے خود نہریں بنائی ہیں۔ جنوبی ہند کے دریا ایک اونچے سطح مرتفع میں سے ایک ہنرمند کاریگر کی طرح تراش تراش کر خوبصورت وادیاں بناتے ہیں۔

ہندوستان کے پہاڑ بھی ہندوستان کی Economy میں ایک ضروری حصہ ہیں۔ ہمالیہ کی بابت ہم لکھ چکے ہیں۔ جنوبی ہند کے پہاڑ

اور ہندوستان کے وسیع جنگل بہت سی دولت کے خزانہ ہیں۔ بیشمار قسم کی لکڑی۔ اور اور ضروری اشیا اُن سے پیدا ہوتی ہیں اور لاکھوں آدمیوں کو روزگار ملتا ہے آب وہوا کے لحاظ سے بھی ہمارا ملک گویا ساری دنیا کا نقشہ ہے
اس طرح پر صاف ظاہر ہے کہ ہندوستان کو قدرتی دولت مہیا کرنے میں پرماتما نے کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھی۔ اور ہندوستان دنیا کے کسی بھی ملک کے ساتھ اس بات میں مقابلہ کر سکتا ہے۔ اس لیئے جہاں تک پہلے سرمایہ ۔ یا معاون پیداوار کا تعلق ہے۔ ہندوستان میں کوئی کمی نہیں۔ اگر کمی ہے۔ تو یہ کہ انسان نے قدرتی دولت کا فائدہ ابھی تک نہیں اُٹھایا۔ اور پرماتما کے بیشمار خزانے بھارت سپوت کے ہاتھوں کی انتظار کرتے ہوئے زنگ آلودہ ہو رہے ہیں۔

مزدوری

ہندوستانی مزدوری یا انڈین لیبر عام الفاظ میں لکھنا مشکل ہے۔ کیونکہ ہندوستان کے مختلف صوبجات میں کئی ایک نسلوں کے آدمی ہیں جن کے جسمانی اور ذہنی اوصاف ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ عادات اطوار میں بھی فرق ہے۔ صوبہ وار اختلاف بھی کچھ کم نہیں۔ اس لیئے پنجابی مزدور کی بابت جو رائے ظاہر کی جائیگی۔ وہ شاید بمبئی کے مزدور پر چسپاں نہ ہو اور بنگال کا مزدور شاید ان دونوں سے علیحدہ طبیعت کا ہو۔
تاہم باوجود اس مشکل کے چند ایک اوصاف ایسے ہیں جو ہندوستانی اور باقی ممالک کے مزدوروں میں تمیز کراتے ہیں۔ یورپین اور ہندوستانی کارخانہ داروں کی طرف سے یہ عام طور پر کہا جاتا ہے اور بہت سے ہندوستانی

Economists بھی ایسا ماننے لگ جاتے ہیں۔ کہ ہندوستان کے مزدور بہت سست و کاہل الوجود واقع ہوئے ہیں۔ گھر ہی پر ٹھہرنے کی عادت تقریباً تمام ہندوستانی آبادی کی عادت کہی جا سکتی ہے۔ گھر کی آدھی روٹی باہر کی ساری روٹی سے اچھی ہے اس ضرب المثل پر اگر کسی ملک میں عمل کیا جاتا ہے تو وہ ہندوستان ہے۔ آدھی روٹی تو کیا گھر میں بھوکا بھی رہنا پڑے تو باہر جانے کی نسبت اچھا گن جاتا ہے۔ اس عادت کے سبب سے یہ ایک عجیب تماشا ملک میں دیکھا جاتا ہے کہ

ایک طرف تو کارخانہ دار چیخ رہے ہیں۔ کہ کافی مزدور نہیں ملتے اور کام کی توسیع نہیں ہو سکتی۔ اور دوسری طرف کئی ایک صوبوں و اضلاع میں آبادی اتنی گنجان ہے۔ اور کام اتنا تھوڑا کہ ہزاروں آدمی بیکار اور بھوک کے قحط کا شکار ہو رہے ہیں۔ اگر اپنے گھر کی چار دیواری سے باہر نکلنا آتا تو یہ دقت رفع ہو جاتی خیر یہ خوشی کا مقام ہے۔ کہ پچھلے 55-60 سال سے ریلوں اور آمد و رفت کے دوسرے ذرائع کے بڑھ جانے سے یہ عادت بہت کچھ کم ہو رہی ہے اور ہندوستانی مزدور نہ صرف ایک دوسرے صوبے میں آنے جانے لگ پڑے ہیں بلکہ ہندوستان سے باہر بھی کافی تعداد میں جانے لگے پڑے ہیں۔

پنجاب، سندھ، مدراس، اڑیسہ، مشرقی اضلاع ممالک متحدہ کے لوگ اس بات میں خاص طور پر بڑھے ہوئے ہیں۔

٭

دوسری عادت ہندوستانی مزدور کی اس کی گاؤں میں رہنے کی زبردست خواہش ہے۔ شہروں کی تنگ و تاریک گلیاں اور گندے سڑے مکان جو کارخانہ دار اپنے مزدوروں کو مہیا کرتے ہیں۔ ان کے لئے کوئی

جادو نہیں رکھتے۔ اور بسا اوقات یہ دیکھا جاتا ہے۔ کہ چند سال کسی کارخانہ میں رہ کر۔ اچھا ہنر سیکھ کر مزدور پھر واپس اپنے گاؤں میں چلا جاتا ہے اور کاشت شروع کر دیتا ہے جس سے اس کا سیکھا ہوا ہنر ملک کیلئے گویا ضائع ہو جاتا ہے۔ چپ چاپ فصل کے موقعہ پر اپنے گھروں کو بھاگ جانا اور پھر ایک دو ماہ کے بعد واپس شہر میں آجانا ہندوستانی مزدوروں کی معمولی بات ہے یہ تانا پیٹا کارخانوں کے لئے کتنا نقصان دہ ہے وہ کارخانہ کے منیجر ہی جانتے ہیں۔

تیسری کمی ہندوستانی مزدور میں اُمنگ کی بالکل عدم موجودگی یا کمی ہے۔ بمبئی میں کارخانوں میں کام کرنے والے مزدور جب کچھ تھوڑا سا روپیہ جمع کر لینے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ فوراً واپس گاؤں چلے جاتے ہیں۔ ان کے دل میں ترقی کرنے کی خواہش پیدا ہی نہیں ہوتی۔ ان کمیوں کے سبب ہندوستانی مزدور ولایتی مزدوروں کے ساتھ مقابلہ نہیں کر سکتا۔ یورپ و امریکہ میں ایک مزدور کی اوسط دن کی کارگزاری ہندوستان کے مزدور کی دن کی کارگزاری سے ڈیوڑھی سے لیکر تین گنا تک ہے۔ مثال کے طور پر لنکاشائر میں ایک جولاہا چھ کھڈیوں کی نگرانی کر سکتا ہے۔ ہندوستانی جولاہا صرف ایک کھڈی کی۔

اوسط سالانہ دھاگا کی پیداوار ایک مزدور کی۔ لنکاشائر میں 77366 گز۔
ہندوستان میں 37000 گز۔

کپڑا لنکاشائر میں 37740 گز ہندوستان میں 14000 گز۔

اسی طرح کوئلہ نکالنے میں ہندوستان کا مزدور ایک دن میں ½ ٹن نکالتا ہے بمقابلہ ½2 ٹن انگلینڈ کے مزدور کے 5 ٹن امریکہ کے مزدور کے۔ بمقابلہ جاپان [illegible] سالانہ کوئلہ فی مزدور 158 ٹن نکالتا ہے۔ ہندوستانی مزدور صرف

کاواٹن نکالتا ہے۔ ...... ہندوستانی مزدور کے عام چال چلن اور رویہ پر اعتراض کرتے ہوئے ہمیں یہ امر بھول نہیں جانا چاہئے۔ کہ کئی ایک پہلو میں ہندوستانی مزدور کا درجہ دنیا بھر کے مزدوروں سے اونچا ہے۔ شراب اور جوا وغیرہ کی عادت عام طور پر ہندوستانی مزدور میں نہیں ہے۔ حالانکہ مغرب میں مزدور پیشہ جماعت کا یہ ایک عام وصف ہے۔ دیانت داری میں بھی ہندوستانی مزدور یکتا ہے۔ اور محنت۔ جفاکشی میں ہندوستان مزدور خاص کر زراعت میں اپنا ثانی نہیں رکھتا لیکن کارخانہ میں فیکٹری سسٹم کے مطابق کام کرتے ہوئے وہ اس پھول کی طرح کملا جاتا ہے جس کو اس کے جنگلی مسکن سے شہر کی تنگ تاریک گلی میں لایا گیا ہے۔

اس میں بھی کچھ حد تک سچائی ہے۔ کہ ہندوستان کی انتہائی گرمی لگاتار محنت مشقت کا کام کرنے نہیں دیتی۔ اور جوانی اور بڑھاپا انسان کو جلدی آ گھیرتا ہے۔ تواریخ بھی اس امر کی گواہ ہے۔ کہ مغرب کی طرف سے جب کوئی حملہ آور آیا ہے۔ اس نے لوگوں کو آسانی سے مغلوب کر لیا ہے۔ انگریز اگر یہاں کی گرمی وغیرہ کے کمزور کن اثرات سے ابھی تک بچے ہوئے ہیں تو اس کی وجہ کسی حد تک یہ ہے کہ وہ ہندوستان میں رہتے ہوئے بھی اپنی پوشش اور خوراک اس طرح رکھتے ہیں گویا وہ انگلینڈ میں ہی سکونت پذیر ہیں۔

ہندوستانی مزدور کی ذاتی ضروریات بہت ہی کم ہیں۔ اس نے اپنے اخراجات اور ضروریات زندگی Standard of living کو اتنا افسوس ناک طور پر گھٹا یا ہوا ہے۔ کہ اس سے اس کی پوری جسمانی و ذہنی نشو و نما بھی نہیں ہو سکتی اور تھوڑی ہی محنت سے وہ اپنی ضروریات کو پورا کر لیتا ہے۔ اس سے وہ اپنی قسمت پر شاکر رہتا ہے اور زیادہ کمانے کی

حرص و حوصلہ اس میں پیدا ہی نہیں ہوتا۔ جہاں یہ باتیں حوصلہ شکن ہیں اور ان کے دور کرنے کے لئے ہمیں ہندوستانی مزدور کو تعلیم کے ذریعہ اپنے اوپر بھروسہ رکھنے ان کے دل میں ترقی کرنے کے خیال کو پیدا کرنا چاہئے۔ وہاں ہمیں یہ بات بھی یاد رکھنی چاہئے کہ کارخانہ والوں کی شکایت مزدور پیشہ جماعت کے متعلق بہت حد تک بیجا ہے۔ مانا کہ مزدوری شہروں اور کارخانوں میں زیادہ ملتی ہے لیکن اصلی تنخواہ یا Real wages کا شمار کرتے ہوئے ہمیں صرف روپیہ کا خیال نہیں کرنا چاہئے۔ بلکہ رہائشی اور مزاجی حالات کو بھی زیر نظر رکھنا چاہئے۔

اب ایک طرف تو گندے سڑے مکان جہاں مشکل سے سانس لینے کو ہوا ملتی ہے۔ دوسرے شہر کی مہنگی چیزیں اور اس پر طرہ یہ کہ دس گیارہ گھنٹہ لگاتار بڑا مشکل اور دلچسپی سے خالی کام کرنا ہو اور دوسری طرف گاؤں میں کھلی آب و ہوا یاروں دوستوں میں رہنا۔ کھانے اور پہننے کا کم خرچ۔ ایندھن مکان وغیرہ مفت ہوں۔ تو کیا ہندوستانی مزدور کا ان حالات میں کارخانوں میں ساری عمر سڑنے سے انکار کر دینا کوئی تعجب آمیز بات ہے ایک مصنف نے اس کو Instinct of Self Pres...tion اپنے بچاؤ کی عقل حیوانی کہا ہے۔ اور اس میں بہت حد تک سچائی ہے۔ اگر ہندوستانی مزدور کیڑوں مکوڑوں کی طرح بمبئی کے "چالوں" اور ہگلی کے کنارے گندی سڑی جھونپڑیوں میں مرنا نہیں چاہتے۔ تو ان کے لئے چھ مہینے برس کے بعد اپنے اپنے گاؤں میں بھاگ جانا اور اپنے جسمانی و ذہنی قوا کو مضبوط کرنا بہت ضروری ہے۔ مزدوروں پر یہ الزام لگانے سے پیشتر ہمیں کارخانہ داروں سرمایہ داروں کے سدھار

کی طرف پہلے متوجہ ہونا چاہیئے۔ تاکہ وہ اپنی لا انتہا دولت میں سے مزدوری کی فلاحت وبہبودی کے لئے بھی کچھ خرچ کریں۔ کارخانوں کی زندگی کو دلچسپی سے پراز زندگی بنانا چاہیئے۔ تاکہ net-adoon tages یا زندگی کے خاص فوائد گاؤں کی نسبت شہر میں زیادہ ہوں۔

انگلینڈ کی صنعتی ترقی کی ابتدا سولہویں صدی میں پڑی جب کہ Enclosure movement اور Agr. Rev. زرعتی انقلاب کے سبب سے بڑے بڑے زمینداروں نے ساری زمین آپس میں حلقے بنابنا کر بانٹ لی۔ اور غریب کسان زمین سے محروم ہوکر شہروں میں چلے گئے وہی زمانہ صنعتی انقلاب کا تھا۔ اس لئے یہ سارے مزدور کارخانوں میں جذب ہوگئے اور چونکہ گاؤں میں اب ان کے لئے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ شہروں کو ہی اپنا گھر بنا کر رہنے لگ پڑے۔ اس طرح گویا انگلینڈ کی صنعتی ترقی کی بنیاد وہاں کی Landless proletariate ہے۔

ہندوستان میں حالت دگرگوں ہے۔ اگرچہ مزدور یہاں کے بھی غریب اور افلاس زدہ ہیں۔ اور ولایت کے prolatariate سے کسی طرح بھی کم نہیں لیکن بہت سے زمین کا کچھ نہ کچھ ٹکڑہ ملک میں رکھتے ہیں یا دیہات میں اپنے مکان ہیں جن کی محبت انہیں شہروں میں ہمیشہ کے لئے جاگزین نہیں ہونے دیتی۔ اس طرح وہ شہروں اور کارخانوں میں تانا پٹیا کرتے رہتے ہیں۔

اس لئے جہاں تک دوسرے مد پیداوار کا تعلق ہے اگرچہ موجودہ حالت تسلی بخش نہیں لیکن مستقبل شاندار ہے۔ اور عارضی نقائص دور ہو سکتے ہیں۔ جن کے دور ہونے سے ہندوستانی مزدور دنیا کے کسی ملک

کے مزدور سے اپنی جانفشانی محنت مشقت اور حوصلے میں کم نہیں رہیگا۔ کثرت آبادی بھی اس امر میں ہندوستان کو بیشمار قسم کے کارخانہ وصنعت وحرفتیں کھولنے میں مددگار رہے۔ مزدوروں کی کمی کی بابت جو شکایت دوسرے ملکوں میں ہے۔ اور جو ان کی آئندہ ترقی کو محدود کرتی ہے۔ وہ ہندوستان میں ہو ہی نہیں سکتی اور یہ کثرت آبادی labour power ہندوستان کی آئندہ صنعتی و اقتصادی ترقی کے لئے ایک شاندار asset ہے۔

پیشہ وار ہندوستانی آبادی کی تقسیم بروئے مردم شماری ۱۹۱۱ء حسب ذیل تھی:۔

زراعت	72 فی صدی
صنعتیں	11.2 "
تجارت وباربرداری	5.6 اور 1.6 بالترتیب
آزاد پیشہ	1.7
خانگی نوکری	1.5
سرکاری نوکری	.84
سرکاری فوج	.77
کانوں میں کام کرنیوالے	.17
متفرق	4.17

قابل مزدوری آبادی یعنی 15 اور ساٹھ برس کی عمر کے درمیان والی آبادی 17 کروڑ یعنی 53 فی صدی تھی اور اگر ہم ان میں سے کمزور و بیمار و ۔۔۔ لوگوں کو نکال دیں ۔۔۔

کیونکہ عورتیں پردہ سسٹم اور ذات پات کے بندھنوں سے بالواسطہ ملک کی مزدوری میں اضافہ نہیں کرتیں۔ تو ہم ملک کے مزدور گروہ کا صحیح اندازہ لگا سکتے ہیں۔

سرمایہ Capital

ہندوستان میں سرمایہ کی بہت کمی ہے۔ اور اس کمی کے باعث ملک کی صنعتی ترقی رکی ہوئی ہے۔ ہم نے دیکھا ہے کہ جہاں تک ملک کی زمینی یا قدرتی وسائل کا تعلق ہے ہندوستان کسی ملک سے پیچھے نہیں اور مزدور بھی چند ایک عارضی نقائص کو چھوڑ کر بڑے محنتی اور جفاکش ہیں لیکن ان دونوں سے ملک کی دولت بڑھانے میں امداد تب ہی اچھی طرح حاصل ہو سکتی ہے۔ جب ملک میں سرمایہ کافی مقدار میں ہو تاکہ مشینوں وغیرہ کے ذریعہ سے کارخانہ چلائے جا سکیں۔ ہاتھ سے کام کرتے ہوئے ایک مزدور دن بھر میں جتنا پیدا کر سکتا ہے۔ سرمایہ کی امداد سے یعنی مشین یا اوزار کی امداد سے اس سے کئی گنا پیدا ہو سکتا ہے۔ ہندوستانی کانکن دن بھر میں مغربی ہتھیاروں کے بغیر صرف ½ ٹن نکالتا ہے۔ حالانکہ امریکہ میں مزدور بجلی اور مشین کی مدد سے ۵ ٹن نکالتا ہے۔ اسی طرح قدرتی وسائل بھی ناکارے ہیں جب تک ان سے فائدہ نہ اٹھایا جاوے۔ ہر سال لاکھوں گیلن پانی مغربی گھاٹ سے نیچے بے فائدہ بلکہ نقصان دہ طور پر بہہ جاتا ہے لیکن بند وغیرہ بنانے اور مشین لگانے سے اسی پانی سے ہزاروں گھوڑوں کی طاقت پیدا کی جا سکتی ہے۔ جس سے سارے صوبہ بمبئی کو سستے داموں بجلی مہیا کی جا سکتی ہے۔ اور کارخانے چلائے جا سکتے ہیں۔

یہ امر نہایت افسوس ناک ہے کہ ہندوستان کی اب تک جو کچھ ترقی بھی ہوئی ہے وہ صرف غیر ملکی سرمایہ کی مدد سے۔ دراصل ہندوستان میں جمع کرنے کا اصول بہت کمزور ہے۔ اور اپنی حالت کو مالی طور پر بہتر بنانے کیلئے کوشش و محنت کرنا اور بھی زیادہ کم ہے۔ صدیوں کی غلامی اور خاص کر پچھلی ایک دو صدیوں کی لوٹ مار اور پولیٹیکل بدنظمی نے لوگوں کے دلوں میں دولت جمع کرنے کے خیال کو بہت ہی کمزور کر دیا ہے۔ مذہبی طور پر تو میں دیانت نے بھی لوگوں کو کچھ اس طرح سے گم برگشتہ نہیں کیا۔

اور تھوڑا بہت سرمایہ جو ملک میں ہے بھی وہ بھی زیادہ تر تجارت اور ساہوکارے پر لگا ہوا ہے۔ یا زمین کے نیچے دفن ہے۔ امیر آدمی یا فارغ البال زمیندار بھی جب کچھ فالتو روپیہ جمع کر لیتے ہیں۔ زمین خریدنے میں خرچ کر دیتے ہیں۔ کیونکہ زمین عزت کی نشانی گنی جاتی ہے لیکن اس سے ملک کا سرمایہ صنعت و حرفت سے ہٹ کر زراعت میں ہی لگ جاتا ہے۔

اب تک نئے طریقے یعنی Factory system کے مطابق جو صنعتیں یا کاروبار ملک میں چلائے گئے ہیں۔ ان میں سے صرف چند ایک ہندوستانیوں کے سرمایہ سے چل رہے ہیں۔ باقی سب یورپین سرمایہ سے۔ مثال کے طور پر 1913 میں سارے ہندوستان کی صنعتوں میں دیسی سرمایہ صرف ½ 24 کروڑ لگا ہوا تھا۔ (خانگی دستکاریوں کے علاوہ) اور انگریزی سرمایہ ملک بھر میں 38 کروڑ 67 لاکھ تھا۔ ریلوے کا سرمایہ بھی جو زیادہ تر غیر ملکی ہے۔ 495 کروڑ یعنی ½4 ارب 95 کروڑ تھا۔ بنکوں کا سرمایہ شمار نہیں کیا گیا۔

اس طرح ہندوستان کی موجودہ صنعتی ترقی میں جہاں غیر ملکی 5 ارب

74 کروڑ 67 لاکھ سرمایہ لگا ہوا ہے۔ وہاں ہندوستانی صرف 2½ کروڑ تھا غیر ملکی سرمایہ اس کا کام اور اس کے استعمال کے فوائد و نقصان وغیرہ پر ہم آگے جاکر مفصل لکھینگے۔ لیکن مذکورہ بالا حالت ملک کی ترقی کے لئے حوصلہ شکن ہے۔ اس پر حاشیہ آرائی کی ضرورت نہیں۔ ضرورت ہے کہ ملک کے امیر و ساہوکار آدمی اپنی توجہ روپیہ کو ملک کی صنعتی ترقی کے لئے لگانا سیکھیں۔ جس سے نہ صرف ان کی اور ملک کی دولت میں اضافہ ہوگا۔ بلکہ ہزاروں ہندوستانیوں کو روزگار بھی مل جاویگا۔ [illegible] اور [illegible] متوسط درجہ کے لوگوں کے لئے اپنی تھوڑی بہت بچت کو ملک کی اقتصادی ترقی میں لگانے کے لئے بڑے اچھے ذرائع ہیں۔ جس کی طرف پڑھے لکھے آدمیوں کو اپنی توجہ کرنی چاہیئے۔

صنعتی لیڈر

جہاں ملک میں سرمایہ کی کمی ہے۔ وہاں ایسے آدمیوں کی جو سرمایہ کو ٹھیک طور پر صنعتیں چلانے میں لگا سکیں۔ اور بھی کمی ہے۔ ہندوستانی Custom یا رسم و رواج کے اتنے بندھے ہوئے ہیں۔ کہ نئی چیز کو ہاتھ لگانے نیا کام شروع کرنے بلکہ نئے خیالات کو بھی دل میں لانے کی ہمت اور جرأت نہیں رکھتے۔ باپ دادا کی بنائی ہوئی سڑک پر چلنا ہی دھرم گنا جاتا ہے۔ اقتصادی پہلو میں تو خاص کر بہت ہی تھوڑے آدمی ایسے ہیں جو کسی قسم کا Risk یا خطرہ اٹھانے کو تیار ہوں۔ مانا کہ ایک صدی پہلے ایسی حالت نہ تھی۔ لیکن اس میں کچھ شک نہیں کہ ہندوستانی

قدرتی طور پر Conservative یا قدامت پسند
واقع ہوئے ہیں۔ اور یہ قدامت پسندی کسی اور پہلو میں کتنی ہی مفید
ہو لیکن اقتصادی دنیا میں یہ اب موجودہ حالت میں ملک کو سخت نقصان
پہنچا رہی ہے۔ ذات پات کے بندھنوں نے مدت سے لوگوں کی اپنا پیشہ
اپنی طبیعت کے مطابق چننے کی آزادی سے محروم کر دیا تھا۔ ان پر پولیٹیکل
چالوں اور پالیسی نے پچھلی ڈیڑھ دو صدیوں میں۔ spirit of
initiative یعنی کسی کام میں پہل کرنے کی ہمت
کو اور بھی کچل دیا ہے جس کا نتیجہ افسوس ناک طور پر آج کل نظر آ رہا ہے
دوران جنگ میں اور آج کل کے حالات میں بھی ہندوستان کے لئے سنہری
موقعہ ہے کہ صنعتی پہلو میں بے کھٹکے ترقی کرے۔ لیکن مشینوں اور سرمایہ
کی کمی یا مزدوروں کی کمی سے نہیں بلکہ صنعتی لیڈر اور لائق تجربہ کار کارخانہ
داروں کی عدم موجودگی سے ہندوستان بے بس ہو رہا ہے۔ لوگوں کی
عادت ہو گئی ہے۔ کہ ہر ایک پہلو میں گورنمنٹ کی طرف دیکھتے ہیں۔
ایسی عادت ڈالنے میں گورنمنٹ موجودہ اور پرانے راجاؤں بادشاہوں
نے بھی اپنے مطلب کے لئے کچھ کم کسر روا نہیں رکھی۔ اس کا قدرتی نتیجہ یہ ہوا ہے
کہ ہم پنجابی مثل "بابا ٹل پکی پکائی گھل" کے مصداق خود اپنی ذمہ داری
پر کام کرنا نہیں چاہتے۔
آج کل کے رواج کے مطابق چلنے لائق آدمی اور نوجوان ہوتے ہیں۔
وہ تو سرکاری نوکری کی طرف اپنی توجہ کو لگا دیتے ہیں۔ باقی آزاد طبیعت
والے یا وہ جن کو سرکاری نوکری نہیں مل سکتی۔ وکیل و بیرسٹر بن جاتے ہیں
نیچے پیچھے جن کو ان کے والدین کسی اور کام کے لئے لائق نہیں سمجھتے بیوپار

میں لگا دیتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے۔ کہ وہ بیوپار میں کچھ ترقی نہیں کر سکتے۔
مانا کہ اس لائن میں لائق فائق آدمی بھی موجود ہیں۔ لیکن انکی تعداد انگلیوں
پر گنی جا سکتی ہے۔ اگر کوئی ہندوستانی کارخانہ یا کاروبار کامیابی سے چلا کر
ترقی کر بھی لیتا ہے۔ تو دقت یہ ہوتی ہے۔ کہ اس کے بعد اس کے کام
کو سنبھالنے والے بڑے تھوڑے پیدا ہوتے ہیں۔ اور وہ کارخانہ یا
بیوپار بجائے عروج پر ہونے کے زوال پذیر ہو جاتا ہے۔ انگلینڈ اور مغربی
ممالک میں رواج ہے۔ کہ ہونہار نوجوان کو کام سکھا کر بتدریج اس کو
ترقی دی جاتی ہے۔ اور انجام کار کام میں اس کو بطور حصہ دار کے بھی منظور
کیا جاتا ہے۔ جس سے پہلے مالک کے فوت ہو جانے پر دوسرا تجربہ کار اس کی
جگہ لینے کو طیار ہوتا ہے۔ اور اس طرح کام کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ یہی
وجہ ہے کہ انگریزی فرمیں سال بسال ترقی کرتی ہیں۔ اور ان کے کام۔ اثر
اور آمدن میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ ہندوستانی فرمیں اپنے انتظام میں بہت
حد تک ذاتی ہیں۔ (personal) یعنی اُن کی
سستی اور عروج ایک دو شخصوں کی ذات سے وابستہ رہتی ہے۔ جن
کی عدم موجودگی میں کام رک جاتا ہے۔ ضرورت ہے کہ ہندوستانی کارخانہ
دار بھی اپنے ماتحتوں کو معقول تنخواہیں اور معاوضہ دیکر اور استاد شاگردی
system of apprenticeship کو جاری کر کے بہت
سے لوگوں کو کاروباری تجربہ سے مستفید ہونے دیں۔ اس سے نہ صرف
ان کا اپنا فائدہ ہے بلکہ ملک کا بھی۔

آج کل حالت اتنی خراب نہیں ہے جتنی چند سال پہلے تھی۔
کیونکہ تعلیم یافتہ جماعت نے اپنی توجہ کو سرکاری نوکری سے ہٹا کر تجارت

اور صنعتوں کی طرف پھیرنا شروع کر دیا ہے۔ لیکن اب جس دقّت کا سامنا ہے
وہ یہ ہے کہ جن کے پاس سرمایہ اور فالتو روپیہ ہے ان میں کام اور صنعتیں
چلانے کی قابلیت نہیں ہے اور جن نوجوانوں میں کام کرنے کی اُمنگ ہے
اور شاید قابلیت بھی ہے۔ اُن کے پاس سرمایہ نہیں ہے۔ جس سے کہ وہ
مجبور ہو کر چند دن بیکار رہ کر آخر سرکاری نوکری چند روپوں والی کے لئے
ہاتھ پاؤں مارنا شروع کر دیتے ہیں۔ کتنے ہی نوجوان ہیں جن کو اگر موقعہ دیا
جاتا۔ تو نہایت ہی کامیاب کاروباری آدمی بن جاتے۔ لیکن اب ۵۰۔
۶۰ روپیہ کی کلرکی میں اپنی عمر ضائع کر رہے ہیں۔ ان حالات میں J. Stock
Company کا طریقہ ایسا ہے جن سے ہمارے نوجوان اپنے جوش اور کاروباری
لیاقت کا فائدہ اُٹھا سکتے ہیں۔

اب تک جتنی صنعتی ترقی ملک میں ہوئی ہے وہ یورپین کاروباری آدمیوں
کی معرفت ہی ہوئی ہے۔ اگر کوئی صنعت ہے جس میں ہندوستانیوں نے
اپنی لیاقت ظاہر کی ہے۔ تو وہ کپڑے کی صنعت ہے۔ مگر وہاں بھی اِس
اولوالعزمی کا سہرا پارسیوں کے سر پر ہی ہے۔

ہم نے Factors of Production یا معاون پیداوار
پر فرداً فرداً نظر ڈالی ہے۔ یہ صاف عیاں ہے۔ کہ جہاں تک قدرتی وسائل
اور مزدوری کا تعلق ہے۔ ہندوستان میں کسی قسم کی کمی نہیں اور آئندہ
صنعتی ترقی کے لئے بنیادیں مضبوط ہیں لیکن سرمایہ کی ملک میں بہت کمی
ہے اور کاروباری آدمیوں کی اس سے بھی زیادہ کمی ہے لیکن موخر الذکر
معاون پیداوار ایسے ہیں جن کے کم ہونے سے صرف عارضی نقائص ہی
پیدا ہو سکتے ہیں۔ اور جو کمی کئی ایک مصنوعی طریقوں سے پوری بھی کی

جاسکتی ہے۔ اصلی بنیادی فیکٹرز یا معاون تمام دولت کے قدرتی وسائل اور مزدوری ہیں اور ان میں ہندوستان کئی ممالک سے برتر ہے۔ اس لئے موجودہ حالت خواہ کتنی ہی مایوس کن ہو۔ مستقبل شاندار ہے۔ ضرورت صرف اس امر کی ہے۔ کہ ہندوستانی سرمایہ دار اور کاروباری آدمی محض تجارت دلالی اور ایجنسی کے کام کو چھوڑ کر اپنے سرمایہ اور لیاقت کو نیئے حرفتیں جاری کرنے۔ پیداوار کے نئے طریقے نکالنے اور ملک کے زمینی خزانے کھودنے کی طرف لگائیں۔ آگے جاکر ہم ہندوستان کی مختلف اشیاء زراعتی و صنعتی کا مختصر طور پر ذکر کرینگے۔

زراعت

ہندوستان کے وسیع زرخیز میدان قسماقسم کی آب وہوا۔ اور برساتی ہوائیں اس امر کی شاہد ہیں۔ کہ ہندوستان ایک وسیع زراعتی ملک ہے تقریباً ⅔ تہائی آبادی زراعت میں لگی ہوئی ہے۔ اور دیہات میں رہنے والی آبادی کا $\frac{9}{10}$ حصہ کاشت میں لگا ہوا ہے۔ مختلف صوبوں میں آب وہوا اور زمین مختلف اوصاف والی ہے لیکن چند ایک باتیں ایسی ہیں جو سارے ملک کے لئے یکساں طور پر کہی جاسکتی ہیں۔ برساتی ہوائیں خشک سردی اور مارچ سے اکتوبر تک سخت گرمی ہندوستان کے ہر ایک حصے کے اوصاف ہیں۔ جون سے اکتوبر تک برسات کا موسم ہے۔ اور اس سے زراعتی سال دو حصوں میں منقسم ہوجاتا ہے۔ خریف یا ساونی اور ربیع یا ہاڑی۔ ساونی کی فصل زیادہ تر مینہہ پر منحصر ہے۔

ہندوستان کی زمین مقابلتاً دوسرے ملکوں کے خشک واقع ہوئی ہے اس لئے آبپاشی ہندوستانی زراعت میں ایک لازمی امر ہے۔ چاہ۔ تالاب۔ اور نہریں۔ اور کئی اور طریقے جو انسانی عقل سوچ سکتی ہے۔ اختراع کئے گئے ہیں۔ لیکن سب سے بڑھ کر سہارا قدرت کے موسم برسات پر ہے یا موقعہ برسات ہندوستانی زراعت کے لئے آب و دانہ کا کام دیتی ہے مینہ کا کسی سال کم یا نہ برسنا یا بے موقعہ برسنا خوفناک قحط کا سبب ہو جاتا ہے۔ کئی حصص تو ایسے ہیں جن کا گذارہ ہی برسات پر ہے اسی لئے کہا گیا ہے۔ کہ ہندوستانیوں کی زندگیاں گویا موسم برسات کا جؤا ہیں۔

ہندوستان چھوٹے چھوٹے کسانوں کا ملک ہے۔ اور کثیر التعداد کسان ایک سے آٹھ ایکڑ تک زمین کاشت کرتے ہیں۔ زراعتی سرمایہ نہایت کم ہے۔ اور کھیتوں کے ارد گرد حلقہ گرانے کا دستور سوائے آبادی کے نزدیک کہیں نہیں پایا جاتا۔ ہل لکڑی کا جس کے آگے لوہا لگا ہوا ہوتا ہے۔ اور لکڑی کا ہی سہاگہ صرف دو اوزار ہیں۔ جن کی مدد سے کسان کھیتی باڑی کرتا ہے۔ اور طاقت کے لئے مویشی استعمال کئے جاتے ہیں۔

ان معمولی اوزاروں اور مویشی کے لئے بھی بسا اوقات کسان کو روپیہ قرض لینا پڑتا ہے۔ اور ایک دفعہ مقروض ہونے سے وہ ہمیشہ کے لئے قرض کے بوجھ کے نیچے دب جاتا ہے۔ ہندوستان کا جاٹ یا کسان دنیا بھر کے کسانوں سے زیادہ محنتی اور اپنے کام کو اچھی طرح سمجھنے والا ہے لیکن ناتعلیم یافتہ ہونے سے وہ اپنے نواحی حالات سے لاچار اور مجبور رہے۔ اور اپنی قسمت پر شاکر رہتے ہوئے اپنے دن کاٹ رہا ہے۔

جائداد کو برابر حصّہ میں بانٹ دینے کے رواج سے بسا اوقات زمین چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں منقسم ہو جاتی ہے۔ جس سے ہر قسم کی زراعتی ترقی رک جاتی ہے۔ اور زمین کا پورا پورا فائدہ نہیں اُٹھایا جا سکتا بھاری سرکاری لگان بھی ہندوستانی زراعت پر ایک بوجھ ثابت ہو رہا ہے یہ لگان ایک غریب سے غریب کسان پر جس کے پاس شاید صرف نصف ایکڑ زمین ہے اُسی شرح سے لگایا جاتا ہے جس سے کہ ایک امیر لاکھوں ایکڑ زمین کے مالک زمیندار پر۔

چھوٹے چھوٹے سرکاری افسروں کی رشوت ستانی اور تعدّی نت نئے بندوبست کے جھمیلے یہ سارے غریب کسانوں کو سہنے پڑتے ہیں ان دنوں حالات یہ تعجب آمیز بات ہے کہ ہندوستانی کسان ابھی تک اپنے آباؤ اجداد کے قدم پر چلتا ہوا بدستور کاشت زمین میں لگا ہوا ہے۔ قدرت سوشل اور پولیٹیکل حالات نے تو اس کے برخلاف اس کو کچلنے کی سازش کی ہوئی ہے۔

چند ضروری زراعتی اجناس کا مختصر ذکر ذیل میں کیا جاتا ہے:۔

چاول کی چاول لگ بھگ 8 کروڑ ایکڑ رقبہ میں سالانہ کاشت کیا جاتا ہے۔ یعنی ہندوستان کے کاشت شدہ حصّہ کے 35 فیصدی حصہ میں چاول بوئے جاتے ہیں۔ صوبہ بنگال میں سب سے زیادہ بوئے جاتے ہیں۔ لیکن برآمد کے لحاظ سے برما اوّل درجہ پر ہے۔ دنیا کی کل چاول کی پیداوار کا تخمینہ ۹ کروڑ ٹن سالانہ کیا گیا ہے جس میں سے ہندوستان کا حصّہ تقریباً ۵۰ فی صدی ہے لیکن اگرچہ ہندوستان سے چاول کی برآمد دوسرے ملکوں کی برآمد سے زیادہ ہے لیکن پھر بھی کل پیداوار کے

۶ فیصدی سے زیادہ کسی بھی سال باہر نہیں بھیجے جاتے۔ جنگ سے پہلے اس برآمد کا 74 فیصدی یورپ کو بھیجا جاتا تھا۔ اس برآمد میں زیادہ تر برما کا حصہ ہے۔ اور جس سال ہندوستان میں چاول کم ہوں۔ اس سال یہاں بھی برما سے ہی منگوائے جاتے ہیں۔ رقبہ کاشت۔ پیداوار اور برآمد کے اعداد 14-1913 سے مندرجہ ذیل ہیں۔

سال	رقبہ کاشت شدہ ایکڑ	پیداوار	برآمد فیصدی کل پیداوار کی
1913-14	76908000	30138000	8
1914-15	77669000	28244000	$5\frac{1}{2}$
1915-16	78679000	33206000	3
1916-17	81020000	35442000	$4\frac{1}{2}$
1917-18	80668000	36544000	5
1918-19	76734000	24025000	8

اس کے علاوہ دیسی ریاستوں کی چاول کی پیداوار کا تخمینہ دس لاکھ ٹن سالانہ کیا گیا ہے۔ برٹش ہندوستان میں فی ایکڑ چاول کی پیداوار صرف بارہ من ہے۔ حالانکہ مصر اور جاپان میں فی ایکڑ 29 اور 30 من کے درمیان ہے۔ چاولوں کی برآمد پر محصول بحساب تین آنہ فی من لگایا جاتا ہے۔ جس سے 19-1918 میں 7 لاکھ 14 ہزار پونڈ گورنمنٹ ہند کو آمدنی ہوئی۔

گندم

گندم پنجاب کی لازمی غذا ہے۔ دوسرے صوبوں میں چاول

مکی اور باجرا اور چنے پر گزارہ لوگ کر سکتے ہیں۔ لیکن پنجاب کی غذا گندم ہے۔ تقریباً دو کروڑ ستر لاکھ ایکڑ یعنی [illegible] فیصدی حصہ کاشت شدہ رقبہ پر گندم بوئی جاتی ہے۔ جس میں سے سب سے زیادہ رقبہ پنجاب اور ممالک متحدہ میں ہوتا ہے یعنی کل رقبہ کا $\frac{2}{3}$ حصہ

گندم کی پیداوار کے لحاظ سے ہندوستان کا دنیا میں تیسرا درجہ ہے اعداد مندرجہ ذیل ہیں:-

ممالک متحدہ امریکہ	23,816,885 ٹن
روس	15,324,047
ہندوستان	8,336,484
فلپائن	4,498,215
کینیڈا	4,311,015

گندم مئی میں جمع کی جاتی ہے۔ اور عام طور پر سوداگر اس مہینہ میں خرید کر برآمد شروع کر دیتے ہیں۔ کیونکہ اس موسم میں یورپ کی خوراک کے لئے دوسرے ملکوں کی گندم دستیاب نہیں ہوتی۔ دوسرے ملکوں میں فصل ذرا دیر سے طیار ہوتی ہے لیکن پھر بھی سالانہ برآمد گندم کی 15 فی صدی کل پیداوار سے زیادہ کسی سال میں نہیں ہوتی۔ قحط کے سالوں میں یہ عموماً 2 فی صدی رہ جاتی ہے۔ اور کئی دفعہ یہاں قیمت اتنی بڑھ جاتی ہے کہ برآمد تقریباً ختم ہی رہ جاتی ہے۔ برآمد مئی سے اگست تک جاری رہتی ہے۔ اس کے بعد برآمد میں سوداگروں کو چنداں فائدہ نہیں رہتا۔ کیونکہ دوسرے ملکوں کی فصل تیار ہو جاتی ہے۔ زیادہ تر برآمد انگلستان کو جاتی ہے۔

فی ایکڑ پیداوار نہری رقبہ میں 15 سے 20 من
اور بارانی رقبہ میں 10 من ہے۔ حالانکہ فی ایکڑ پیداوار
امریکہ اور انگلینڈ میں اس سے تقریباً تین گنا ہے +

جَو

18-1917ء میں رقبہ زیر کاشت 70 لاکھ ایکڑ تھا۔ ½ لاکھ ایکڑ ریاست جے پور
الور، بھرت پور۔ اور گوالیار کا اس سے علاوہ تھا۔ ملک میں مانگ زیادہ ہے۔
اس لئے جَو کی برآمد بہت تھوڑی ہے۔

مکی و جوار

جوار زیادہ تر مدراس۔ بمبئی۔ دکھن اور حیدرآباد کے نزدیکی اضلاع کی
آبادی کی خوراک ہے۔ صوبجات متحدہ و ممالک متوسط میں بھی ایک کثیر رقبہ
اس فصل کا بویا جاتا ہے۔ لیکن یہ دوسرے ملکوں میں بہت کم بھیجی جاتی
ہے۔ ۱۹۱۲ء میں تقریباً 45 لاکھ ایکڑ رقبہ میں یہ کاشت کی گئی۔ ہندوستان
میں باجرا۔ جوار۔ اور رگی و مکی کا کل رقبہ ۱۹۱۸و۱۹ء میں مندرجہ ذیل تھا۔

جوار	20540390 ایکڑ
باجرا	11200972
رگی	4004356
مکی	6062289

جوار کی پیداوار فی ایکڑ 8 من ہے۔

دالیں

غلے کے بعد زیادہ ضروری خوردنی اجناس میں دالیں ہیں۔ جن میں سے زیادہ ضروری قسمیں جو ہندوستان میں بوئی جاتی ہیں۔ وہ ہرہر۔ چنا۔ مسر ارد۔ مونگ وغیرہ ہیں۔

دالیں زیادہ تر ممالک متحدہ و بہار میں بوئی جاتی ہیں چنے یو۔ پی۔ پنجاب۔ بہار۔ ممالک متوسط میں پیدا ہوتے ہیں۔ سنہ 1913-14ء میں یہ مختلف صوبجات میں مندرجہ ذیل مقدار میں کاشت کئے گئے۔

یو۔ پی۔ 70 لاکھ ایکڑ۔ پنجاب۔ چالیس 40 لاکھ پچیس 25 ہزار ایکڑ۔ بہار و ممالک متوسط۔ تقریباً دس۔ دس لاکھ ایکڑ۔

دالوں و چنوں کے لئے چونکہ ہندوستان میں ہی کافی مانگ ہے اس لئے ان کی برآمد بہت تھوڑی ہے۔

سنہ 1913-14ء میں سات لاکھ گیارہ ہزار اور نو پونڈ کی دالیں باہر بھیجی گئیں۔ سنہ 1918-19ء میں صرف 446745 پونڈ کی بھیجی گئیں۔ چنے سنہ 1913-14ء میں 415104 پونڈ کے باہر بھیجے گئے۔ دوران جنگ میں اور خاصکر سنہ 1917-18ء و سنہ 1918-19ء میں برآمد بہت زیادہ رہی یعنی 2328532 پونڈ و 2233414 پونڈ کی۔ لیکن یہ برآمد زیادہ تر گورنمنٹ ہند کی طرف سے جنگی اغراض کے لئے کی گئی۔

چنوں کی اوسط پیداوار فی ایکڑ ½7 سے 10 من ہے۔

(روغنی تخم) (تل)

خوردنی اشیاء اور دالوں کے بعد ہندوستان کی ضروری فصل روغنی

تخم ہیں۔ جن میں سے زیادہ ضروری قسمیں - رائی - سرسوں - توری - تل - ہڑولی
گرونڈ نٹ و لن سیڈ ہیں - ناریل - مہوہ - و بنولوں سے بھی تیل نکالا جاتا
ہے۔ سارے تخموں کی پیداوار کا اندازہ پچاس لاکھ ٹن سالانہ کیا گیا ہے۔
جن کی مجموعی قیمت تخمیناً پانچ کروڑ پونڈ ہوتی ہے۔ لیکن تیل و تلوں کی برآمد
بھی بہت زیادہ ہے۔

۱۹۱۳-۱۲ء میں ایک کروڑ اسی لاکھ پونڈ کے تل و تیل باہر بھیجے گئے۔
ہڑولی - مہوہ و نائیجر سیڈ کی بہم رسانی ساری دنیا کو صرف ہندوستان
ہی کرتا ہے۔ خشخاس کی پیداوار ہندوستان میں ساری دنیا کی پیداوار
76/100 ہے۔ (مسٹرڈ سیڈ) رائی 66/100 بنولے 33/100 -
تل 42/100 لن سیڈ 23/100 - دگری 7/100 -

یہ امر قابل افسوس ہے کہ اگرچہ تیل و تلوں کی تجارت برآمد بہت
زیادہ ہے۔ لیکن اس برآمد میں تیل بہت تھوڑا جزو ہے مثلاً ۱۹۱۳-۱۴ء
میں صرف ۴ لاکھ پونڈ کا تیل باہر بھیجا گیا۔

ملک کی اندرونی ضروریات میں تیل کی بڑی کھپت ہے لیکن ابھی تک
تیل نکالنے کے لئے وہی پرانی قسم کا کولہو برتا جاتا ہے۔ صرف برما میں
نئے مغربی طریقوں پر انگریزوں نے چند ایک کارخانے کھولے ہیں۔

جیوٹ

جیوٹ سوائے ہندوستان کے دنیا کے اور کسی ملک میں کاشت نہیں
کیا جاتا۔ اور ہندوستان میں بھی زیادہ تر گنگا برہم پترا کی وادی یعنی بنگال
و آسام و کوچ بہار میں ہی ہوتا ہے۔ بہار و اڑیسہ میں بھی اس کی تھوڑی

کاشت ہوتی ہے۔ مارچ و مئی کے درمیان یہ فصل بوئی جاتی ہے اور جولائی و ستمبر میں کاٹی جاتی ہے۔ پچھلے چالیس سالوں میں جیوٹ کی کاشت میں چار سو فی صدی کی ترقی ہوئی ہے۔ سنہ 1913-14ء میں تقریباً 372600 ۔ ایکڑ پر یہ فصل بوئی گئی۔

سب سے پہلے سنہ 1795ء میں جیوٹ ہندوستان سے باہر بھیجا گیا۔ لیکن اس وقت برآمد بہت تھوڑی مقدار میں تھی۔ سنہ 1882-83ء کے بعد یہ بہت بڑھنے لگی۔ چنانچہ سنہ 1913-14ء میں تقریباً آدھی فصل یعنے 76800 ٹن جیوٹ باہر بھیجا گیا۔

جس کی مجموعی قیمت دو کروڑ پانچ لاکھ پچاس ہزار پونڈ تھی۔ فی ایکڑ جیوٹ 15 من عمدہ ریشے پیدا کرتا ہے۔ اچھی فصل بعض اوقات اس سے دگنا بھی۔

کپاس

کپاس ہندوستان کے بہت سے حصے میں بوئی جاتی ہے۔ لیکن صوبہ بمبئی۔ ممالک وسط و برار۔ حیدرآباد۔ مدراس۔ پنجاب و ممالک متحدہ میں بہت کثرت سے بوئی جاتی ہے۔ سنہ 1913-14ء میں 25023000 ایکڑ رقبہ زیر کاشت تھا۔ جن کی تخمیناً قیمت پانچ کروڑ پونڈ تھی۔ جو کہ اس سال ساری دنیا کی کپاس کی کاشت کا 15/100 تھی۔ سنہ 1918-19ء میں کپاس کے مہنگا ہونے سے فصل کا اندازہ 76000000 پونڈ کیا گیا تھا۔

کپاس بہت بھاری مقدار میں باہر بھیجی جاتی ہے۔ چنانچہ پچھلے پانچ

سالوں میں خام اشیاء کی کل مقدار کا ۱۰۰/33 صرف کپاس تھی۔
سنہ 14-1913ء میں 27361655 پونڈ کی کپاس باہر بھیجی گئی۔

یہ امر قابلِ نوٹ ہے۔ کہ امریکہ و مصر میں کپاس کی پیداوار و قیمت کا ہندوستان کی کپاس کی برآمد پر بہت بڑا اثر ہے۔ کیونکہ لنکاشائر کا امریکہ و مصر کی کپاس پر بہت دارومدار ہے۔ جنگ سے یہ امر بھی اچھی طرح سے واضح ہوگیا ہے کہ جاپان کے روئی کے کارخانے زیادہ تر ہندوستان کی کپاس پر ہی انحصار رکھتے ہیں۔

کاشت دوسرے اجناس کی مانند پرانے طریقوں پر ہی کی جاتی ہے۔ اور سوائے پنجاب و سندھ کے ملک کے دوسرے حصوں میں فصل کا دارومدار زیادہ تر مینہ پر ہے۔ اس لئے یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ جہاں ہندوستان میں فی ایکڑ 75 سے ۱۰۰ پونڈ روئی پیدا کی جاتی ہے۔ وہاں امریکہ میں فی ایکڑ ۱۸۰- اور مصر میں فی ایکڑ 300 سے 400 پونڈ تک کی پیداوار ہے۔

نیل

نیل ہندوستان میں مدت مدید سے کاشت کیا جاتا ہے۔ اس کا انگریزی نام ہی دراصل اس امر کی شہادت ہے کہ یہ پہلے پہل ہندوستان سے باہر بھیجا گیا (Indigo) 1837ء میں ہندوستان کا درجہ نیل کی کاشت اور پیداوار میں دنیا میں اول تھا۔ لیکن 1897ء میں جرمنی میں کیمیاوی طور پر نیل کے طیار کرنے کا طریقہ معلوم ہوگیا۔ اور اسی دن سے نیل کی برآمد میں کمی واقع ہونی شروع ہوئی۔ 14-1913ء میں

1895-96 کے رقبہ کا صرف دسواں حصہ زیر کاشت تھا۔ دوران جنگ میں جب جرمنی سے رنگ نہیں منگائے جا سکتے تھے نیل کی کاشت میں پھر اضافہ ہوا ہے۔ لیکن یہ غیر اغلب ہے کہ جنگ کے بعد جب جرمنی سے پھر رنگ آنا شروع ہوتا ہے نیل اُس کا مقابلہ کر سکیگا۔ کاشت کا پھر زوال پذیر ہونا یقینی امر ہے۔

پیداوار میں مدراس کا حصہ سب سے زیادہ ہے۔ لیکن مدراس۔ پنجاب اور ممالک متحدہ میں جو نیل کاشت اور تیار کیا جاتا ہے وہ زیادہ تر اُن صوبوں میں ہی لگ جاتا ہے۔ دوسرا درجہ بہار و اوڑیسہ کا ہے۔ جہانتک نیل کے کھیت زیادہ تر یورپین زمینداروں کے ہاتھ ہیں۔ لیکن برآمد کے لحاظ سے بہار و اوڑیسہ اول صف میں ہیں۔ کیونکہ وہاں نیل مشینوں کے ذریعہ نہایت اعلےٰ طریقوں پر تیار کیا جاتا ہے۔ بہار کے نیل کے کھیتوں پر جس طرح غلامانہ سلوک ہندوستانی مزدوروں کے ساتھ کیا جاتا ہے اُس سے ہر ایک ہندوستانی بخوبی واقف ہے۔

چائے اور قہوہ

چائے کی کاشت اور تجارت بہت بڑے پیمانے پر ہیں 18-1917 میں 12 کروڑ 67 لاکھ روپیہ کی چائے ملک سے باہر بھیجی گئی جو کہ کل برآمد کا $\frac{7}{100}$ تھی۔ چین کے سوائے ہندوستان اور سارے ملکوں سے زیادہ چائے پیدا کرتا ہے۔ لیکن برآمد میں ہندوستان کا درجہ اول ہے۔ چائے پہلے پہل چین سے ہندوستان میں لائی گئی۔ اور گورنمنٹ ہند نے اسکی کاشت میں بہت مدد دی۔ برآمد پہلے پہل 1873 میں شروع ہوئی۔ لیکن 1865

سے یہ فصل اپنے پاؤں پر آپ کھڑا ہونے کے لائق ہوئی - آسام اس فصل کا مرکز ہے - اور کھیت زیادہ تر یورپین آدمیوں کے ہاتھوں میں ہیں - 17-1916 میں کل کھیت چھوٹے بڑے ملا کر سارے ملک میں 4486 تھے - آسام میں 549 انگریزوں کے ہاتھ میں ہیں - اور صرف ساٹھ ہندوستانیوں کے - شمالی ہند میں بھی مندرجہ ذیل اضلاع میں چائے کے کھیت ہیں -

ڈیرہ دون - المڑرہ - کماؤں گڑھوال - کانگڑہ منڈی و سرمور وجنوبی ہند میں دیناد نیلگری - امالی وٹراونکور میں بھی کئی کھیت ہیں - 19-1918 میں کل رقبہ زیر کاشت 678533 ایکڑ تھا - جس میں سے 405951 ایکڑ صرف آسام میں تھا -

قہوہ کے بیج پہلے پہل ہندوستان میں ایک مسلمان حاجی بابا بڈون نے میسور میں لگائے - اس بات کو کوئی دو صدیاں گذر گئی ہیں - لیکن 1830 سے اس کی کاشت میں باقاعدہ کوشش شروع ہوئی - اس کی کاشت اب زیادہ تر مدراس و میسور میں محدود ہے - لیکن کاشت زوال پذیر ہے - کیونکہ برازیل کے سستے قہوہ کا مقابلہ ہندوستانی قہوہ نہیں کر سکتا - اور بہت سے قہوہ کے کھیت اب ربڑ اور چائے کے کھیتوں میں منتقل کئے جا رہے ہیں - 20-1919 میں ایک کروڑ 71 لاکھ کا قہوہ باہر بھیجا گیا - 18-1917 میں 210694 ایکڑ رقبہ زیر کاشت تھا -

تمباکو

تمباکو پہلے پہل ہندوستان میں پرتگیز 1605 میں لائے - اور اگرچہ

شروع شروع میں گورنمنٹ مغلیہ نے اس کی کاشت کو روکنے کی ہرچند کوشش کی۔ لیکن یہ سارے ملک میں پھیل گیا۔ اور اب سارے ملک شاید ہی کوئی گاؤں کیا جھونپڑی ہو جہاں تمباکو استعمال و بسا اوقات کاشت نہ کیا جاتا ہو۔ لیکن سب سے بڑے مرکز تمباکو کی کاشت کے ملک میں تین ہیں۔ مشرقی و شمالی بنگال اور خاصکر اضلاع رنگپور و منگھیر۔

(2) جنوبی ہندوستان کے اضلاع ترچناپلی۔ ڈنڈیگل۔ کوکونیڈا کالی کیٹ۔

(3) جنوبی برما میں رنگون اکیاب و مولمین کے اضلاع۔

تقریباً دس لاکھ ایکڑ زمین پر تمباکو ہندوستان میں کاشت کیا جاتا ہے اور اگر حفاظت سے پرداخت کی جاوے تو فی ایکڑ ۲۰۰ سے 300 پونڈ تک پیدا وار ہو جاتی ہے۔

19-1918 میں خام تمباکو یعنی تمباکو کے پتے 549000 پونڈ کے باہر بھیجے گئے۔ اور چرٹ و سگرٹ 93206 پونڈ کے منگھیر کا کارخانہ تمباکو جو 1909 میں جاری ہوا۔ ہندوستان میں سب سے بڑا تمباکو کا کارخانہ ہے۔ 19-1918 میں یہاں 20240 لاکھ سگرٹ طیار ہوئے اور 144000 پیپے کا تمباکو۔ فوجی خرچ کے لئے گورنمنٹ ولایت سے سگریٹ منگواتی ہے۔ کل درآمد تمباکو کی 20-1919 میں دو کروڑ دو لاکھ کی تھی۔

گنّا یا نیشکر

ہندوستان گنّے کا اصلی گھر ہے۔ اور اب بھی رقبہ زیر کاشت

یہاں سارے ملکوں کی نسبت زیادہ ہے - 35 لاکھ ایکڑ زمین پر اب بھی کاشت کیا جاتا ہے - مدراس کی آب و ہوا اس کے بہت موافق ہے لیکن زیادہ تر یہ شمالی ہند میں ہمالیہ کے زیرین علاقہ میں بویا جاتا ہے صوبہ وار اعداد مندرجہ ذیل ہیں:-

ممالک متحدہ	13 لاکھ ایکڑ	خام گڑ کی اوسط پیداوار فی ایکڑ
پنجاب	$3\frac{1}{2}$ "	ہندوستان میں $1\frac{1}{2}$ سے 3 ٹن ہے
بنگال	$2\frac{1}{2}$ "	حالانکہ جاوا میں $3\frac{1}{2}$ ٹن - اور
بہار	$2\frac{1}{2}$ "	ہوائی میں ۴ ٹن -

گورنمنٹ کی طرف سے کوشش ہو رہی ہے کہ اعلےٰ قسم کے گنّے ہندوستان میں کاشت کئے جاویں - جن سے عمدہ کھانڈ تیار ہو سکے چنانچہ مدراس میں کوئمبٹور میں ایک فارم اسی غرض کے لئے گورنمنٹ کی طرف سے کھولا گیا ہے۔

لاکھ وریٹ

لاکھ جو خاص قسم کے درختوں کی شاخوں سے بطور کیڑوں کے رس کے نکلتی ہے - زیادہ تر آسام - برما - ممالک متوسط و ناگپور سے آتی ہے ...... کسم - بیر - پلاس کے درختوں سے بہت عمدہ قسم کی دستیاب ہوتی ہے۔

لاکھ تیار کرنے کے کارخانے بہار و ممالک متحدہ میں ہیں - اضلاع مرزاپور و بلرام پور خاص طور پر ان کارخانوں کے مرکز ہیں - کلکتہ میں بھی دو کارخانے ہیں - لیکن کل پیداوار کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔

لاکھ پیدا کرنے کی جاپان۔ فارموسا۔ ایسٹ افریقہ میں متواتر کوششیں کی گئی ہیں۔ لیکن کہیں بھی کامیاب نہیں ہوئیں۔ سیام اور انڈو چائنا میں بہت تھوڑی مقدار میں پیدا ہوتی ہے۔ یعنی ہندوستان کی پیداوار کا صرف 2½ ٪۔ اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ لاکھ کی پیداوار میں ہندوستان ساری دنیا میں واحد ٹھیکہ دار ہے 1917-18 میں لاکھ 2,422,599 پونڈ کی باہر بھیجی گئی۔ 1918-19 میں 1903793 پونڈ کی۔ خام لاکھ 1917-18 میں 95936 پونڈ کی۔ اور 1918-19 میں 61843 پونڈ کی۔ دوران جنگ میں گورنمنٹ نے اس کی برآمد پر بندش لگائی۔ اور اپنے و اتحادیوں کے لئے ایک مقررہ قیمت پر لینے کی شرائط لگانی ضروری سمجھیں۔

ربڑ ہندوستان میں زیادہ تر برما اور آسام میں دستیاب ہوتا ہے اور پچھلے چند سالوں میں ٹراونکور۔ کورگ۔ کوچین اور ساحل مالابار پر بھی کھیت کھولے گئے ہیں۔ 1918 میں تقریباً 125000 ایکڑ رقبہ زیر کاشت تھا۔ دنیا کے ربڑ کی پیداوار کے اعداد مندرجہ ذیل ہیں:۔

سیلون	220,000 ایکڑ
ملایا	500,000 "
ڈچ ایسٹ انڈیز	400,000 "
جرمن کالونیز	40,000 "

لیکن برما میں توسیع کاشت کا بڑا امکان ہے 1914-15 میں 3,676,000 پونڈ ربڑ ہندوستان سے باہر بھیجا گیا۔

ہم نے ضروری زراعتی اجناس کا ذکر کر دیا ہے۔ لیکن اس بیان

کو ختم کرنے سے پہلے چند زراعتی اعداد و شمار درج کرنے خالی از دلچسپی نہ ہونگے۔ اعداد 19-1918 کے ہیں۔

کل رقبہ بروئے سرکاری سروے	420,334,421	ایکڑ
رقبہ زیر جنگلات	87,545,999	
رقبہ غیر مزروعہ	142,370,771	
قابل کاشت جنگل	113,812,264	
خالی چھوڑا ہوا رقبہ	72,659,355	
رقبہ مزروعہ زیر کاشت	201,219,661	
رقبہ آبپاشی	47,076,830	

نام خوردنی اجناس	رقبہ	پیداوار کا تخمینہ ٹن
چاول	77,537,820	473,440,000
گندم	19,147,899	7,502,000
جو	6,464,123	
جوار	20,540,390	
باجرہ	11,200-972	
رگی	4,004,356	
مکی	6,062,891	
چنے	7,647,073	
دالیں و متفرق غلّے	25,165,553	
کل خوردنی اشیاء	177,771,077	

متفرق خوردنی اشیاء	رقبہ ایکڑ	پیداوار ٹن
کھانڈ و گڑ	3,014,611	2,337,000
قہوہ	98,221	..
چائے	639,614	380,459,000

روغنی تخم	رقبہ	پیداوار
السی سیڈ	1,447,618	229,900
تل	3,233,350	258,000 "
ریپ و مسٹرڈ	3,056,409	759300
دوسرے تخم	2,731,4361	..
کل روغنی تخم	10,468,813	

دوسری زراعتی اجناس	رقبہ	پیداوار ریمن کے گٹھڑوں میں
کپاس	4,435,084	380,459000
جیوٹ	2,472,634	5,955,600
دوسرے سوتی اشیا	576,206	..
پٹیل	286,588	
افیم	189,940	..
تمباکو	1,045,033	
چارہ	7,227,826	

صوبہ وار کس قدر رقبہ مختلف اجناس کے لئے کاشت کیا گیا۔ اُس کے اعداد مندرجہ ذیل ہیں:۔ کل رقبے کے فیصدی کے حساب سے۔

نام صوبہ	گنّا	چاول	گندم	مکی باجرا وغیرہ	دالیں وغیرہ	روغنی تخم	جیوٹ	کپاس

چند ایک اجناس کا کل پیداوار کا فی صدی جو باہر بھیجا گیا۔

نام جنس	کل پیداوار	برآمد	برآمد کی نسبت کل پیداوار سے
چاول			
گندم			
کپاس			
خام جیوٹ			
چائے			

ہندوستانی صنعتیں

صنعت اور حرفت میں آج کل ہندوستان دنیا کے بہت سے ملکوں سے پیچھے ہے۔ اور جب اس کے ذرائع قدرتی دولت و بیشمار آبادی کا خیال کیا جاتا ہے۔ تو موجودہ پستی کی حالت پر اور بھی بہت افسوس ہوتا ہے۔ لیکن موجودہ حالت ہمیشہ سے نہیں چلی آتی۔ اُس وقت کو ابھی بہت زمانہ نہیں گذرا جب صنعت و حرفت میں بھی دوسرے علوم و فنون کی طرح ہندوستان کا درجہ ساری دنیا میں برتر ین تھا۔

پُرانی تواریخ و سیاحوں کے سفرنامے اور ملک میں بیشمار اندرونی ثبوت اس بات کی اب تک نشانیاں ہیں کہ ہندوؤں کا زمانہ ایک صنعتی ترقی کا زمانہ تھا۔ رامائن اور مہابھارت کے پڑھنے سے جو ملک کی حالت پر روشنی پڑتی ہے۔ اس سے صاف واضح ہے کہ ملک کتنا خوشحال اور فارغ البال تھا۔ اور پوشاکوں۔ محلّوں۔ پلوں۔ ہوائی جہازوں اور شہروں کی تعمیر و بناوٹ کا ذکر اس امر کی کافی شہادت ہے ہر قسم کے ہُنر اور ہُنرمند کاریگر ملک میں موجود تھے۔ لیکن دور جانے کی ضرورت نہیں اور شکی مزاج اشخاص کو راماین اور مہابھارت کے حوالے دینے کی بھی ضرورت نہیں۔ کیونکہ بیرونی شہادت بھی اس امر کی بہت حد تک موجود ہے کہ تین ہزار سال قبل از مسیح ہندوستان اور شہر بابل میں بڑی تجارت ہندوستان کی ساخت شدہ اشیا میں جاری تھی۔ روما سلطنت کے شہنشاہ و امرا ہندوستانی زری و روپہری پوشاکوں میں

ملبوس ہوتے تھے۔ اور عام آبادی کے لیے سستا اور نفیس کپڑا بھی ہندوستان ہی مہیا کرتا تھا۔ مصر میں جو ممیز دریافت ہوئی ہیں۔ اور جن میں سے بعض دو ہزار سال حضرت مسیح سے بھی پہلے کی ہیں۔ وہ بھی ہندوستانی ململ میں ڈھپی ہوئی ہیں۔

دھاتوں اور خاصکر لوہے کے کام میں بھی ہندوستان کا درجہ اونچا رہا ہے۔ دہلی میں لوہے کی لاٹ جو کم از کم پندرہ سو برس پرانی ہے ایک عجوبہ اور اس وقت کے لوہے کی صنعت کی ترقی کی زندہ مثال ہے تلواروں کے پھل اور اعلےٰ قسم کا فولاد ہندوستان سے ہی باہر جاتا تھا۔

ہندوستان اپنی صنعتی ضروریات خود ہی مہیا کرتا تھا۔ اور دوسرے ملکوں کو بھی بھیجتا تھا۔ مسلمانی حملے اور ملک میں پولیٹیکل گڑبڑ رہنے سے یہ صنعتی ترقی کچھ دیر تک رک گئی۔ لیکن عہد مغلیہ میں پھر ہندوستان اپنی پرانی صنعتی و حرفتی جاہ و حشمت پر آنے لگ گیا۔ اور جب پہلے پہل اہل یورپ ہندوستان میں تجارت کرنے آئے تو ہندوستانی ساخت شدہ مال ولایت کی منڈیوں میں دھڑا دھڑ جانے لگا۔ اور خاصکر روئی کا کپڑا سستا اور نفیس ہونے سے ہر ایک کے زیب تن ہونے لگا۔ اس وقت ہندوستان کی تجارت درآمد و برآمد میں خام اشیاء بالکل نہ تھیں۔ سوتی و ریشمی کپڑوں قیمتی پتھروں۔ ہاتھی دانت و لکڑی کے نفیس کام دکھانے کے بدلے ہندوستان میں کوڑی نہ آتا تھا۔ بلکہ سیسہ و سونا چاندی آتا تھا۔

اور تو اور ہندوستان میں ساختہ شدہ جہاز و ہندوستانی ملاح

لارڈ ونسری کے وقت تک لنڈن تک ہندوستانی مال لاد کر لے جاتے
رہے۔ لیکن پلاسی کی لڑائی کے بعد جب انگریزوں نے بنگال کی
دیوانی یا دوسرے الفاظ میں بنگال کی اصلی حکومت اپنے ہاتھوں میں
لے لی اور ان کے اختیار بڑھ گئے۔ ہندوستانی صنعت کا زوال شروع
ہوتا ہے۔ اس زوال کے کئی سبب تھے۔ لیکن تھوڑے ہی عرصہ میں
یعنی انیسویں صدی کے نصف تک ہندوستان کی اقتصادی حالت بالکل
پلٹ گئی۔ اور ہندوستان درآمد میں ولایت سے وہی مال منگوانے لگ
پڑا جو کہ تھوڑا عرصہ پہلے بھاری مقدار میں باہر بھیجا جاتا تھا۔ یعنی روئی
کا کپڑا اور کھانڈ اور ہندوستانی کپڑے کی ساخت کو وہ دھکا لگا کہ
اب تک سنبھلنے میں نہیں آئی۔ غیر ملکی تجارت بالکل بدل گئی ہے۔ اب
ہماری برآمد زیادہ تر خام اشیاء اور درآمد صنعتی ساختہ شدہ مال ہوتا
ہے اور وہ شخص جو ملک کی پرانی ہسٹری سے ناواقف ہو۔ اس وقت
موجودہ حالت کو دیکھ کر شاید یہی نتیجہ نکالیگا کہ ہندوستان ہمیشہ سے
اسی بیکسی کی حالت میں رہا ہے۔ موجودہ حالت میں ہندوستان بجائے
دوسرے گھریلو ملکوں کی طرح یورپ و امریکہ کے مہذب ملکوں کے
لئے پانی کھینچنے والے اور لکڑی کاٹنے والے مزدوروں کی حیثیت سے
ہندوستان کی بیرونی تجارت ملک کی حالت پر کافی روشنی ڈالتی ہے
اور مندرجہ ذیل اعداد اس بات کو اچھی طرح سے واضح کرتے ہیں کہ ہم
کس طرح ہندوستان کی زرعی اور زمینی دولت کو دونوں ہاتھوں
سے ملک سے نکال کر غیر ملکوں میں بھیج رہے ہیں۔ اور پھر انہی اشیاء
کو کئی گنا قیمت دیکر خرید رہے ہیں۔"

ہندوستان کی درآمد ۱۹۱۳ء میں کل $234\frac{3}{4}$ کروڑ روپیہ کی صنعتی و حرفتی اشیاء $24\frac{1}{4}$ کروڑ روپیہ کی خام اشیاء و خوردنی اشیاء $10\frac{1}{2}$ کروڑ روپیہ کی کل درآمد کا 79.2٪ صنعتی اشیاء تھیں۔

برآمد ۱۹۱۳ء میں کل $256\frac{1}{4}$ کروڑ روپیہ جن میں سے 72.5٪ خام اشیاء اور خوردنی اجناس تھیں۔

اس کے مقابلہ میں اُسی سال انگلستان کی تجارت برآمد کا 69.4٪ فیصدی صنعتی اشیاء تھیں۔ اور تجارت درآمد کا صرف 24.3 فیصدی جس سے صاف عیاں ہے کہ جہاں ہم اپنی خام اشیاء دونوں ہاتھوں سے باہر بھیج رہے ہیں۔ وہاں ہم اُس ہی خام مصالحے کو صنعتی اشیاء کی صورت میں بڑی بھاری مقدار میں لے رہے ہیں۔

ہندوستان کے صنعتی زوال کے اسباب میں جانا یہاں مناسب نہ ہوگا۔ یہ معاملہ تواریخ سے تعلق رکھتا ہے۔ لیکن پھر بھی ہم اتنا ضرور کہہ سکتے ہیں کہ اس زوال کا بڑا سبب انگلستان کا محصول حفاظتی یا ایسٹ انڈیا کمپنی کا جور و تعدّی نہیں ہے۔ بلکہ ولایت میں صنعتی انقلاب کا رونما ہونا اور فیکٹری سسٹم کا رواج پانا ہے۔ جس سے سستی اشیاء کی بھاری مقدار بنکر ہندوستان آنی شروع ہو گئی۔ جس کا مقابلہ ہندوستان کی گھریلو دستکاری سے نہ ہو سکا۔ عام لوگوں کے فیشن اور مذاق میں بھی تبدیلی واقع ہونی شروع ہو گئی۔ جس سے کہ ان اشیا کی مانگ بہت کم ہو گئی۔ عہد مغلیہ اور ہندو راجاؤں کے وقت ہندوستان کے ہنرمند کاریگروں کی سرپرستی امراء رؤساء اور بادشاہِ وقت کی طرف سے ہمیشہ ہوتی رہتی تھی۔ جس سے کہ ان کی اشیاء کی

بکری ہمیشہ یقینی ہوتی تھی۔ اور عام لوگوں میں بھی اُن اشیاء کے برتنے کا رواج رہتا تھا۔ لیکن انگریزوں کے راج ہو جانے سے یہ سرپرستی بالکل اُٹھ گئی۔ اور رفتہ رفتہ "جیسا راجا ویسی پرجا" کے مصداق لوگوں نے بھی اپنے مذاق مغربی کھلونوں کے لئے بدل لئے۔

گورنمنٹ کی بھی انیسویں صدی کے آغاز سے لیکر یہ خاص کوشش رہی ہے کہ ہندوستان میں خام اشیاء کی پیداوار کو فروغ دیا جاوے اور اس کی برآمد کے لئے ریلوں سڑکوں کا ایک جال سا سارے ملک میں پھیلایا جاوے۔ تجارت برآمد کا قدرتی نتیجہ نکلنا تھا کہ اُن کی قیمتوں میں اضافہ ہو جاوے۔ لیکن اس اضافہ قیمت نے ہندوستانی گھریلو دستکاری کی رہی سہی بھی کمر توڑ دی۔ کیونکہ جولاہوں اور کاریگروں کو اب زراعت میں بہت فائدہ نظر آنے لگا اور وہ اپنے اپنے آبائی پیشوں کو خیرباد کہکر خام اشیا اور خوردنی اشیا کی پیداوار میں لگ گئے۔ چنانچہ صرف 1865 اور اس کے چار پانچ سال کے اندر اندر جب امریکہ میں خانہ جنگی کے سبب سے لنکا شائر کو ہندوستان کی کپاس لینی پڑی جس سے اس کی قیمت میں بہت اضافہ ہو گیا۔ ہزارہا جولاہے دکن میں اپنا پیشہ چھوڑ کر زراعت اور زمین کی کاشت میں لگ گئے۔

مندرجہ بالا چند ایک ضروری اسباب ہیں جس سے ہندوستان کی صنعت کا پانسہ پچھلی صدی میں بالکل پلٹ گیا۔ لیکن اس کے کھنڈرات پر چند نئی صنعتوں کی بنیاد پڑی۔ اور موجودہ وقت میں جن کی ترقی پر ملک کی صنعتی اور حرفتی ترقی کا انحصار ہے۔ اُن کا ذکر کرنا غیر موزوں نہ ہوگا

ہم ان صنعتوں کو دو جماعتوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ بڑی صنعتیں جو کہ اچھی خاصی ترقی کر چکی ہیں۔ اور چھوٹی چھوٹی صنعتیں جن کی بنیادیں تو پڑ چکی ہیں۔ لیکن جو ابھی بچپن کی حالت سے لے کر جوانی کی حالت میں نہیں آئیں۔

گھریلو جیوٹ یا اسی کی صنعت تو بنگال میں مدت مدید سے چلی آتی ہے۔ لیکن موجودہ فیکٹری سسٹم سے مطابق اس کی بنیاد 1828 سے پڑی۔ لیکن کاتنے کا کارخانہ سیرامپور میں 1855 کو اور بننے کا برانگر میں 1859 کو جاری کیا گیا۔ ہاتھ سے بننے کا کام اب بنگال میں بالکل کالعدم ہو گیا ہے۔ اگرچہ کاتنے کا کام بطور گھریلو دستکاری کے اب بھی اچھے خاصے درجہ پر جاری ہے۔ اس صنعت نے 1874 سے حیرت انگیز ترقی کی ہے۔ جنگ کریمیا 1855 اور امریکہ کی خانہ جنگی 1865 کے بعد جیوٹ کی صنعت کو بہت ہی فروغ حاصل ہوا۔ کیونکہ ان ہردو جنگوں کے موقعہ پر روس سے سن اور پٹ سن اور امریکہ سے کپاس کی برآمد بند ہو جانے سے دنیا میں جیوٹ کی مانگ بہت بڑھ گئی اور بوریاں وغیرہ اس کی بننی شروع ہو گئیں۔

1874 میں جیوٹ کی پیداوار پانچ کروڑ چالیس لاکھ روپیہ کی تھی

1918 " " پچاس کروڑ روپیہ کی

اس وقت 76 کارخانے ہیں جن میں 39300 کھڈیاں کام کرتی ہیں۔ دو لاکھ ستر ہزار آدمی مزدوری کرتے ہیں۔ اور 14 کروڑ 75 لاکھ روپیہ بطور سرمایہ کے کارخانوں میں لگا ہوا ہے۔

خام جیوٹ کی پیداوار میں ہندوستان ساری دنیا میں ایک ہی ملک

ہے۔ صنعت میں ڈنڈی واقع سکاٹ لینڈ کے ساتھ کچھ مقابلہ ہے لیکن ڈنڈی کے کارخانوں کی پیداوار ہندوستانی کارخانوں کی پیداوار کے مقابلے میں صرف $\frac{1}{5}$ ہے۔

دوران جنگ میں اس صنعت نے بہت روپیہ کمایا ہے۔ کیونکہ باہر کی منڈیاں بند ہو جانے سے خام جیوٹ کی قیمت بہت گر گئی۔ جس سے ہندوستانی کارخانہ داروں نے بہت سستے داموں خرید لیا اور ساتھ ہی جنگ کے لئے ریت کے بڑے بڑے بورے کینوس بیگ بوریاں۔ جیوٹ کا کپڑا وغیرہ اشیاء کے لئے مانگ بہت بڑھ گئی۔

ان اشیاء میں تجارت برآمد دوران جنگ میں مندرجہ ذیل تھی:-

1916-17	28 ملین پونڈ
1917-18	29 "
1918-19	35 "

مارچ 1916 میں پانچ فیصدی محصول برآمد گورنمنٹ نے جیوٹ پر لگایا۔ 1917 میں یہ محصول دُگنا کیا گیا۔ 19-1918 میں اس محصول سے گورنمنٹ کو $1\frac{1}{2}$ ملین پونڈ کی آمد ہوئی۔

کپڑا

20-1919 میں کپاس کی پیداوار ۴۰۰ پونڈ فی بوری کے حساب سے 5,845,000 بوریاں تھیں۔ اور 2 کروڑ 63 ہزار ایکڑ زمین رقبہ کاشت تھا۔ گھریلو صنعت روئی کے زوال کے اسباب پر ہم پیچھے روشنی ڈال آئے ہیں۔ موجودہ مشینی صنعت کی بنیاد ہگلی میں 1873 میں

ڈالی گئی۔ دوسرا کارخانہ بمبئی میں 1853ء میں کھلا اور اس وقت سے لے کر صنعت نے حیرت انگیز ترقی کی ہے۔ 1880ء میں صرف 58 کارخانے تھے۔ 1918ء میں اس کی تعداد 269 ہو گئی۔ اور دو لاکھ 84 ہزار آدمی اس میں کام کرتے تھے۔ اس وقت ایک لاکھ 14 ہزار سے اوپر کھڈیاں اور 67 لاکھ سے اوپر تکلے کام کر رہے ہیں۔ ہندوستان دنیا میں کپڑے کی پیداوار کے لحاظ سے چوتھے درجہ پر ہے۔ انگلستان، امریکہ اور جرمنی بالترتیب پہلے ہیں۔

زیادہ تر کارخانے بمبئی میں واقع ہیں یعنی 73 اجن میں ساری ہندوستانی پیداوار کا 75% تاگا اور سوت اور 87% بنا ہوا کپڑا تیار ہوتا ہے۔ ہندوستانی کپڑے کی 90 فیصدی عام طور پر ہندوستان میں ہی کھپت ہوتی ہے۔ 1911ء میں ہندوستانی کپڑے اور بدیشی کپڑے کی نسبت 47 اور 100 کی تھی۔ 1915ء میں یہ نسبت 69 اور 100 کی رہ گئی۔ اب ہندوستان میں پہلے سالوں کی نسبت نفیس کپڑا بھی زیادہ مقدار میں بننا شروع ہو گیا ہے۔

کھانڈ

گنا اور شکر ساری دنیا میں پہلے پہل ہندوستان سے گیا۔ اور اب بھی رقبہ کاشت دوسرے ملکوں کی نسبت ہندوستان میں زیادہ ہے۔ 1918ء میں رقبہ زیر کاشت 2,818,000 ایکڑ تھا۔ اور تخمیناً پیداوار گڑ کی 3576700 ٹن تھی۔ لیکن چونکہ کثیر حصہ آبادی سبزی خور ہے اس لئے گڑ شکر کی کھپت بھی ہندوستان میں اور سب

ملکوں سے زیادہ ہے۔ ہندوستانی پیداوار ناکافی ہونے سے اب ہم باہر سے بدیشی کھانڈ بھاری مقدار میں منگواتے ہیں۔ بدیشی سفید کھانڈکو لوگ بھی اپنے گڑ اور شکر پر ترجیح دینے لگ گئے ہیں۔ عام طور پر درآمد ۱۷ کروڑ روپیہ کی ہوتی ہے۔ ۱۹۱۹ میں قیمتیں بڑھ جانے سے 29 کروڑ روپیہ کی کھانڈ ہم نے باہر سے منگوائی۔

ہندوستانی پیداوار فی ایکڑ دوسرے ملکوں کی پیداوار سے کم ہے۔ مثلاً

جاوا میں فی ایکڑ اوسط پیداوار $3\frac{1}{2}$ ٹن صاف کھانڈ ہے

ہوائی " " " 4 ٹن " "

ہندوستان " " " $1\frac{1}{2}$ سے 3 ٹن " "

اس کمی اور کھانڈ کی صنعت کی سست رفتار کے مندرجہ ذیل اسباب ہیں:-

(۱) بیلنے عام طور پر بیلوں سے چلائے جاتے ہیں۔ حالانکہ دوسرے ملکوں میں یہ کام طاقت سے ہوتا ہے۔

(۲) یہاں کھانڈ گڑ سے بنائی جاتی ہے۔ دوسرے ملکوں میں براہ راست رس سے

(۳) گڑ چونکہ عام کھپت میں بھی آتا ہے۔ اس لئے اس کی قیمت بڑھی رہتی ہے۔ اور اس کو خرید کر اس سے کھانڈ بنانے میں چنداں فائدہ نہیں رہتا۔

(۴) کارخانے ان رقبوں میں واقع نہیں ہیں۔ یا ان سے دور فاصلہ پر ہیں۔ جہاں نیشکر بھاری مقدار میں پیدا ہوتا ہے۔

ان اسباب کے جزوی یا کلی طور پر دور کرنے سے کھانڈ کی پیداوار میں بہت اضافہ ہو سکتا ہے۔ اور بدیشی کھانڈ کی درآمد بہت کم ہو سکتی ہے۔

چمڑہ و بوٹ

چمڑہ دوسرے ملکوں کی نسبت ہندوستان میں زیادہ طیار ہوتا ہے۔ لیکن جنگ سے پہلے زیادہ تر امریکہ اور جرمن کو خام حالت میں ہی بھیجا جاتا تھا۔ اور سالانہ بوٹوں اور جوتوں کی درآمد بھی اچھی خاصی تھی۔ لیکن دوران جنگ میں گورنمنٹ کی بھاری امداد سے اس صنعت نے حیرت انگیز ترقی کی ہے۔ 1913ء میں ہندوستان سے کمائے ہوئے چمڑے کی قیمت 29.8 لاکھ روپیہ تھی۔ 1917-18ء میں دو کروڑ 18¼ لاکھ روپیہ۔ جس سے صاف عیاں ہے کہ چمڑہ کمانے اور رنگنے کی صنعت کو کس قدر فروغ حاصل ہوا ہے۔

اس وقت چمڑے کی پیٹیاں، نڈولر، چمڑا اور Leather Goods اور بوٹ کافی مقدار میں ہندوستان میں بنائے جاتے ہیں۔ مثلاً بوٹوں کی سالانہ مقدار اب 2.5 لاکھ جوڑے ہے جو کہ قبل از جنگ کی پیداوار سے 2.5 گنا ہے۔ کانپور، کلکتہ اور مدراس اس صنعت کے گھر ہیں۔

کھال اتارنے میں لاپرواہی۔ مذہبی جذبہ۔ کئی جگہوں کی آب وہوا اور چمڑے کو بیچنے کی غرض سے بھگو دینا یا اور طرح خراب کرنا۔ یہ چند ایک نقائص ہیں جن کی موجودگی میں ترقی کچھ درجہ تک رکی ہوئی ہے۔ ۱۱ ستمبر 1919ء سے گورنمنٹ ہند نے 15 فیصدی محصول برآمد

خام چمڑے پر لگا دیا جس میں سے ۹۰ فی صدی معاف کر دیا جاتا ہے۔ اگر وہ چمڑہ سلطنت کے کسی حصہ کو کمائے جانے اور رنگنے کی غرض سے بھیجا جاوے۔

لوہا و فولاد

اچھی قسم کا خام لوہا تو ملک کے ہر حصہ میں پایا جاتا ہے۔ لیکن شاذ و نادر ہی کوئلہ کے پاس ہوتا ہے۔ جس سے اس کا پورا فائدہ اٹھایا نہیں جاتا۔ لوہا پگھلانے کا کام پرانے طریقوں کے مطابق تو سارے ملک میں کیا جاتا ہے۔ لیکن نئے مغربی ڈھنگ پر اب تک صرف دو کارخانے قائم ہوئے ہیں۔ جو کہ کامیابی سے چل رہے ہیں۔ کوشش تو دراصل 1830ء سے اور پھر 1875ء سے کی جا رہی ہیں۔ لیکن کامیابی کی صورت صرف اب رونما ہوئی ہے۔

بنگال سٹیل آئرن کمپنی کا ہیڈ کوارٹر براکار میں ہے۔ اور اضلاع مان بھوم سنگھ بھوم مبران کی کانیں واقع ہیں۔ ٹاٹا کمپنی کا کارخانہ ساکچی یا جمشید نگر میں ہے اور ضلع رائے پور میں ان کی کانیں ہیں۔ ۱۹۱۹ء میں ہر دو کارخانوں کی پیداوار مندرجہ ذیل تھی جو ہندوستان کی ضروریات اور وسعت کو مد نظر رکھتے ہوئے بہت ہی کم تھی۔ یہ بھی بات قابل غور ہے کہ ہندوستان میں مشینری بنانے کا ابھی تک ایک بھی انجنیئرنگ کا کارخانہ نہیں کھلا۔

	پگ آئرن	فولاد اور ریل	فیرو مینگانیز
ٹاٹا کمپنی	232368 ٹن	134061 ٹن	2650 ٹن

بنگال کمپنی 84965 ٹن 29635 ٹن 4732 ٹن

چند چھوٹی صنعتیں

ہم ان صنعتوں کو "چھوٹی" اس وجہ سے نہیں کہتے کہ یہ ملک کے لئے غیر ضروری ہیں۔ یا ان کے لئے ملک میں مانگ کم ہے۔ بلکہ صرف اس لئے کہ ابھی تک یہ بہت چھوٹے پیمانے پر جاری ہو سکی ہیں۔ اور درآمد بہت زیادہ ہے۔

کاغذسازی

کاغذسازی کے آدھ درجن کے قریب اچھے کارخانے ملک میں کام کر رہے ہیں جن کی اوسط پیداوار سالانہ تیس ہزار ٹن تک ہو سکتی ہے کل سالانہ کھپت ہندوستان میں 75 ہزار ٹن کے قریب ہے جنگ سے پہلے ان میں سے کوئی بھی کارخانہ منافع پر کام نہیں کر رہا تھا۔ لیکن اب ان کی حالت اچھی ہے۔ دوران جنگ میں ان کارخانوں نے گورنمنٹ کے لئے 63 ملین پوسٹ کارڈ۔ ریلوے ٹکٹ۔ کاربن کاغذ۔ نقل کرنے والا کاغذ گتا اور صفائی کرنے والا کاغذ تیار کیا۔

اس صنعت کا خام مصالحہ۔ گھاس۔ بانس۔ چیتھڑے اور خاصکر اول الذکر ہند میں بھاری مقدار میں دستیاب ہوتا ہے۔ آجکل درآمد بھی ہزاروں روپیوں کی ہے۔ چونکہ ہندوستانی خام مصالحہ کے ٹھیک استعمال کرنے سے بہت درجہ تک رک جاویگی۔ صنعت کی ترقی کے لئے ضروری ہے۔ (۱) پلپ یا گودہ تیار کرنے کے کارخانے جنگلات کے

نزدیک بنائے جاویں۔ (۲) مختلف گھاسوں سے کاغذ بنانے کے تجربات اور تحقیقات کی جاوے۔ (۳) اور ان صنعتوں کو ترقی دی جاوے۔ جن کی ترقی پہ کاغذ کی صنعت کی بھی ترقی کا دارومدار ہے یعنی سفید کرنے والا پوڈر .. .. .. کاسٹک سوڈا سفید مٹی وغیرہ

شیشہ

پرانی صنعت کے کھنڈرات پر نئی صنعت کی بنیاد 1892ء میں رکھی گئی۔ لیکن جنگ تک نئے جاری شدہ کارخانوں کی حالت اچھی نہ تھی۔ لیکن دوران جنگ میں کچھ ترقی ہوئی۔ اس وقت بیس کے قریب کارخانے جاری ہیں۔ فیروزآباد چوڑیاں بنانے کا بھاری مرکز ہے اور بیس لاکھ روپیہ سالانہ کی چوڑیاں یہاں بنائی جاتی ہیں۔ اگرچہ ابھی تک چالیس لاکھ کی باہر ملکوں سے بھی آتی ہیں۔

اب چمنیاں۔ بوتلیں۔ فلاسک۔ پیمانے۔ گلاس۔ ٹیسٹ ٹیوب۔ اور طشتریاں ہندوستانی کارخانوں میں بھی بننے لگ گئی ہیں۔ تاہم 18-1917ء میں ایک کروڑ 62 لاکھ روپے کا شیشہ کا سامان ہندوستان میں باہر سے لایا گیا۔

موجودہ حالت صنعت کی تسلی بخش نہیں ہے کیونکہ انبالہ اور فیروزآباد جو کہ اس کے مرکز ہیں۔ وہ کوئلے اور ریت کی کانوں سے بہت دور ہیں۔ اور یہ چیزیں صنعت کے لئے ضروری ہیں۔ اس لئے جب تک ان کارخانوں کو کرایہ ریل میں رعایت نہ دی جاوے یا حفاظتی محصول درآمد پر نہ لگایا جاوے۔ ان کا بدیشی مال سے مقابلہ

کرنا مشکل ہو گا۔

صابن سازی

صابن کے ہندوستان میں چھوٹے بڑے 65 کارخانے ہیں۔ جو کہ 28 ہزار سے 35 ہزار ٹن صابن تیار کر سکتے ہیں۔ لیکن زیادہ تر صابن ادنےٰ قسم کا ہوتا ہے۔ یعنی کل مقدار کا $\frac{15}{16}$ حصہ۔ ولایتی صابن کی موجودہ قیمتوں کا خیال کر کے بلاشبہ یہ یقین ہو جاتا ہے کہ وہ اصلی صابن نہیں ہیں۔ ضرور غلط ملط مصالحے سے بنائے جاتے ہیں۔ کیونکہ کھرے صابن بنانے میں خرچ زیادہ آجاتا ہے۔ اور موجودہ قیمتوں پر اس کا بیچنا محال ہے۔ ہندوستانی صابن سازی کے راستے میں مندرجہ ذیل مشکلات ہیں:-

(۱) سستی چیزیں مثلاً باورچی خانوں کی جوٹھ۔ پگھلی ہوئی چربی۔ ہڈی کی چربی۔ جہازوں۔ کارخانوں سے بچی ہوئی روغنی اشیا وغیرہ یہاں اس کام کے لئے دستیاب نہیں ہو سکتیں۔

(۲) ملحقہ صنعتیں ابھی کمزور ہیں۔ یعنی بکس بنانا لیتھوگراف اور تصویروں کے بلاک بنانے۔

(۳) گلیسرین کی بچت نہیں ہو سکتی۔ اگرچہ تیل کے روغن بہت سستے ہیں اور مزدوروں کی بھی کمی نہیں ہے۔

دیا سلائی

۲۰-۱۹۱۹ء میں ہندوستان میں ۱۵ ملین گروس دیا سلائی کی ڈبیاں باہر سے آئیں۔ جن کی مجموعی قیمت دو کروڑ پانچ لاکھ تھی۔ کل درآمد کا

93 فیصدی جاپان سے آیا۔ انگلستان میں بنی ہوئی ڈبیاں بہت ہی کم
اب آتی ہیں اور مقابلے میں جاپانی مال سستا ہونے سے بازی لے جارہا
ہے۔ دیاسلائی کی لکڑی کے لئے ہندوستان میں بہت سے درخت کارآمد
ہوسکتے ہیں۔ یعنی کدم۔ آم۔ پلاش وغیرہ

+

اب تک ہندوستانی کارخانوں کو کوئی کامیابی حاصل نہیں ہوئی
جنگ سے پہلے صرف چھ کارخانے کام کر رہے تھے۔ تھوڑا عرصہ ہوا
جبکہ دو نئے کارخانے اعلیٰ پیمانوں پر رنگون اور مانڈلے میں جاری
کئے گئے ہیں۔ ایک جیپنیوں نے ایک انگریزوں نے جاری کیا ہے ۔

سگرٹ سازی

اگرچہ تمباکو کا بڑا مرکز بنگال ہے لیکن سگرٹ سازی کے بڑے
کارخانے مدراس میں ضلع ڈنڈیگل اور پانڈیچری میں ہیں منگلیر کا کارخانہ
1908 میں جاری کیا گیا۔ 19-1918 میں اس کارخانہ نے 224 ملین
سگرٹ طیار کئے۔ اور 144000 پاؤنڈ (نصف سیر) پینے کا تمباکو۔
سودیشی سگرٹوں کے باوجود درآمد 20-1919 میں دو کروڑ
دولاکھ روپیہ کی تھی۔ جس سے صاف واضح ہوتا ہے کہ ہندوستانی
صنعت کے لئے ابھی ترقی کا کافی میدان کھلا ہے ۔

پچھلی فصلوں میں ہم نے ہندوستان کی زرعی اور صنعتی پیداوار پر
نظر ڈالتے ہوئے موجودہ حالت کا مطالعہ کیا ہے۔ لیکن کسی ملک کی
بھی دولت کا صحیح اندازہ لگانے کے لئے اُس ملک کے آمد رفت پر بھی

غور کرنا اشد ضروری ہے جن سے اضافہ دولت و پیداوار میں مدد ملتی ہے۔ اس لئے ہندوستان کی آرتھک وشا کو جانچنے کے لئے ہندوستان کی ریلوں کا مطالعہ کرنا ضروری ہے۔ ریل تار برقی اور دخانی جہاز موجودہ صنعتی یورپ میں زبردست معاون ہوتے ہیں۔ کیونکہ اُن کا مجموعی اثر وقت کی بچت کرنا اور فاصلہ کو دور کرنا ہے دنیا کی ساری تجارتی منڈیاں ایک دوسرے کے نزدیک آگئی ہیں اور دولت کی پیداوار کئی گنا بڑھ گئی ہے۔ ہندوستان کی حالت میں تو خاصکر تبدیلی واقع ہوئی ہے۔ جس پر ہم اس فصل کے اخیر پر غور کریں گے۔

ہندوستان میں ریل بنانے کی تجویز پہلے پہل 1845 میں ہوئی۔ لیکن پرائیویٹ انگریزی کمپنیوں کو ان ریلوں کے لئے سرمایہ اکٹھا کرنے میں تکلیف واقع ہوئی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے بورڈ آف ڈائرکٹرز نے اس تکلیف کو عبور کرنے کے لئے تجویز کی کہ "ذمہ داری" کی سکیم پر عمل کیا جاوے۔ یہ "ذمہ واری" کی سکیم یہ تھی کہ گورنمنٹ ہند سارے سرمایہ پر جو پرائیویٹ کمپنیاں ہند میں ریل بنانے کے لئے جمع کریں۔ کم از کم سود دینے کی ذمہ واری اپنے کندھوں پر لے۔ خواہ کمپنی کو گھاٹا پڑے یا منافع رہے۔ 1849 میں لارڈ ڈلہوزی نے گورنمنٹ ہند کی طرف سے ایک مراسلہ بھیجا جس میں ریل بنانے کے اغراض اور فوائد پر بحث کرتے ہوئے اخیر میں کم از کم پانچ فیصدی شرح سود دینے کی ذمہ واری لینے کی آمادگی ظاہر کی۔ یہ مراسلہ ہندوستان کی ریلوے ہسٹری میں ایک اہم وقت کا آغاز کرتا ہے لارڈ

ڈلہوزی نے بڑی صاف بیانی سے اس میں ظاہر کر دیا کہ اس کی اغراض ریلوے بنانے میں زیادہ تر جنگی اور ملکی ہیں نہ کہ اقتصادی۔ اور اگر کوئی اقتصادی غرض ہے بھی تو وہ یہ ہے کہ انگلستان کا ہند پر ملکی غلبہ کے ساتھ ساتھ اقتصادی غلبہ بھی قائم ہو جاوے۔

مراسلہ پہنچنے پر قانونی کارروائی پوری کی گئی اور ۱۷۔ اگست 1849ء کو کمپنیوں کے ساتھ ٹھیکہ باقاعدہ طور پر کیا گیا۔ اس ٹھیکہ کی چند ایک ضروری شرائط یہ تھیں کہ گورنمنٹ نے ریلوں کو ۹۹ سال کے بعد خرید کر لینے کا حق محفوظ رکھا۔ اور اس حق میں غیر منقولہ جائداد کی قیمت دینے سے سبکدوش تھی۔ ڈاک کا کام کمپنیوں کو مفت کرنا اور فوجی سامان اور سپاہیوں کو آدھے کرایہ پر لے جانا تھا۔ گورنمنٹ نے اور بھی شرائط ایسی منوائیں کہ جس سے گورنمنٹ کی پوری پوری نگرانی ریلوں پر حاصل ہوئی۔ لیکن یہ سسٹم ناقص ثابت ہوا۔ کیونکہ کمپنیاں انگلینڈ میں منڈی سے زیادہ شرح سود پر قرضہ لینے لگ گئیں۔ یعنی پانچ فیصدی پر جس کی ذمہ واری گورنمنٹ ہند نے لی تھی۔ نگرانی سے دو عملی واقع ہو گئی۔ اور گورنمنٹ اور کمپنی کے افسروں میں جھگڑے پڑنے شروع ہو گئے۔ پہلے پہل بڑے پیمانے پر ریلیں بنانی شروع کی گئیں جو کہ ہندوستان کی اس وقت کی ضروریات کو مدنظر رکھتے ہوئے صاف فضول خرچی اور روپیہ کا بیجا استعمال تھا۔ ہندوستان کے انجنیر ریلوے بنانے کے علم سے ناآشنا تھے۔ اور کمپنی کے انجنیر ملک کے جغرافیہ سے ناواقف تھے۔ دوسرے دونوں طرف سے کوشش ہوتی تھی کہ کام ختم ہونے میں جتنی تاخیر ہو اتنا ہی اچھا ہے کیونکہ ان کو عالی شان تنخواہیں ملتی رہیں گی۔

بورڈ آف ڈائرکٹرکی لنڈن میں یہ کوشش ہوتی تھی کہ ریلوے سامان خریدنے میں وہ اپنے منظور نظروں کو فائدہ پہنچایئں۔

ان مندرجہ بالا اعدا ونقائص کی وجہ سے 1868ء میں اس ذمہ داری کے سسٹم کا خاتمہ کیا گیا۔ 1869ء میں دوسرا دور لارڈ لارنس نے خود گورنمنٹ کی طرف سے ریلیں بنانے کا شروع کیا۔ وزیر ہند نے ہندوستان کی مالگذاری اور محصول پر قرضہ لینا شروع کیا۔ اور نئی لائنیں برابر اس اصول پر دس سال تک بنائی جاتی رہیں۔ 1878-1880ء کے قحط سے گورنمنٹ نے نتیجہ نکالا کہ قحط دور کرنے کے لئے ریلیں بہت ضروری ہیں۔ لیکن گورنمنٹ کے خود بنانے سے ریلوے ترقی جلدی نہیں ہو سکتی۔ اس لئے کمپنیوں کی امداد ضروری ہے چنانچہ اس کے بعد اب تک اس پالیسی پر عملدرآمد ہوتا آیا ہے۔ 1884ء کے بعد بہت سا روپیہ پنجاب اور سرحد میں جنگی ریلیں بنانے میں خرچ کیا گیا۔

اس ساری ہسٹری پر نظر ڈالنے سے صاف ظاہر ہے کہ ریلوں کے بنانے میں گورنمنٹ نے نہایت تیزی سے کام لیا ہے۔ اور بڑا گھاٹا پایا ہے۔ یہ تعمیر ریلوے کی تیزی کا ہی نتیجہ تھا کہ 1896ء تک ہندوستانیوں کی پاکٹ سے 52 کروڑ روپیہ ٹیکسوں کی صورت میں وصول کیا جا چکا تھا۔ تاکہ گورنمنٹ اس سالانہ گھاٹے کو پورا کر سکے جو ان ریلوں کی تعمیر میں واقع ہوا چند سال خوشحالی کے بھی آئے۔ لیکن 1908ء میں پھر گھاٹا آموجود ہوا۔ لیکن اس کے بعد اب تک منافع ہی ہوتا رہا ہے دوران جنگ میں تو خاصکر ریلوں سے بڑی بھاری آمدنی ہوتی ہے۔

شروع میں جو کمپنیاں ذمہ داری کے اصول پر بنائی گئی۔ ان میں

سے تقریباً سب گورنمنٹ نے خرید کر لی ہیں۔ چنانچہ ایسٹ بنگال۔ نارتھ ویسٹرن۔ اودھ روہیلکھنڈ۔ بمبئی بڑودہ۔ سنٹرل انڈیا گورنمنٹ کی ملکیت تھیں۔ ایسٹ انڈین اور جی۔ آئی۔ پی گورنمنٹ نے 1880ء اور 1900ء میں خرید کر کمپنیوں کو چلانے کے لئے دیدیں۔ جی۔ آئی۔ پی کا ٹھیکہ 31 دسمبر 1925ء کو ختم ہوتا ہے۔ ایسٹ انڈین کا دو سال کے لئے دسمبر 1919ء سے بڑھایا گیا۔

1897 تک ریلوں کا انتظام محکمہ پارک ماسٹری کے سپرد رہا۔ جس میں ایک ماہر سکرٹری اور تین ماہر ڈپٹی سکرٹری گورنمنٹ کو مشورہ دینے کے لئے تھے۔ 1905ء سے ریلوے بورڈ قایم کیا گیا جس میں دو ممبر ایک سکرٹری اور ایک چیئرمین ہے۔ نگرانی اور نئی لائن کی منظوری وغیرہ سارے فرائض اس بورڈ کے ماتحت ہیں۔ اگرچہ اخیر فیصلہ نگرانی اور پالیسی مقرر کرنا گورنمنٹ ہند کے ہاتھ ہے۔ بورڈ کی نمائندگی گورنمنٹ ہند میں ممبر صنعت و حرفت کرتا ہے۔
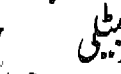
1918 کے اخیر پر 36616 میل ہندوستانی ریلوں کی لمبائی تھی جن پر کل خرچ اس وقت تک 5،49،74،45،000 روپیہ آچکا تھا۔ اور جو خرچ کو نکال کر خالص بچت اب تک 44،48،51،000 روپیہ کی دے چکی ہیں۔

ریلوں کا ملک پر اقتصادی اثر بڑا بھاری پڑا ہے (۱) سفر کرنا بہت سستا ہو گیا۔ یاتریوں کو بہت سہولت مل گئی ہے (۲) گنجان آباد علاقہ کے لوگ ملک کے دوسرے حصوں میں آسانی سے جا سکتے ہیں۔ اوڑیسہ۔ ممالک متحدہ آگرہ و اودھ کے مشرقی اضلاع بمبئی باہر کے

لوگ اب بھاری تعداد میں بنگال ۔ آسام اور پنجاب کو نوکری کی تلاش میں جاسکتے ہیں۔ (۳) فالتو زراعتی غلہ کے لئے منڈیاں مہیا ہو گئی ہیں۔ (۴) درآمد کی اشیا سستی پڑتی ہیں۔ (۵) قیمتوں میں تفاوت کم ہو گئی ہے (۶) قحط سالی اور قحط کی تکلیف کو دور کرنے میں ریلیں بڑی مفید ثابت ہوئی ہیں۔ (۷) نئے شہر و قصبہ آباد ہو گئے ہیں۔ اور صنعت اور حرفت کو بہت عروج حاصل ہوا ہے۔ (۸) ذات پات کے بندھن۔ صوبجات کی تفریق وغیرہ ڈھیلے پڑ گئے ہیں۔ اور ریلیں ملک میں قومیت کے جذبہ کو پیدا کرنے میں بڑی معاون ثابت ہوئی ہیں۔

لیکن ہندوستانی ریلوے سسٹم میں چند ایک نقائص بھی ہیں۔ جن کو دور کرنا اشد ضروری ہے۔ (۱) مختلف پٹڑیاں ہونے سے اور ریلوں کی کمی سے سواری و اسباب کو جگہ بہ جگہ بدلنے سے بڑا حرج و خرچ واقع ہوتا ہے۔ (۲) صنعتی اشیا کی درآمد کو فروغ دینے سے ملک کی گھریلو دستکاری کو بہت نقصان پہنچایا ہے۔ (۳) غلہ اور خام اشیا کی برآمد کو ترقی دے کر ان چیزوں کی قیمتوں میں اضافہ کر دیا ہے۔ (۴) اب تک ہندوستانی ریلوں کی کرایہ کی پالیسی یہ رہی ہے کہ اگر ہندوستان میں بنی ہوئی اشیا کو ملک کے ایک دوسرے حصہ میں بھیجا ہو تو کرایہ زیادہ دینا پڑتا ہے۔ اور اگر باہر سے آئے ہوئے صنعتی مال کو اتنا ہی فاصلہ طے کرنا ہو تو کرایہ تھوڑا ہے۔ اسی طرح کراچی بمبئی وغیرہ ساحلی شہروں کو غلہ اور خام پیداوار بھیجنے میں خرچ کم دینا پڑتا ہے۔ اور صنعتی اشیاء کے بھیجنے پہ زیادہ اس تفاوت نے ہندوستانی صنعت کو بہت نقصان پہنچایا ہے۔ (۵) پانی کے قدرتی رو کو ریل کی پٹڑی روکتی ہے موسم

برسات میں یہ دقت بہت زیادہ ہو جاتی ہے۔ اور پانی رُک کر ملیریا وغیرہ بیماریاں پھیلانے کا سبب ہوتا ہے۔

بنگال کے ڈاکٹر بینٹلی [illegible] نے بہت تحقیقات اور تجربہ کی بنا پر یہ دریافت کیا ہے کہ بنگال میں ملیریا یا موسمی بخار کی روز افزوں ترقی کا سبب صرف ریلیں ہوئی ہیں۔ چنانچہ مشرقی بنگال میں جہاں ریلوں کا جال اتنا وسیع نہیں ہے۔ جتنا مغربی بنگال میں ملیریا کم ہوتا ہے۔

اس فصل کو ختم کر دینے سے پہلے ہندوستان کی ریلوں کو قومی بنا دینے کے مسئلہ پر بھی کچھ کہنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

ہندوستان میں یہ سوال اتنا پیچیدہ نہیں ہے جتنا دوسرے ملکوں میں جہاں ملکیت انتظام وغیرہ سب کچھ پرائیویٹ کمپنیوں کے ہاتھ میں ہے۔ لارڈ ڈلہوزی نے شروع ہی سے نگرانی کا اصول قایم کر دیا تھا اور اس اصول پر ہمیشہ ہی عملدرآمد ہوتا آیا ہے۔ ریلوے پالیسی میں خواہ کتنی ہی تبدیلیاں واقع کیوں نہ ہوئی ہوں۔ ہندوستان کی بہت سی ریلیں پہلے ہی گورنمنٹ کی ملکیت ہیں۔ باقی بھی جن کا انتظام کمپنیاں کرتی ہیں۔ گورنمنٹ کی زیر نگرانی ہیں۔ اور یہ نگرانی کوئی معمولی نگرانی نہیں ہے اس لیے "قومی" بنانے کا سوال اُٹھانا ہی بے محل ہے۔ ہاں یہ مطالبہ کیا جا سکتا ہے کہ جوں جوں ٹھیکہ جات کی میعاد ختم ہوتی ہے۔ اُن باقیماندہ ریلوں کا انتظام جو اب پرائیویٹ کمپنیاں کرتی ہیں۔ اُن ہی کمپنیوں کے پاس رہنے دیا جاوے یا گورنمنٹ براہ راست خود کرے جیسا کہ یہ نارتھ ویسٹرن اور اور دوسری ریلوں کا کر رہی ہے۔

یہ تجویز ہندوستانی مدبروں کی طرف سے کئی بار پیش کی جا چکی ہے کہ کل ریلوں کا انتظام گورنمنٹ خود اپنے ہاتھ میں لے لے۔ مسٹر گوکھلے نے ۱۹۰۵ء میں بجٹ کی بحث میں اس تجویز پر زور دیا تھا۔ اس کے بعد سر وٹھلداس ٹھیکرسی نے وائسرائے کی کونسل میں ۱۹۱۲ء میں اس سوال کو اٹھایا اور بعدہٗ ۱۹۱۵ء میں سر ابراہیم رحمت اللہ نے اس سوال کو پیش کیا۔ اور ۱۹۱۸ء میں مسٹر شرما نے جو اب گورنمنٹ ہند کے ممبر ہیں۔ اس کی بحث چھیڑی۔ پچھلے سال گورنمنٹ نے کمیشن اس سوال کو حل کرنے کے لئے مقرر کیا۔ کثرت رائے نے جن کے ساتھ پریزیڈنٹ کی بھی رائے شامل ہے۔ اس بات کے حق میں رائے دی ہے کہ گورنمنٹ کو ریلوں کا انتظام خود اپنے ہاتھ میں لینا چاہئے۔ اور کمپنیوں کو نہیں دینا چاہئے۔ یہ فیصلہ ایسا ہے جس پر سارے ہندوستانی اہل الرائے خوش ہونگے۔ دیکھئے گورنمنٹ کب ان سفارشات پر عمل کرتی ہے۔ ریل ایک ایسی صنعت ہے جو عوام کی زندگی و ملک تجارت پر خاص اثر ڈالتی ہے۔ اس لئے اس کو گورنمنٹ کو خود اپنے قبضہ میں رکھنا چاہئے۔ اور سارا انتظام بحیثیت ایک سرکاری محکمہ کے کرنا چاہئے۔ اس سے وہ روپیہ جو نفع یا سود کی شکل میں پرائیویٹ کمپنیوں کے قبضے میں جاتا ہے۔ خود گورنمنٹ کے پاس جائیگا جس سے ٹیکس کم کرنے یا زیادہ آسانیاں بہم پہنچانے میں سہولیت ہوگی۔

نہریں

ملک کی زرعی دولت بڑھانے میں نہریں بہت کارآمد ثابت ہوتی ہیں موجودہ نہریں انگریزی راج کی پیدائش ہیں۔ اگرچہ آبپاشی بذریعہ تالاب و کنوؤں کے ہندوستان میں مدت سے چلی آتی ہے۔ عہد مغلیہ اور اس

سے بھی پہلے فیروز تغلق کے عہد میں دو ایک بڑی نہریں بنائی گئیں جو کہ بہت مدت تک کام دیتی رہیں۔ سکھوں نے بھی ہنسلی نہر راوی کے پانی کو استعمال میں لانے کے لئے کھودی۔ لیکن سوائے پنجاب کے (اور یہاں بھی کسی قاعدہ کے بموجب نہروں کا جال ملک میں پھیلانے کی کوشش نہیں کی گئی)۔ مصنوعی آبپاشی ہندوستان جیسے ملک کے لئے نہایت ضروری ہے۔ بنگال۔ آسام اور برما کو چھوڑ کر جہاں اوسط مقدار مینہ کی ۹۰ انچ ہے۔ ہندوستان کے باقی حصّص میں فصلیں آبپاشی پر انحصار رکھتی ہیں۔ شمالی ہند میں اوسط مقدار مینہ کی بہت کم ہے۔ جس سے فصلیں نہیں پک سکتیں جنوب مغربی پنجاب اور سندھ تقریباً مینہ سے خالی جاتے ہیں۔ اور دکن میں مینہ بے قاعدہ اور دور دور وقت پر برستا ہے۔ اس لئے مصنوعی ذرائع سے زمین کو سیراب کرنا ہندوستان میں لوگوں کے لئے زندگی کا سوال ہے یورپ اور مغربی ممالک میں آبپاشی کا استعمال بطور ایک عیش پسندی اور شغل کے ہے (Luxurious) کیونکہ بارش کی کثرت سے فصلوں کے نہ پکنے کا وہاں احتمال نہیں رہتا۔ وہاں اس کا استعمال صرف بیشی پیداوار کے لئے کیا جاتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ہندوستان میں مدت مدید سے آبپاشی کے کئی ڈھنگ نکالے گئے ہیں۔ لیکن ان سب کو دو بڑے حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ (۱) پانی اوپر اٹھانے کے ڈھنگ اور (۲) پانی جمع کرنے کے وسیلے۔ جھلار اور کنوئیں پہلی قسم میں ہیں۔ اور تالاب اور جھیلیں دوسری قسم میں۔

کنوئیں لوگوں کی ملکیت ہیں۔ اور ان کی اپنی ہی نگرانی میں رہتے

ہیں ۔گورنمنٹ اُن میں کسی قسم کا دخل نہیں دیتی۔ البتہ امداد بوقت ضرورت بطور تقاوی قرضے کے دی جاتی ہے ۔ اور نیا کنواں کھودنے پر پندرہ سے بیس سال تک چاہی مالیہ میں رعایت کی جاتی ہے ۔

فرداً فرداً کنوؤں کی بساط تھوڑی ہے لیکن بحیثیت مجموعی وہ ہندوستانی آبپاشی میں ایک بڑا اہم درجہ رکھتے ہیں۔ سارے ملک کے کل سیراب شدہ رقبہ کا تیس فیصدی کنوؤں سے سیراب ہوتا ہے بطور ذریعہ آبپاشی کنوئیں نہروں پر فوقیت رکھتے ہیں۔ چونکہ محنت زیادہ خرچ آتی ہے ۔ اس لئے کسان بڑی حفاظت سے پانی کا استعمال کرتا ہے ۔ فصل بھی بقدر $\frac{1}{3}$ کے نہری فصل سے زیادہ ہوتی ہے ۔ قیمتی اجناس کے لئے نہایت ضروری ہے ۔ اور اس پر لاگت بھی کم آتی ہے ۔ صوبہ پنجاب و یو۔پی کنوؤں کے گھر ہیں۔ کنوؤں سے دوسرے درجہ پر ہندوستانی ذریعہ آبپاشی تالاب ہے ۔ چھوٹے سے چھوٹے دیہاتی چھپڑ یا جوہڑ سے لیکر بڑی بڑی مصنوعی جھیلیں ۔ فالف ۔ وائٹنگ (Fife Whiting lake) صوبہ بمبئی میں اور پیریار (Periyar) ٹراونکور میں جن میں ۶ سے 7 بلین مکعب فٹ پانی آ سکتا ہے ۔ سب اس قسم میں شامل ہیں۔ مدراس میں بعضے تالاب بہت ہی وسیع ہیں یعنی ۹ - ۹ میل کی وسعت کے ہیں۔ ریت واڑی علاقہ میں یعنی صوبہ بمبئی و مدراس میں تقریباً سب تالاب گورنمنٹ کے انتظام میں ہیں۔ لیکن زمینداری علاقہ میں زمیندار اور گاؤں والوں کی ملکیت ہیں ۔ سندھ اور پنجاب میں تالاب آبپاشی تقریباً ندارد ہیں۔ تالابوں سے پچھلے سال 80 لاکھ ایکڑ اراضی سیراب ہوئی۔ تالابوں میں یہ بڑا نقص ہے کہ خشک سالی میں بجائے ذریعہ حفاظت

ثابت ہونے کے خود خشک ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ بارش کی کمی سے وہ پانی سے بھرے نہیں جا سکتے لیکن جیسا کہ ہم پہلے کہہ آئے ہیں۔ نہریں ہندوستانی آبپاشی کی جان ہیں۔ اور مستقبل میں زراعتی ترقی کا انحصار اُن پر ہی ہے ۔۔

نہریں دو قسم کی ہیں۔ دائمی اور طغیانی۔ طغیانی نہریں موسم برسات میں دریاؤں کے پھیلاؤ کے سبب چند ماہ کے لئے آبپاشی کر سکتی ہیں زیادہ تر وادیٔ سندھ میں بنائی گئی ہیں۔ دائمی نہریں سارا سال پانی کی بہم رسانی کرتی ہیں۔ ان دائمی نہروں میں علاوہ اُن بڑی بڑی نہروں کے جو کہ قرضہ کے روپیہ سے بنائی گئی ہیں۔ اور جن سے گورنمنٹ سالانہ بہت روپیہ کماتی ہے۔ وہ چھوٹی چھوٹی نہریں بھی شامل ہیں جن کے بنانے کا منشا صرف علاقہ کو قحط سے بچانے کا ہے۔ ایسی نہریں مالی نقطۂ خیال سے مفید نہیں۔ کیونکہ ان کی آمدنی سے خرچ پورا نہیں ہو سکتا۔ لیکن حفاظتی نقطۂ خیال سے ان کا بنانا ازحد مفید ہے۔ بڑی بڑی نہریں یا تالاب وغیرہ بنانے میں گورنمنٹ کی پالیسی یہ ہے کہ ایسی نہریں کم از کم دس سال کے بعد اپنا چلاؤ خرچ اور سود نکالنے کے قابل ضرور ہو جاویں ۔۔

سنہ ۱۹۰۱ء میں گورنمنٹ ہند نے ایک نہری کمیشن آبپاشی اور اس کے متعلقہ آمدن پر رپورٹ کرنے کے لئے مقرر کیا۔ یہ رپورٹ سنہ ۱۹۰۳ء میں گورنمنٹ ہند کو پیش کی گئی۔ اور چند ایک باتوں کو چھوڑ کر باقی سفارشیں گورنمنٹ ہند نے منظور کر لیں ۔۔

نہری مالیہ زمین یا آبیانہ پنجاب اور شمالی ہند میں معاملہ مال سے علیحدہ لگایا جاتا ہے۔ اور اس کا انحصار پانی کی مقدار پر نہیں بلکہ فصل

اور رقبہ آبپاشی زمین اور پانی کی مانگ پر ہے۔ اوسط آبیانہ نہروں اور نالاپوں سے ساڑھے تین روپیہ فی ایکڑ ہے۔

3 مارچ 1915ء کو نہروں اور ان کی شاخوں کی کل لمبائی 62753 میل تھی جس سے کہ 50 ملین ایکڑ زمین سیراب ہو سکتی تھی۔ اور جن سے 15-1914ء میں 25½ ملین ایکڑ سیراب ہوئے۔

15-1914ء کے اخیر تک 35,777000 پونڈ ذرائع آبپاشی پر خرچ کئے گئے۔ جن پر خرچ اور سود کو نکال کر گورنمنٹ کو 5.25 فی صدی کل سرمایہ پر خالص بچت ہوئی۔ حفاظتی نہروں اور نالاپوں پر کل 5345,000 پونڈ خرچ کئے گئے۔ جن پر خالص نقصان 2.736 فیصدی کا ہوا۔

پنجاب کے ہمیشہ بہنے والے دریا اور وسیع میدان مصنوعی آبپاشی کے لئے شاندار آسانیاں مہیا کرتے ہیں۔ سوائے دریا سندھ کے جس میں سے ابھی تک صرف طغیانی نہریں بنائی جا سکی ہیں۔ پنجاب کے باقی سب دریا اس مطلب کے لئے استعمال کئے گئے ہیں۔ اور اس وقت سارے صوبہ پنجاب میں نہروں کا ایک وسیع اور عالیشان جال پھیلا ہوا ہے۔ اور اس پہلو میں ہمارا صوبہ روئے دنیا پر یکتا ہے۔

19-1918ء میں پنجاب کی نہروں سے 8.6 ملین ایکڑ زمین سیراب ہوئی۔ صوبہ میں نہروں اور ان کی شاخوں کی کل لمبائی 19654 میل ہے اور یہ اندازہ کیا گیا ہے کہ پنجاب کی نہریں کم از کم 55 کروڑ روپیہ کی سالانہ فصل پیدا کر سکتی ہیں۔ جو کہ کل سرمایہ کا جو ان پر خرچ کیا گیا ہے 2½ گنا ہے۔

مالی نقطہ خیال سے بھی پنجاب کی نہریں بہت کامیاب ہیں۔ اور اس
پہلو میں دنیا کی قیمتی سے قیمتی سونے کی کان بھی لوئر چناب نہر کا مقابلہ
نہیں کرسکتی۔ 12-1911 میں اس نہر سے 34.06 فیصدی کل سرمایہ
پر آمدنی ہوئی۔ صوبہ وار پیداوار کا اندازہ جو کہ سرکاری ذرائع آبپاشی
یعنی نہروں اور نالا لیوں سے ہوتا ہے۔ نیچے درج کیا جاتا ہے۔ ان
اعداد سے یہ تخمینہ لگایا جاسکتا ہے کہ ہندوستان کی فارغ البالی اور
دولتمندی میں نہروں کا کیسا ضروری اور شاندار حصہ ہے۔

نام صوبہ	سالانہ فصل کا اندازہ
برما	4.95 کروڑ روپیہ
بنگال	68 لاکھ
بہار و اوڑیسہ	7.86 کروڑ
اجمیر مارواڑ	7 لاکھ
پنجاب	51.82 کروڑ
صوبہ سرحدی شمال مغربی	2.16 کروڑ
سندھ	8.46 "
بمبئی دکن	3.67 "
صوبجات متوسط	1.66 "
مدراس	31.66 "
بلوچستان	5 لاکھ
کل	ایک ارب 88 کروڑ 8 لاکھ

اس بیان کو ختم کرنے سے پہلے یہ بتانا غیر ضروری نہ ہوگا کہ جہاں

نہروں نے ملک کی مالی حالت سدھارنے میں بہت حصہ لیا ہے۔ اور قحط کے خطرات کو ان علاقوں سے جہاں یہ بنائی گئی ہیں دور کر دیا ہے وہاں ان کے چند ایک نقصان دِہ پہلو بھی ہیں۔ مثلاً زمین نہر کی آبپاشی سے دن بدن ریتلی ہوتی جاتی ہے۔ اور یہ تکلیف خاصکر لوئر چناب نہر پر زیادہ ہے۔ اس سے زمین کمزور ہوکر آہستہ آہستہ قابل کاشت نہ رہیگی اس دِقّت کو دور کرنے کے لئے نہروں کے منہ پر جالی وغیرہ کے بند لگائے جاسکتے ہیں۔ لیکن پھر بھی پورا پورا بندوبست ہونا مشکل ہے۔

دوسری تکلیف یہ ہے کہ نہروں سے زمین کے نیچے والا پانی اوپر سطح پر آتا جاتا ہے۔ اور کئی علاقوں میں مثلاً حافظ آباد میں یہ پانی اتنی مقدار میں بڑھ گیا ہے کہ کئی مربعے زمین دلدل بن گئی ہے سارے نہری علاقوں سے رپورٹ یہی ہے کہ کنوؤں میں پانی چڑھ رہا ہے۔ اس دِقّت کو جتنا جلدی رفع کیا جاوے بہتر ہے۔ ورنہ بڑے بڑے زرخیز علاقہ اس خطرہ میں مبتلا ہو جاوینگے۔ گورنمنٹ نے اعلےٰ اعلےٰ انجنیئر اس کا حل سوچنے پر لگائے ہوئے ہیں۔ لیکن تا دم تحریر کوئی پختہ علاج دریافت نہیں کیا جاسکا۔ نہروں کے فرش اور کناروں پر سیمنٹ (Cement) کر دینے سے شاید نہر کے اردگرد علاقہ کو کچھ فائدہ پہنچ سکے۔ لیکن شاید خرچ بہت ہی زیادہ ہو۔

امرتسر کے نہری علاقہ میں یہ عام شکایت ہے کہ وہاں کے ڈھلوان علاقہ میں بارش کے پانی کے ٹھہرنے سے جو ملیریا بخار پھیلتا ہے۔ اس کے پھیلنے میں نہر کے بننے سے زیادتی ہوئی ہے۔

ریلوں اور نہروں کے بعد ہندوستان کے جنگلات کا ذکر کرنا خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ ہندوستان کی موجودہ دولت اور اُسکی آیندہ صنعتی اور زراعتی ترقی کا دارومدار کچھ حد تک اس کے جنگلات پر ہے ملک کا تقریباً $\frac{1}{5}$ حصہ جنگل ہے جس سے کہ ان کی اہمیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ کاغذ۔ دیاسلائی۔ تارپین۔ کوئلہ صندل کا تیل لاکھ۔ ربڑ۔ چمڑہ کمانے کے لیئے کارآمد چھلکے۔ اور اور مختلف اقسام کی مفید لکڑی یہ ساری چیزیں وصنعتیں بالواسطہ جنگلات سے تعلق رکھتی ہیں۔ دیاسلائی کے لیئے لکڑی کاٹنے اور چھیلنے کے لیئے کارخانجات پہاڑوں پر جنگلات کے نزدیک بنانے چاہیئں۔ جیسا کہ جاپان میں دستور ہے۔ اور پھر وہ لکڑی میدانی کارخانوں میں دیاسلائی بنانے کے لیئے جا سکتی ہے۔ اس سے کرایہ میں بچت رہیگی۔ کاغذ کی صنعت کے لیئے ہر قسم کے گھاس اور کئی قسم کی لکڑی دستیاب ہو سکتی ہے لیکن اگر بانس اس کام میں لائے جاویں تو بہت ترقی کی امید ہو سکتی ہے۔ کیونکہ اُن کا ذخیرہ ہندوستان کے جنگلات میں بہت ہے۔

بلا واسطہ طور پر بھی جنگلات ہندوستان کی (اکانومی) اقتصادیات میں بہت ضروری ہیں۔ کیونکہ ملک کی آب وہوا پر ان کا مفید اثر پڑتا ہے۔ برسات کے پانی کو وہ جذب کر لیتے ہیں۔ اور اس طرح بے فائدہ سمندر کی طرف بہ جانے سے روکتے ہیں۔ اور پھر آہستہ آہستہ اُس پانی کو چھوڑ کر اردگرد کی اراضیات کو تری پہنچاتے رہتے ہیں۔

یہ بات بھی اب تحقیق ہو چکی ہے۔ کہ ملک کی بارش اور جنگلات کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔ اور جنگلات کی کثرت سے بارش میں زیادتی ہوتی

ہے۔ اوران کی کمی سے کمی۔ یہ بات ہندوستان کے لئے خاص طور پر قابل غور ہے۔ جنگلات ایک نقرہ میں ہندوستانی آبپاشی کا منبع ہیں۔ جنگلات میں پتے کھاد کا کام دیتے ہیں۔ اور نزدیک کی آبادی کے لئے مکان بنانے اور ایندھن کے لئے سامان مہیا کرتے ہیں ہندوستانی زراعت کے لئے جنگلات چارے اور ایندھن کا ذخیرہ ہیں۔ جو کہ قحط سالی کے ایام میں نہایت مفید ہو سکتے ہیں۔ ہندوستان کی کثیر آبادی کو گھی دودھ مہیا کرنے اور افزائش مویشیاں کے لئے یہ بہت ضروری ہے کہ آئندہ جنگلات کے اس پہلو پر زیادہ توجہ دی جاوے اور بڑی وسیع چراگاہیں عام لوگوں کے استعمال کے لئے چھوڑی جاویں اور چارہ اور گھاس کی باقاعدہ پیداوار پر دھیان دیا جاوے۔ آج کل محکمہ جنگلات زیادہ تر توجہ لکڑی اور دوسری اشیا پر دیتا ہے۔ لیکن اچھے اور اعلٰے قسم کے گھاس و چارے پیدا کرنے بھی اس محکمہ کی ڈیوٹی ہونی چاہیئے۔ جنگلات کا باقاعدہ انتظام اور حفاظت 1860ء میں شروع ہوئی۔ اور 1864ء میں گورنمنٹ ہند نے پہلا انسپکٹر جنرل مقرر کیا۔ لیکن تجربہ کار اور تربیت یافتہ افسران کی کمی سے کام اچھا نہ ہو سکا۔ اصلی کمی کو پورا کرنے کے لئے 1878ء میں ڈیرہ دون میں فارسٹ کالج کھولا گیا۔ برما اور مدراس میں فارسٹ کالج 1898ء و 1912ء میں بالترتیب کھولے گئے۔ سنہ 1865ء میں پہلا قانون جنگلات پاس کیا گیا۔ لیکن موجودہ انتظام 1878ء کے قانون کے مطابق ہے۔ جو مدراس، برما، آسام کے علاوہ جن کے لئے علیحدہ قانون ہیں۔ سارے ملک پر حاوی ہے۔ قانوناً جنگلات تین قسموں میں منقسم ہیں:-

(۱) ریزرو جنگلات - جس میں سب بڑے بڑے اور اعلےٰ قسم کے جنگلات آجاتے ہیں - اور جن کا انتظام نہایت مکمل ہے - ایسے جنگلات میں لوگوں کا دخل و آمد رفت بہت کم ہونے دی جاتی ہے -

(۲) protected یا محفوظ جنگلات - جن کا انتظام قدرے نرمی سے کیا جاتا ہے - اور جن کو اردگرد کی آبادی چارہ - لکڑی - گھاس پھوس وغیرہ کے لئے استعمال کرسکتی ہے -

(۳) unclassed areas یا غیر منقسم شدہ جنگلات جو محکمہ جنگلات کے باقاعدہ انتظام میں ابھی تک نہیں آئے -

پہلے دو قسم کے جنگلات کے انتظام میں جو فرق ہے اس کو اسطرح بیان کیا جا سکتا ہے کہ اول الذکر جنگلات میں ہر ایک ایسی بات کرنی جرم ہے جس کی اجازت نہ دی گئی ہو - اور محفوظ جنگلوں میں کوئی ایسی بات کرنی جرم نہیں جس کی ممانعت نہ کی گئی ہو -

30 جون 1919ء کو کل رقبہ جنگلات برٹش ہند میں 251,468 مربع میل تھا جو کہ سارے ملک کے $\frac{1}{5}$ حصہ سے کچھ زیادہ ہے -

مالی طور پر 1915 سے 1919 تک کی سالانہ اوسط آمدنی جنگلات سے تین کروڑ 71 لاکھ 30 ہزار روپیہ ہوئی - خرچ تقریباً 57 فیصدی کل آمدنی کا ہوا - اور اس طرح خالص بچت ایک کروڑ 60 لاکھ دس ہزار روپیہ کی ہوئی -

صنعتی کمیشن 18-1916 نے رپورٹ کی ہے کہ جنگلات سے آمدنی اب تک کم ہوتی رہی ہے - اور آئندہ کے لئے کمیشن نے سفارش کی ہے - کہ سلسلہ آمد و رفت کو بہتر بنانا چاہیئے - اور ریسرچ و تجربات تجارتی لائن

پر ہونے چاہئیں۔ اور اسی طرح تجارتی نقطہ نظر سے جنگلات کا انتظام اور استعمال ہونا چاہئے۔

ہندوستانی دولت و پیداوار کی مقدار کمی بیشی کے اسباب وغیرہ پر ہم نے پچھلے صفحوں میں مکمل بحث کی ہے۔ اس بحث سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ اگرچہ ہندوستان کے ذرائع اور قدرتی وسائل نہایت عمدہ ہیں موجودہ پیداوار بہت کم ہے۔ جب ہم ملک کی وسعت۔ اس کی تواریخ اور آبادی سے اس کا مقابلہ کرتے ہیں۔ ممالک غیر کے مقابلہ میں تو ہندوستان بہت ہی پیچھے ہے، لیکن اس موجودہ صنعتی ترقی میں جو کہ ہم نے دیکھا ہے بہت کم ہے۔ ہندوستان کے باشندوں کا حصہ اور بھی کم ہے موجودہ صنعتی انقلاب جو ملک پر پچھلی صدی سے آ رہا ہے۔ زیادہ تر یورپین لوگوں کی ہمت کا نتیجہ ہے۔ اور اب تک جس مد میں بھی ترقی ہوتی ہے۔ ساری ان کی ہمت۔ ان کے سرمایہ اور ان کے ہی دماغ کا نتیجہ ہے۔ جس میں سرزمین ہند کے بچوں کا حصہ بہت کم ہے۔ در اصل اہل ہند کی پوزیشن موجودہ صنعتی ترقی میں وہی ہے۔ جو بوجھ اٹھانے والے قلی اور پانی کھینچنے والے مجبور کی ہوتی ہے۔ مزدوری بلاشک زیادہ تر ہمارے آدمیوں کے پاس آتی ہے۔ اور چند ایک پڑھے لکھے بابوؤں کو کلرکی وغیرہ کی نوکریاں بھی دستیاب ہو جاتی ہیں۔ لیکن منافع وغیرہ سارے کا سارا غیر ملکی لوگوں کے پاس ہی جاتا ہے۔ اس لئے جب ہم ہندوستان کی موجودہ صنعتی ترقی پر لمبے چوڑے بیان سنتے ہیں۔ تو ہمیں اس وقت یہ نہیں بھول جانا چاہئے۔ کہ ہندوستانیوں کا حصہ

صرف اس میں زبانی جمع خرچ تک ہی محدود ہے۔ مثلاً ذیل میں لکھی ہوئی صنعتیں و کارخانہ جات بالکل یا زیادہ تر صرف یورپین و غیر ملکی لوگوں کے ہاتھ میں ہیں۔ وہی ان کے چلانے والے۔ کرتا دھرتا و منافع کے مالک ہیں۔

(۱) ریلیں (ماسوائے ان کے جو گورنمنٹ یا دیسی ریاستوں کی ملکیت ہیں۔

(۲) ٹریموے کمپنیاں۔

(۳) جیوٹ کے کارخانے۔

(۴) سونے کی کانیں۔

(۵) اونی کپڑے کے کارخانے (دھاریوال۔ کانپور)

(۶) کاغذ کے کارخانے۔

(۷) شراب بنانے کے کارخانے۔

(۸) کوئلے کی کانیں۔

(۹) معدنی تیل۔

(۱۰) چائے قہوہ کے کھیت۔

(۱۱) چاول صاف کرنے اور لکڑی کاٹنے کے کارخانے۔

(۱۲) کھانڈ۔ چمڑہ۔ دیا سلائی۔ لوہا و فولاد کی صنعتیں۔

(۱۳) نیل کے کھیت۔

ان میں سے چند ایک صنعتوں میں ہندوستانی بھی حصہ دار ہیں۔ لیکن زیادہ تر یورپین لوگوں کی ملکیت ہیں۔

روئی و کپڑے کی صنعت۔ صابن سازی۔ برف کے کارخانے۔ آٹا

پینے کی چکیاں و چھاپے خانے وغیرہ زیادہ تر ہندوستانیوں کے ہاتھ میں ہیں۔

بمبئی میں روئی کے (کپڑے کے) ۷۲ کارخانے ہیں جن میں سے صرف ۱۲ یورپین لوگوں کے ہاتھ میں ہیں۔ صرف یہ ایک صنعت ہے جس میں ہندوستانیوں کا ہی حصہ ہے۔ اور وہاں بھی زیادہ تر پارسی لوگ ہی مالک ہیں۔ ماسوائے اس صنعت کے دوسری کوئی بھی ضروری صنعت و حرفت نہیں جس کو ہم اصلی معنوں میں ہندوستانی صنعت کہہ سکیں۔

بنگال و برما سارے ملک میں معدنی و زمینی دولت میں بڑھے ہوئے ہیں۔ لیکن یہ کتنے افسوس کی بات ہے کہ دونوں صوبوں میں کانیں یا یوں سمجھو۔ زمین دوز خزانے اہل ملک کے ہاتھوں سے نکل کر غیر ملکی لوگوں کے قبضے میں چلے گئے ہیں۔ بنگال کے کوئلے کی کانیں کوڑیوں کے معمولی سے عوضانہ کے بدلے یورپین لوگوں کو اہل بنگال نے خود دیدیں۔ برما میں تو خیر اہل برما شاید ہوش ہی اس وقت سنبھالینگے۔ جب ان کے لیئے کچھ رہ ہی نہیں جائیگا۔ مغربی روشنی اور تعلیم کے چمکارے سے چندھیا کر بنگال کے اہل دماغ و اہل علم نے پچھلی صدی سے قانون علم ادب و شاعری میں ہی کمال دکھانا اپنی قومی زندگی کا جزو بنالیا۔ اور اپنے قیمتی ذرائع صنعت میں ہاتھ سے کھو بیٹھے۔ اس بات کو مدنظر رکھتے ہوئے ایک شخص نے کہا ہے کہ پڑھے لکھے بنگالیوں کی صنعت "قانون کی صنعت" ہے۔

مدراس کی کانوں اور زمینی دولت کے غیر ملکی لوگوں کو ٹھیکہ دیئے

جانے کے برخلاف کئی محب الوطن ہندوستانیوں نے آواز اٹھائی ہے
ڈاکٹر پی۔ سی رائے جی جو لائق فائق کیمسٹری دان ہونے کے علاوہ
ایک کامیاب کاروباری آدمی بھی ہیں۔ اس کو اقتصادی لوٹ کھسوٹ
کے نام سے منسوب کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ گورنمنٹ کو ایسی کارروائی
جبراً بند کر دینی چاہیئے۔ لیکن ہم ان ٹھیکہ جات کے دیئے جانے کے
خواہ کتنے ہی برخلاف کیوں نہ ہوں۔ لیکن یہ کہنے سے باز نہیں رہ
سکتے کہ الزام زیادہ تر ہم پر ہے۔ اگر ہم اپنے قدرتی ذرائع اور دفینہ
خزانوں سے فائدہ نہیں اٹھاتے تو آج کل بیسویں صدی میں یہ ناممکن
نہیں تو محال ضرور ہے کہ غیر ملکی لوگ ان کو بیفائدہ دبے رہنے دینگے
وہ شخص جو اپنی کمزوری کے سبب سے اپنی کمائی و دولت کی حفاظت
نہیں کر سکتا۔ وہ غیروں کے حملے اور لوٹ سے زیادہ عرصہ تک نہیں
بچ سکتا۔ گورنمنٹ کا اس بات کو جبری طور پر بند کر دینا شاید پرائیویٹ
حقوق میں مداخلت بھی سمجھا جاوے۔ بہرحال ایسی تجویز موجودہ حالت
میں قابل امکان نہیں سمجھی جا سکتی۔ اور ایک ہی چارہ جو ملک کے سامنے
ہے۔ وہ یہ ہے کہ ملک کے امیر آدمی اور نوجوان اپنی توجہ کو
قانون کے پڑھنے اور زبانی پالیٹکس سے ہٹا کر ٹھوس کام یعنے صنعت
حرفت کی طرف لگا دیں۔ پچھلی باتوں پر افسوس کرنے یا غیر ملکی لوگوں پر
الزام لگانے کی بجائے ملک کی آرتھک دشا کو سدھارنے میں لگ
جانا چاہیئے۔ کیونکہ ابھی ہاتھ سے بہت کچھ نہیں گیا ہے۔

آبادی کا مسئلہ

ملک کی بڑھتی ہوئی آبادی کو دیکھکر اور دوسری طرف اس بات

کو دھیان میں رکھتے ہوئے کہ ملک کی پیداوار صنعتی۔ حرفتی و زرعی کچھ زیادہ نہیں ہے۔ کئی ایک آدمیوں کا یہ وچار ہے کہ ہندوستان کی زمین یا قدرتی ذرائع اس بڑھی ہوئی آبادی کی پرورش نہیں کرسکتے اور گزارہ کے لیئے ناکافی ہیں۔ ہندوستانی غربت کا بڑا سبب ان اشخاص کی رائے میں یہی ہے۔ پہلا شخص جس نے آبادی اور ملک کی غربت کے تعلق پر زور دیا وہ پروفیسر مالتھس ہوا ہے۔ ان کی رائے میں انسانی آبادی کا رجحان ہمیشہ بڑھاؤ کی طرف ہوتا ہے۔ لیکن ضروریات زندگی اسی نسبت سے نہیں بڑھ سکتیں۔ اس لئے ہر ایک کو کھانے پہننے کے لیئے کافی نہیں مل سکتا۔ اور اس طرح سوسائٹی میں قحط۔ بیماریاں۔ وبا ہمیشہ پھیلتے رہتے ہیں۔ جس سے قدرت خود آبادی کے بڑھاؤ کو روکتی رہتی ہے۔ اس کو وہ "سختی کی روک" کا نام دیتے ہیں۔ لیکن آبادی کے بڑھاؤ کی برائی کو روکنے کے لیئے انسان خود بھی بعض تدابیر پر عمل کرسکتا ہے یعنی شادی نہ کرنا۔ بڑی عمر میں کرنا جس سے کہ اولاد کم پیدا ہوتی ہے اور جان بوجھ کر اولاد کم پیدا کرنا۔ اس کی روک کو وہ Preventive Check حفظ ماتقدم روک کہتے ہیں۔ ایسا کرنے سے سوسائٹی بیماریوں وغیرہ سے بچ سکتی ہے۔ اس بات کو دیکھنے کے لیئے کہ آیا کسی ملک میں آبادی وہاں کی خوراک کے ذرائع سے بڑھی ہوئی ہے یا نہیں۔ اس ملک کے اعداد پیدائش و اموات کو دیکھنا چاہیئے۔ اگر اعداد اموات زیادہ ہونگے تو صاف ظاہر ہوگا کہ غربت زیادہ ہے جو کہ اس بات کا ثبوت ہے کہ آبادی کے بڑھ جانے سے ہر ایک فرد کے لیئے خرچ خوراک دستیاب نہیں ہوسکتا۔ اور قدرت آبادی کو کم کرنے کے

لیے قدرتی ذرائع کا استعمال کر رہی ہے۔ اور بدبختی کی روک" پر عمل ہو رہا ہے۔ دراصل یہ کوئی نیا قانون نہیں ہے۔ جو صرف جماعت انسانی پر حاوی ہو۔ ہم دیکھتے ہیں۔ کہ ہر ایک جاندار جانور میں یہ رجحان پایا جاتا ہے کہ اُس کی اولاد بڑھے اور تعداد میں حیرت انگیز اضافہ ہو۔ اور یہ صرف بیرونی اور قدرتی اسباب ہیں۔ جس سے کہ اس اضافہ میں روک تھام ہوتی ہے۔ مثلاً اگر ایک کاڈ مچھلی کے بھی انڈوں اور بچوں کو محفوظ رہنے دیا جاوے تو اس کی تین چار نسلوں میں یعنی تین چار سال میں سارا سمندر کاڈ مچھلی سے بھر کر ایک ٹھوس چیز بن جاوے۔ یہی حال مکھیوں کا ہے ہاتھی جو سب سے کم بچے پیدا کرتا ہے۔ اس کے بچوں کو بھی مرنے نہ دیا جائے تو چند ہزار سال میں سارے روئے زمین پر ہاتھی ہی ہاتھی ہو جاویں لیکن قدرت بیشمار طریقوں سے ان جانوروں کی اولاد اور انڈوں کو کم کرتی رہتی ہے۔ جس سے ان کی خوراک اور اس کی تعداد میں مناسب تناسب قائم رہتا ہے۔ انسانی جماعت میں یہ تناسب اگر لوگ جان بوجھ کر خاص اصولوں پر عمل کر کے قائم نہ رکھینگے تو یہاں بھی قدرت اپنے طریقوں سے یہ تناسب قائم کر دیگی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وبا۔ بیماریاں جنگ اور مصیبتیں اُس جماعت پر ہمیشہ نازل ہوتی رہینگی۔

یہ مختصر الفاظ میں آبادی کا اصول ہے۔ اور علم اقتصادیات کے بہت سے ماہروں کی رائے میں ہندوستان میں اس وقت وہ حالت جاری ہے جس میں قدرت اپنے طور پر بڑھتی ہوئی آبادی کو خوراک کے مطابق قائم کر رہی ہے۔ ایک ملک کی آبادی دو ہی طریقوں سے بڑھ سکتی ہے۔

(۱) ملک سے باہر جانے والوں کی نسبت ملک کے اندر آنے والے اشخاص کی کثرت ہو۔ (۲) قدرتی طریقہ یعنی شرح پیدائش کی شرح اموات سے زیادتی پہلی بات ہندوستان پر حاوی نہیں ہوتی اس لئے یہاں کی آبادی صرف قدرتی بڑھاؤ سے ہی بڑھ سکتی ہے۔ اور قدرتی بڑھاؤ میں ہمیں یہ بات یاد رکھنی چاہیئے۔ کہ شادی کرنے کا ہندوستان میں بہت عام رواج ہے۔ اور اولاد کا ہونا مذہبی اور سوشل یعنی مجلس فرائض کی ادائیگی کے لئے نہایت ضروری گنا جاتا ہے ان دو باتوں کی یاد دہانی کے بعد ہم ہندوستان اور دوسرے ملکوں کی آبادی کے اعداد دیتے ہیں۔

ملک	شرح پیدائش فی ہزار	شرح اموات فی ہزار
ہندوستان	38.58	34.2
جاپان	32.58	20.86
انگلینڈ و ویلز	26.8	15.15

ہندوستان میں شرح پیدائش و شرح اموات سارے ایشیائی ملکوں سے زیادہ ہے۔ ان اعداد سے ظاہر ہوتا ہے کہ اگرچہ ہماری شرح پیدائش بہت زیادہ ہے۔ لیکن پھر بھی آبادی کا بڑھاؤ نسبتاً دوسرے ملکوں سے کم ہے۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ آبادی کے زیادہ بڑھاؤ کا امکان ملک میں نہیں ہے۔ کیونکہ پہلے ہی آبادی ملک کی خوراک سے بڑھی ہوئی ہے۔ اور قدرت اپنے سختی کے روک کو عمل میں لا رہی ہے۔ کئی ایک ماہر اس بات کو ماننے کے لئے تیار نہیں ہیں کہ ہندوستان کی آبادی ضرورت سے زیادہ ہے۔ اور آیندہ بڑھاؤ کا امکان نہیں ہے۔

دلائل جو اُن کی طرف سے دیجاتی ہیں وہ اس طرح بیان کی جاسکتی ہیں:-

(۱) ہندوستان کی تقریباً دو تہائی آبادی ملک کے $\frac{1}{4}$ رقبہ پر آباد ہے اور $\frac{1}{3}$ باقی $\frac{3}{4}$ رقبہ پر ابھی آبادی کی بہت گنجائش ہے۔

(۲) برما اور آسام میں آبادی بہت کم ہے۔ اور وہاں بھی آبادی ابھی بڑھ سکتی ہے۔

(۳) آبپاشی اور زراعتی ترقی سے غلہ کی پیداوار بڑھائی جاسکتی ہے جس سے بڑھتی ہوئی آبادی کا بڑی آسانی سے گذران ہو سکتا ہے۔

(۴) ملک کی ساری صنعتوں سے "مزدوروں کی کمی" کی شکایت آتی رہتی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آبادی زیادہ نہیں ہے۔ اور محنتول گذارہ کی صورتیں بند نہیں ہوگئیں۔

ان دلائل پر غور کرنے سے واضح ہوتا ہے کہ بہت کچھ وزندار نہیں ہیں۔ مثلاً ملک کا سارا رقبہ قابل کاشت اور قابل آبادی نہیں ہے۔ کیونکہ اس سارے رقبہ میں جھیل جنگل۔ بیابان صحرا۔ دریا۔ پہاڑ اور بنجر علاقے بھی شامل ہیں۔ زراعت کے لئے موجودہ تعداد سے زیادہ کو سہارا دینا ناممکن ہے۔ کیونکہ فی مربع میل ہندوستانی کاشت شدہ علاقہ کی آبادی انگلستان کی فی مربع میل زراعتی آبادی سے آگے ہی تین چار گنا ہے۔ اس سے زیادہ آدمیوں کے ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ان کا معیار زندگی جو آگے ہی بہت نیچے ہے اور بھی کم ہو جاوے۔

مزدوروں کی کمی کی شکایت زیادہ تر چائے کے کھیتوں کے مالکوں

اوران کارخانہ داروں کی طرف سے آتی ہے۔ جو کہ اپنے مزدوروں کو بہت کم تنخواہ دیتے ہیں۔ اور جہاں حالات زندگی اتنے ناقص ہیں کہ کوئی بھی باغیرت مزدور وہاں کام کرنا پسند نہیں کرتا۔ ہمارے خیال میں یہ ساری بحث ایک غلط پہلو کو لیکر کی جاتی ہے۔ آبادی اور ملک میں دستیاب ہونے والی خوراک کا مقابلہ کرنا اور اس سے کوئی نتیجہ نکالنا ٹھیک نہیں ہے۔ کیونکہ آج کل آبادی کے سوال کی شکل اور ہے ہمیں آبادی اور ملک کی دولت کا مقابلہ کرنا چاہیئے۔ کیونکہ اگر دولت ہو تو خوراک وغیرہ باہر ملکوں سے خریدی جا سکتی ہے۔ اور آبادی کا گذران ہو سکتا ہے۔ اس وقت اگر انگلستان کے باشندوں کو انگلستان میں ہی پیدا شدہ غلہ و خوراک پر گذارہ کرنا پڑے تو انگلستان کی ⅔ آبادی مرجاوے لیکن صنعتی ترقی تجارت وحرفت سے انگلستان والے اپنی دولت میں اضافہ کر کے ساری دنیا کے ملکوں سے خوراک وغیرہ منگوا سکتے ہیں۔ اور اس طرح بڑھی ہوئی آبادی کی پرورش کر سکتے ہیں۔ درصل بین الاقوامی تجارت نے اس آبادی کے سوال کے سارے پہلو کو ہی بدل دیا ہے۔ 1630ء میں انگلستان کی آبادی 55 لاکھ تھی۔ اور چونکہ ملک کا گذارہ صرف زراعت پر ہی تھا۔ اور خوراک کا سامان باہر سے نہیں آتا تھا۔ اس لیئے اس وقت 55 لاکھ کا بھی گذارہ مشکل سے ہوتا تھا۔ لیکن اسی انگلستان میں جہاں اب آگے کی نسبت شاید غلہ بھی کم پیدا ہوتا ہے اس وقت چار کروڑ پچاس لاکھ کی آبادی ہے۔ اسی طرح اگر ہندوستان نے صرف زراعت پر ہی انحصار رکھنا ہے تو بلا شک موجودہ آبادی

بھی زیادہ ہے ۔ بڑھاؤ کا تو امکان ہی نہیں ہو سکتا ۔ لیکن اگر ملک صنعتی پہلو سے ترقی کر جاوے ۔ اور تجارت و حرفت بھی ترقی پذیر ہوں ۔ جس سے ملک کی قدرتی دولت سے فائدہ اٹھایا جاسکے ۔ تو آبادی کا سوال کم از کم کئی سالوں تک ملتوی ہو سکتا ہے ۔ اور ساری آبادی فارغ البالی سے گذارہ کر سکتی ہے ۔ اس لئے یہ کہنا کہ ہندوستان اپنی بڑھتی ہوئی آبادی کی پرورش نہیں کر سکتا ۔ ایک گونہ غلط ہے ۔ موجودہ آبادی تو درکنار اس سے بھی زیادہ کا گذارہ اچھی طرح سے ہو سکتا ہے ۔ اگر ہندوستان اپنی توجہ زراعت سے ہٹا کر صنعت حرفت کی طرف لگا وے جس سے ملک کی دولت میں اضافہ ہو ۔ اس صنعتی ترقی کی عدم موجودگی میں اور صرف موجودہ حالت کو دیکھکر یہ ماننا پڑیگا ۔ کہ ہندوستان کے دُکھ درد کی ایک دوا یہ بھی ہے کہ سرزمین ہند کی پیداوار پر جو بڑھتی ہوئی آبادی کا بوجھ پڑ رہا ہے وہ کسی قدر کم ہو یا زیادہ نہ بڑھنے پاوے ۔

ہندوستانی پیداوار کے انسانی پہلو کا مطالعہ کرتے ہوئے دوسری بات جو ہماری نظر میں جچتی ہے ۔ وہ ہندوستان کا ذات پات کا سسٹم ہے جس سے ایک ذات میں پیدا ہوئے اشخاص نہ صرف شادی غمی میں اپنی ہی ذات کی مدد وغیرہ لے سکتے ہیں ۔ اور دوسری ذات سے کسی قسم کا رشتہ قائم نہیں کر سکتے ۔ بلکہ جن کے لئے بالعموماً پیشہ زندگی بھی پیدائش سے ہی مقرر ہو جاتا ہے ۔ اور اس پشتینی پیشہ کو چھوڑ کر کسی دوسرے کام کو ہاتھ لگانا اپنی ذات و برادری سے کر جانے

کے برابر سمجھا جاتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں شروع میں یہ تقسیم پیدائشی نہیں تھی۔ بلکہ پیشہ وارتقسیم Division of Labour کے اصول پر کام بانٹنے کے اصول پر قائم تھی۔ لیکن صدہا سال کے رواج سے یہ تقسیم پیدائشی ہو گئی۔

اس ذات پات کا اقتصادی پہلو یہ ہے کہ اس سے کسی پیشہ یا کام کے لیئے مزدوروں کی تعداد یا بہم رسانی بالکل محدود ہو جاتی ہے اور مانگ گھٹاؤ بڑھاؤ کے مطابق کم یا زیادہ نہیں ہو سکتی جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اگر مانگ کم ہے تو سارے کے سارے مزدور بہت کم تنخواہ لینے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ اور اگر مانگ زیادہ ہے تو ان کی پوزیشن ایک اجارہ دار کی سی ہو جاتی ہے۔ جو حسب مرضی اپنی شرائط منوا سکتے ہیں۔

ملک کی مالی و اقتصادی حالت میں تبدیلی کے ساتھ ذات پات سے جکڑی ہوئی جماعت تبدیل نہیں ہو سکتی جس سے کہ نہ صرف اس جماعت کو ہی نقصان پہنچتا ہے۔ بلکہ ملک کو بھی " تبدیلی ہی زندگی کا اصول ہے "۔ اور اس اصول پر عملدرآمد نہیں ہو سکتا ہے۔ انسان کو اپنی لیاقت۔ قدرتی خصلت و اوصاف اور گنوں کے مطابق اپنا پیشہ چننے کا حق ہونا چاہیئے۔ لیکن ذات پات سے یہ حق چھینتا جاتا ہے۔

اس سسٹم کے حق میں یہ کہا جا سکتا ہے۔ کہ مقابلہ کے اصول کو روک کر یہ سوسائٹی کے کمزور سے کمزور انسان کے لیئے بھی گذارہ کرنے اور سوسائٹی میں رتبہ قائم کرنے کے لیئے موقع پیش کرتا

ہے جس سے کہ اُس کی آن بھی قائم رہ سکتی ہے۔ ذات پات کی عدم موجودگی ہیں یا اس کے ٹوٹ جانے سے سوسائٹی پھر بھی مختلف گروہوں میں تقسیم ہو جاویگی۔ لیکن وہ گروہ دولت پر مبنی ہونگے جو کہ اور بھی بُری بات ہوگی۔ ولایت ہیں ذات در ذات تقسیم نہیں ہے لیکن۔ امیر۔ غریب۔ ساہوکار و مزدور کی تقسیم ذات در ذات کے سسٹم سے بھی بڑھکر خرابیاں پیدا کر رہی ہے۔

سوال کے دونوں پہلوؤں پر غور کرکے بھی موجودہ حالت کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم یہ کہے بنا نہیں رہ سکتے۔ کہ سوسائٹی کی موجودہ بناوٹ ہیں اب سسٹم کا رہنا ناموزوں ہے۔ اور ہندوستان کی صنعتی ترقی کے راہ ہیں روڑا ہے۔ اور یہ رائے کسی مذہبی سوشل یا پولیٹیکل تعصب پر مبنی نہیں ہے۔ بلکہ صرف سوال کے اقتصادی پہلو کی پڑتال کرکے دی جاتی ہے۔

حصۂ دوم

تاریخ سکہ
اور
قیمتوں کا تقرر

قیمتوں کا تقرر

قیمتوں کا تقرر

علمِ اقتصادیات کی رُو سے دُنیا کی تمام چیزیں دو جماعتوں میں منقسم ہیں۔ایک کو Free goods قدرتی اشیاء کہتے ہیں۔اور دُوسروں کو Economic goods اقتصادی کہتے ہیں۔وہ سب چیزیں جو اس دُنیا میں ہماری مانگ کے مقابلے میں بہت ہوتی ہیں۔اور اپنی قدرتی حالت میں ہوتی ہیں۔ Free goods کہلاتی ہیں مثلاً ہوا ندیوں میں پانی اور جنگل کی لکڑی۔لیکن انہیں چیزوں میں جب کئی ایک دو گُن آجاتے ہیں۔تو ان کو Eco. goods کہنے لگ جاتے ہیں +

اُن سب چیزوں کو جن کا کچھ استعمال ہو۔جن پر کچھ محنت کی گئی ہو۔جو مانگ کے مقابلے میں تھوڑی ہوں۔اور جو قابلِ انتقال ہوں Eco. goods کہتے ہیں۔لکڑی جب جنگل میں ہوتی ہے۔تو اُس کی کچھ بھی قیمت نہیں ہوتی کیونکہ اس جنگل میں پڑی ہوئی لکڑی میں مندرجہ بالا خاصیّتوں میں سے کوئی بھی خاصیّت نہیں پائی جاتی۔لیکن جب اُس لکڑی پر کچھ محنت خرچ کیجاوے اور جنگل سے لائی جائے۔تو اُس کی مانگ ہونے سے اُس کی کچھ قیمت ہو جاتی ہے۔جب وہ لکڑی جنگل میں پڑی تھی۔تو وہ کسی کام میں نہیں لائی جاسکتی تھی اور نہ ہی اُس کی کوئی مانگ تھی۔اِن خاصیّتوں کے نہ ہونے کی وجہ سے اس کی کچھ بھی قیمت نہ تھی۔جونہی اُس پر کچھ محنت کر کے وُہ جنگل سے لائی گئی۔تو اُس میں مندرجہ بالا چاروں خاصیّتیں آگئیں۔اور وُہ ایک Free goods کی بجائے ایک Economic goods بن گئی۔علمِ اقتصادیات میں اُن سب چیزوں کو جو Eco. goods میں شمار کی جاتی ہیں۔دولت (...) کہتے ہیں

ایک ٹائپسٹ ([illegible]) کے ٹائپ کرنے کی قابلیت اُس کے نقطۂ خیال سے اس کے لیئے دولت ([illegible]) ہے۔ لیکن سماج اس کی قابلیت کو سماج کے نقطۂ خیال سے دولت ([illegible]) نہیں کہے گی۔ کیونکہ وہ جو قابلیت ہے وہ قابلِ انتقال نہیں۔ لیکن ایک بیوپاری کی [illegible] ایک [illegible] دولت ([illegible]) ہے۔ کیوں کہ یہ ایک دوسرے سے خریدی جا سکتی ہے۔ اسی طرح عموماً سب جگہ پر ہوا ہماری مانگ کے مُطابق زیادہ ہوتی ہے لیکن کانوں میں آدمی کے سانس لینے کے لیئے کافی ہوا نہ ملنے کی وجہ سے وہ ایک [illegible] ہو جاتی ہے۔ اِس سارے مضمون کا ... مطلب یہ ہے۔ کہ علمِ اقتصادیات میں صرف [illegible] ہی دولت ([illegible]) کہلاتے ہیں۔ باقی چیزیں جن کو [illegible] کہتے ہیں۔ دولت ([illegible]) نہیں کہلاتیں۔

اِس کے بعد اب ہم اِس بات کا وچار کریں گے۔ کہ کسی ایک چیز کی قیمت ( ) کسی طرح سے تقرر پاتی ہے۔ اِس مضمون پر مختلف لوگوں کی مختلف رائے ہیں۔ پہلی رائے کے لوگ اِس بات پر زور دیتے ہیں۔ کہ کسی ایک چیز کی قیمت کے ٹھہرانے میں مانگ سب سے زبردست جزو ([illegible]) ہے۔ جس چیز کی مانگ زیادہ ہوگی۔ اور وہ چیز اِس مانگ سے کم ہوگی۔ تو اس کی قیمت مقابلتاً اُس چیز کے جس کی مانگ بہ آسانی سے تھوڑی ہوگی۔ زیادہ ہوگی۔ جب ہم بازار میں ایک میز خریدنے جاتے ہیں۔ تو ہم اِس بات پر دھیان نہیں دیتے۔ کہ میز بنانے والے نے کتنی لکڑی اور کتنے دِن خرچ کیئے۔ ہم صرف یہ دیکھتے ہیں۔ کہ اِس میز کے لیئے کتنی مانگ ہے۔ اور اُس مانگ کے مُطابق ہم اِس میز کی قیمت دالیں گے ہم اِس بات کا بالکل خیال نہیں کریں گے۔ کہ فلاں قیمت پر بنانے والے کو فائدہ ہوگا یا نقصان۔ یا اس کا اصلی خرچ ملے گا۔ یا کچھ زیادہ یا کچھ کم۔ ایک مورتی بنانے

والے ایک پتھر کے ٹکڑے سے بیس۲۰ سال خرچ کر کے ایک مورتی بناتا ہے۔ جب وُہ
بازار میں اُسے بیچنے آتا ہے۔ تو اُس کی خرید کرنے والے پانچ روپے قیمت ڈالتے ہیں
وُہ لوگ اِس بات کی پروا نہیں کرتے۔ کہ اِس بنانے والے نے اپنی زندگی کا ایک
خاص حصّہ اِس مورتی کے بنانے پر خرچ کیا ہے۔ وہ تو کیول یہ دیکھتے ہیں۔ کہ اُس
مورتی کے کتنے خریدار ہیں۔ اور ان میں سے جس کو وُہ مورتی سب سے اچھی لگتی
ہے۔ وہ کتنے روپے دینے کو تیار ہے۔ اِس لئے جو سب سے زیادہ قیمت یعنی
یہاں پر پانچ روپے دیتا ہے۔ وُہ مورتی خرید لیتا ہے۔ اِس لئے اِس رائے کے
آدمی مانگ کو ہی کسی چیز کی قیمت ٹھیرانے میں سب سے اونچا درجہ دیتے ہیں۔ کسی
ایک دن گرمی کے زیادہ ہو جانے سے لوگ برف کو آٹھ آنے سیر خریدنے کو تیار
ہو جاتے ہیں۔ وُہ جانتے ہیں کہ ایک سیر برف کے بنانے میں بہت کم خرچ آتا ہے
لیکن چونکہ اس خاص دِن برف کی مانگ زیادہ ہے۔ اِس لئے لوگ اتنی قیمت دیکر
بھی اُسے خرید لیتے ہیں۔ وہ اس کی اصلی قیمت کی جو اُس کے بنانے میں خرچ آئی
ہے cost of production کچھ پرواہ نہیں کرتے ÷

دُوسرے لوگوں کا یہ مت ہے۔ کہ کسی ایک چیز کی قیمت ٹھیرانے میں صرف
اِس چیز کی لاگت یا خرچ بنوائی ہی سب سے زیادہ جزو ہے۔ اِس کے خیال
میں مانگ قیمت کے ٹھیرانے میں بالکل کام نہیں کرتی۔ وُہ کہتے ہیں کہ ایک آدمی
کا سارا خرچ ایک کُرسی کے بنانے پر پانچ روپے آتا ہے۔ جب وُہ اِس کُرسی کو بازار
میں بیچنے جاتا ہے۔ تو کم سے کم اُسے اُس کُرسی کے پانچ روپے ضرور ملیں گے۔ کیونکہ
اِس سے کم قیمت پر وُہ اُس کُرسی کو نہیں بیچے گا۔ لیکن اگر ایسا ہو کبھی۔ کہ اس کُرسی کی
مانگ نہ ہونے سے اِس کی قیمت صرف اِس بنانے والے کو چار روپے ہی ملے۔ تو وُہ
کُرسی بنانے والا آئندہ کُرسیں بنانا چھوڑ دے گا۔ جب اُس کو اپنا اصل خرچ بھی

نہیں ملتا۔ تو وُہ کرسیاں کیوں کر بنائے گا۔ اُس کا نتیجہ یہ ہوگا۔ کہ کرسیوں کی بہم رسانی [illegible] کم ہو جائے گی۔ اور ان کی مانگ اتنی ہی رہنے سے قیمت بڑھ جائیگی قیمت کے بڑھ جانے کا آخیری نتیجہ یہ ہوگا۔ کہ وُہ کرسی بنانے والا جو اس کام کو چھوڑ گیا تھا۔ کیونکہ اسے اپنی اصل قیمت بھی نہ ملتی تھی۔ پھر وہی کام کرنے لگ جائے گا۔ بس اس بات سے صاف ظاہر ہے۔ کہ ایک چیز کی قیمت ٹھہرانے میں اُسکی لاگت یا ..... [illegible] سب سے بھاری جُزو ہے۔ یہ مت ولایت کے بڑے علم اقتصادیات کے ماہر دیکارڈو اور اُس کے پیروؤں کا ہے۔ لیکن تھوڑا سا سوچنے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ دونوں مت کچھ حد تک ٹھیک ہیں۔ اور دونوں ہی غلط ہیں۔ دونوں کی غلطی کی وجہ یہ ہے۔ کہ اُنہوں نے وقت کا بالکل خیال نہیں کیا۔ ایک نے مانگ پر زور دیا ہے۔ دُوسرے نے لاگت ..... پر۔ وقت کو دونوں ہی بھول گئے ہیں۔ ولایت کے بڑے علم اقتصادیات کے ماہر پروفیسر مارشل ..... نے اُس بھول کو جانا ہے۔ اور وقت کا خیال کر کے مندرجہ بالا دونو متوں کی غلطی کو دُور کر کے اُن کے ہی آدھار پر اپنا نیا سدّھانت دیا ہے۔ وُہ کہتے ہیں۔ کہ ایک چیز کی قیمت کے فیصلہ کرنے میں نہ صرف مانگ اور نہ صرف لاگت ... ہی ..... کافی ہے۔ بلکہ وقت کا دھیان رکھنا بہت لازمی ہے۔ وُہ وقت کے لحاظ سے اِس سوال کو دو حصّوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ وُہ کہتے ہیں تھوڑے وقت [illegible] کے لئے کسی چیز کی قیمت ٹھہرانے میں مانگ [illegible] زیادہ اثر رکھتی ہے۔ کسی ایک خاص دن برف کی مانگ کم ہونے سے وہ پیسے کو دو سیر بکتی ہے۔ حالانکہ اس برف کی ایک سیر کی لاگت .... دو پیسے ہے۔ اگر ہمیشہ کے لئے برف پیسے کی دو سیر بکے گی۔ تو برف بنانے والے برف بنانا چھوڑ دیں گے۔ وُہ تب ہی بنائیں گے جب اُن کو کچھ فائدہ ہو۔ تھوڑے وقت کے لئے

تو نقصان اُٹھانے کو تیار ہیں۔ مگر ہمیشہ کے لئے یہ بات کبھی نہیں کریں گے۔ وہ برف
تب ہی بنائیں گے۔ جب بازار میں اُن کی برف کی قیمت اُن کی لاگت ....
سے کچھ زیادہ پڑے۔ بس اِس سے صاف ظاہر ہے۔ کہ لمبے عرصہ کے لئے لاگت۔
Cost of Production اور تھوڑے وقت کے لئے کسی چیز کی قیمت کا فیصلہ کرنیکے لئے
مانگ (Demand) بڑے بھاری جزو ہیں۔ پروفیسر مارشل کہتے ہیں۔ کہ
جیسے ایک کاغذ کے کاٹنے کے لئے قینچی کے دونوں پھل کام کرتے ہیں۔ خواہ نچلے
پھلے کو بغیر حرکت کے رکھا جائے۔ ویسے ہی کسی ایک چیز کی قیمت کے ٹھیرانے
کے لئے ایک قینچی کے دونوں پھلوں کی طرح لاگت اور مانگ Demand
دونوں کام کرتے ہیں۔ خواہ ایک خاص وقت پر ایک خاص جزو زیادہ اثر ڈالتا ہے
اور دوسرا کم ٭

اِن تھوڑے سے لفظوں میں قیمتوں کے تقرر کا حال لکھا گیا ہے۔ اور اِس
ساری بحث سے یہ بات ظاہر ہوگی۔ کہ بحث میں مقابلے کے اصول کا سہارا لیا
گیا ہے۔ اور اِس لئے بعض شخص یہ رائے رکھتے ہیں۔ کہ ہندوستان میں جہاں
چیزوں کی قیمت کے مقرر ہونے میں رواج (Custom) کا زبردست اثر ہے۔ یہ Theory
حاوی نہیں ہوتی۔ اِس میں کچھ سچائی ہے۔ لیکن پچھلے اتنے سالوں میں رواج کا
اثر ملک کے بہت سے حصوں سے بہت کم ہو گیا ہے۔ اور مقابلے کے اصول کے
مطابق ایک ہی چیز کی ایک ہی قیمت سارے ملک میں ایک ہی وقت پر دیکھی جاتی ہے۔

ہندوستانی سِکّہ اور اُس کی تواریخ

ہندوستانی سکّے کی تاریخ بہت ہی دلچسپ ہے اور ساتھ ہی مُشکل بھی۔ کیوں کہ پچھلی نصف صدی سے اس میں اس قسم کی تبدیلیاں وقتاً فوقتاً کی جاتی رہی ہیں کہ موجودہ حالت کو سمجھنا ایک ماہر کا ہی کام ہو سکتا ہے۔ سچ بات تو یہ ہے۔ کہ گورنمنٹ ہند یا یوں کہو وزیر ہند نے ہندوستان کی کرنسی معاملات میں خواہ مخواہ دخل دینے اور نت نئے تجربے کرنے میں پچھلے سالوں میں اتنی چالاکی اور سرگرمی دکھائی ہے۔ کہ اب یہ ہندوستان میں مُسلّمہ بات گنی جاتی ہے۔ کہ یہ سب کچھ انگریز سوداگروں اور تاجروں کی خاطر ہی کیا جاتا رہا ہے۔ جس سے اہلِ ہند کو لاکھوں روپوں گھاٹا برداشت کرنا پڑا ہے۔ کرنسی کے مُعاملات ذرا پیچیدہ ہوتے ہیں اور کئی دفعہ کرنسی چلانے والی گورنمنٹیں اس کو اور بھی خواہ مخواہ پیچیدہ بنا دیتی ہیں۔ کیونکہ ایسا کرنے سے اُن کو مالی فائدہ ہوتا ہے۔ یہ کُھلا راز ہے کہ جنگ کے دِنوں میں مزید کرنسی کے اجراسے اور خاص کر کاغذی نوٹوں کے اجرا سے رُوس۔ جرمنی۔ فرانس اور دیگر ممالک نے لاکھوں روپیہ لوگوں سے مزید ٹیکسوں کی صورت میں وصول کیا۔ اور یہ ایسا ٹیکس تھا جس کا پتہ سوائے کرنسی کے ماہروں اور راز دانوں کے عوام النّاس کی سمجھ میں بھی نہ آیا۔ ہندوستان کی گورنمنٹ بھی اس بارے میں سخت مجرم رہی ہے اور سچ پوچھو تو موجودہ گرانی اشیاء میں بھی گورنمنٹ کی کرنسی پالیسی بہت حد تک ذمہ وار ہے۔ یہ کیسے ہے اس پر ہم آگے چل کر روشنی ڈالیں گے لیکن کرنسی کی تاریخ لکھنے سے پہلے چند ایک ابتدائی باتوں پر روشنی ڈالنی ضروری ہے +

عام طور پر لوگ سونے چاندی کے سکّوں کو ہی دولت سمجھتے ہیں۔ اور

جس کے پاس زیور اور سکّے زیادہ ہوں اُس کو بڑا دھنی اور جس کے پاس کم ہوں اُنکو نردھن یا کنگال سمجھا جاتا ہے۔ اسی طرح جس قوم کے پاس ان دھاتوں کی زیادتی ہو اُس کو دولتمند قوم گنا جاتا ہے۔ یہ ایک غلطی ہے۔ سونا چاندی دولت ہیں بھی اور نہیں بھی۔ اور دراصل تاریخ کا یہ واقعہ ہے۔ کہ اس غلطی کے سبب سے ہی اہل سپین نے اپنی شاندار سلطنت اور وسیع تجارت کو سترھویں صدی میں ناقابل تلافی نقصان پہنچایا۔ کیونکہ اُس وقت کے حکمران نے یہ حکم جاری کیا ہؤا تھا۔ کہ سونا چاندی باہر سے تو مُلک میں آجاوے۔ لیکن باہر نہ جانے پاوے۔ جس سے اشیاء کی گرانی مُلک میں اتنی ہوئی کہ تجارتِ برآمد کو سخت دھکا لگا۔ سونا چاندی جو کہ بطور سکّوں کے برتنے جاتے ہیں۔ انسانی جسم میں سانس کی طرح ہیں۔ صرف سانس اندر لینے اور باہر نہ نکالنے سے جس طرح انسان دم گھٹ کر مر جاتا ہے۔ اس طرح سونے چاندی کی صرف درآمد سے جب برآمد نہ ہو سکے سوسائٹی کی آرتھک دشا کو نقصان پہنچتا ہے۔

اصلی دولت گندم گھی۔ کپڑا اور دوسری کارآمد اشیاء زندگی ہے۔ اور ہم سونے چاندی کو دولت اس لئے کہتے ہیں۔ کہ ان کی مدد سے ہم مقدمُ الذکر اشیاء کو خرید کر سکتے ہیں۔ اگر ایک شخص کے پاس سونا ہو اور دوسرے کے پاس گندم او اور ان میں تبادلہ کی رسم نہ ہو تو پہلے شخص سے بڑھ کر کنگال کون ہو سکتا ہے۔

دراصل ایک وقت تھا جب سونے چاندی کے سکّوں کا رواج سوسائٹی میں بالکل نہ تھا۔ اور اب بھی وسطی ایشیا۔ افریقہ۔ امریکہ اور ہندوستان کے بھی کئی حصّے ایسے ہیں جہاں سکّوں کا رواج نہیں ہے۔ اور لوگ اپنی بنائی ہوئی اشیاء کو دُوسرے لوگوں کی اشیاء کے ساتھ تبادلہ کرتے ہیں۔ اور اس طرح سب کا گذارہ ہو جاتا ہے۔ لوہار کو گندم کی ضرورت ہے۔ اور کسان کو لوہے کے پھل کی۔ کچھ

گندم دے کر کسان لوہے کا پھل خرید لیتا ہے۔ اور اس طرح دونوں کی ضروریات پوری ہو جاتی ہیں۔ جولاہا اپنا بنایا ہوا کپڑا دے کر موچی سے جوتا خرید لیتا ہے +

اگر ہر ایک شخص سوسائٹی میں موچی۔ جولاہا۔ ترکھان۔ کسان اور لوہار سب کچھ خود ہی بن سکتا تو شائد ایسے تبادلہ کی بھی ضرورت نہ پڑتی۔ لیکن آبادی کے بڑھنے سے اور ضروریاتِ زندگی زیادہ ہونے سے یہ شخصی ضروریات کو پورا کرنے کی طاقت Individual Self Sufficiency قائم نہیں رہ سکتی۔

دوسری حالت سوسائٹی کی بھی جس کو ہم Age of Barter یا پنجابی میں جس کو وٹے سٹے ਵਟੇ ਸਟੇ کا زمانہ کہہ سکتے ہیں بھی آبادی کے بڑھ جانے سے قائم نہیں رہ سکتی۔ اس میں بھی چند ایک نقائص رونما ہو جاتے ہیں۔ مثلاً جولاہے کو جوتے کی ضرورت ہے اور وہ موچی کے پاس کپڑا لے کر جاتا ہے لیکن موچی کو کپڑے کی نہیں۔ بلکہ لوہے کے اوزار کی ضرورت ہے۔ جس حالت میں جولاہے کو پہلے لوہار کے پاس جانا ہو گا۔ اور اگر اس کو لکڑی کی ضرورت ہے نہ کہ کپڑے کی۔ تب بچارے کو اور بھی سرگردان ہونا پڑے گا۔ اور اگر ایک لوہار کو ایک جوڑہ جوتے کی ضرورت ہو لیکن اس کا ہل دو جوڑہ جوتوں کی قیمت کا ہو تو وہ نہ تو ہل کو توڑ کر آدھا ہل دے سکتا ہے۔ اور نہ ہی وہ دو جوڑہ جوتے لینا چاہتا ہے۔ اس کو ایک کی ضرورت ہے۔ تیسری مشکل یہ آن پڑتی ہے کہ مختلف اشیاء کی قیمت کا مقابلہ و موازنہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ ایک کے پاس مکان ہے دوسرے کے پاس چار گھوڑے ہیں۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ ان کی مقابلتاً حالت کیا ہے +

ان تکلیفوں سے بچنے کے لئے لوگ خود بخود ہی ایک ایسی چیز میں خرید و فروخت شروع کر دیتے ہیں۔ جو براہِ راست ان کو درکار نہیں ہوتی لیکن جس کے تبادلہ میں ان کو وقت ضرورت ہر ایک چیز مل سکتی ہے۔ شروع زمانہ میں بھیڑ بکریا

گوئیں وغیرہ اس قسم کا سکہ تبادلہ رہی ہیں۔ سیپیوں کے منکے اب بھی افریقہ کی اقوام میں بطور سکہ کے رائج ہیں۔ آسٹریلیا کی ایک خونخوار اور جنگجو اصلی باشندوں کی قوم میں انسانی کھوپریاں سکہ کا کام دیتی ہیں۔ کیونکہ شجاعت اور بہادری کی نشانی کے طور پر ان کی اُن کے ہاں بہت ہی قدر ہے۔ لیکن یہ اشیاء بھی جو بطور سکہ کے رائج ہوتی ہیں بہت دیر تک جاری نہیں رہ سکتیں۔ مثلاً اگر گندم سکہ کا کام دے تو یہ تکلیف ہے کہ گندم زیادہ دیر تک ذخیرہ نہیں کی جا سکتی۔ کیڑا لگ جاتا ہے۔ اور اور طرح ضائع ہو جاتی ہے دوسرے گھوڑا وغیرہ قیمتی چیز اگر خریدنی ہو تو اتنا بوجھ گندم کا اُٹھا کر ادھر اُدھر لیجانا پڑے گا +

اس طرح جوں جوں لوگوں کو ان تکالیف کا سامنا کرنا پڑا۔ خود بخود ہی ایک چیز کو چھوڑ کر دوسری اور دوسری کو چھوڑ کر تیسری چیز اس تبادلہ کے کام کے لئے چنی گئی۔ حتیٰ کہ آجکل مہذب دُنیا میں چاندی اور سونا رواج پا گئے ہیں۔ ان دونوں میں یہ خوبیاں ہیں۔ کہ ان کو ڈھال کر سانچے میں ڈال کر سکہ بآسانی بنایا جا سکتا ہے۔ ٹوٹنے اور ضائع ہو جانے کا کوئی اندیشہ نہیں۔ مدت تک رکھے جا سکتے ہیں۔ چھوٹے سے چھوٹا اور بڑے سے بڑا سکہ بنایا جا سکتا ہے۔ ایسے بھی دیکھنے میں خوبصورت چمکدار اور انسان کے لئے لبھانیوالی ہیں۔ اور سب سے ضروری خوبی یہ ہے کہ نہ یہ دھاتیں لوہے کی طرح اتنی بہتات سے ہیں کہ بہت ہی سستی ہوں اور نہ ہی ہیروں اور قیمتی پتھروں کی طرح اتنی کمیاب ہیں کہ نہایت ہی مہنگی ہوں۔ اور سکے بنانے کے لئے دستیاب ہی نہ ہوں +

یہاں ہم ایک اور اصول کی طرف بھی اشارہ کر دینا چاہتے ہیں۔ وہ یہ ہے کہ غریب ملک کے لئے سستی چیز مثلاً چاندی اور امیر ملک کے لئے مہنگی چیز یعنی سونا۔ ٹھیک سکہ کا کام دیں گے۔ مثلاً اگر ہندوستان ایک غریب ملک ہو۔ بہت سے لوگوں کی

آمدنی چند ایک روپوں سے یا پنس ہو۔ تو پاونڈ کا سکہ مفید نہیں ہو سکتا۔ تنخواہ ہی جب پاونڈ سے کم ہو۔ اور پاونڈ سے کم کا سکہ چلتا ہی نہ ہو تو تنخواہ کیسے دیجا دے گی۔ بازار سے چھوٹی چھوٹی اشیاء لینے میں دقت ہو گی۔ اور اگر اس حالت میں بھی سونے کا ہی سکہ جاری کرنا ہو تو بہت چھوٹی قیمت والا سکہ رائج کرنا ہوگا جس کے گم ہو جانے وغیرہ کا ڈر رہے گا۔

امیر ملک انگلستان وغیرہ میں اگر چاندی کے سکے جاری کئے جاویں۔ تو امیر آدمیوں کو اور عام لوگوں کو بھی جن کی آمدنی معقول ہے۔ بہت بھاری بوجھ اپنی جیبوں میں اٹھانا پڑے گا۔ یہ بات عین اسی اصول کے مطابق ہے۔ کہ نوٹ۔ چیک وغیرہ کا رواج اس ملک میں اچھی طرح ہو سکتا ہے۔ جہاں کہ لوگ امیر اور دولتمند ہوں۔

اس بات کے ساتھ ایک اور بات کی طرف بھی اشارہ کر دینا چاہتے ہیں۔ ہم پہلے کہہ آئے ہیں۔ کہ کرنسی کے بڑھاؤ سے گورنمنٹ اشیاء مہنگی کر سکتی ہے۔ اور جب ملک کا ہر فرد بشر گرانی اشیاء سے تنگ آکر سرد آہیں بھر رہا ہو۔ اور کنبہ کی پرورش کرنا بھی اس کے لئے محال ہو رہا ہو۔ تو وہ خواہ مخواہ سٹہ باز یا بیوپاری کو کوستا ہے وہ یہ نہیں جانتا۔ کہ گورنمنٹ نے جو کاغذی سکہ کی بھرمار ملک میں پچھلے چند ایک سالوں میں کی ہے۔ وہ بہت حد تک اس مہنگ کی تہ میں ہے۔ نوٹوں کی تعداد میں کمی کرنے سے قیمتیں گر سکتی ہیں۔ اس اصول کو ارتھ شاستر میں یوں بیان کیا جاتا ہے۔ کہ قیمتوں کا ہیر پھیر روپے سکے وغیرہ کی مقدار پر منحصر ہے۔ اور اس کی کمی بیشی سے قیمتیں گھٹ بڑھ سکتی ہیں۔ یہ بات ایک مثال سے سمجھ میں آسکتی ہے۔ فرض کرو ایک گاؤں کے آدمیوں کے پاس صرف سو روپیہ نقد ہے۔ جو کہ سارے کا سارا انہوں نے خرید میں لگانا ہے۔ زمین میں نہیں دبانا۔ اور نہ ہی گھر رکھنا ہے۔ اور فرض کرو اس روپے سے صرف دس سوا سیر ہونے ہیں۔ دس بارہ روپیہ کی گندم خریدنی ہے۔ بیس پچیس کی بکریاں۔

بیس اکیس کا کپڑا - ایک دو کا نمک وغیرہ وغیرہ - تو یہ صاف ظاہر ہے - کہ اوسط قیمت

$\frac{\text{۱۰۰ روپیہ}}{\text{۱۰ سودے}}$ = ۱۰ روپیہ ہوئی +

اگر اب فرض کر لیا جاوے کہ سو کی بجائے دو سو روپیہ خرچ کرنا ہے - اور اشیاء جو خریدنی ہیں وہ اتنی ہی ہیں یعنی سودے اتنے ہی ہوتے ہیں جتنے پہلے - تو اب اسکی قیمت $\frac{۲۰۰}{۱۰}$ = ۲۰ روپیہ ہوئی - اب اگر فرض کر لیا جاوے کہ M سارے ملک کا روپیہ ہے - اور سودے جو سال بھر میں ہوتے ہیں وہ T تو اوسط قیمت $P=\frac{M}{T}$ ہوئی اور اگر T سی گھٹے بڑھے نہ اور M ہی گھٹے بڑھے تو قیمتوں پر اثر پڑتا ہؤا +

اس بات کو ایک اور مثال سے بھی واضح کیا جاتا ہے - فرض کرو ایک دن صبح اٹھتے ہی لوگوں کی جیبوں میں اور بنکوں میں اور خزانوں میں جو روپے ہیں - ان میں چاندی دگنی ہو جاتی ہے - اور وہ دراصل ڈبل روپے ہو جاتے ہیں - اور لوگوں کو اس بات کا علم نہیں - وہ اسی طرح سودے وغیرہ خرید فروخت کرتے ہیں اور اپنی تنخواہیں لیتے ہیں یعنی ان کی عادات وغیرہ میں تبدیلی نہیں ہوتی تو صاف ہے کہ قیمتیں دوگنی ہو جائیں گی - ایک روپیہ دیتے یا لیتے وقت دراصل ایک شخص دو روپے لے یا دے رہا ہوگا - یہ ٹھیک ہے یکایک سکہ کی تعداد دوگنی نہیں ہو جاتی بلکہ گورنمنٹیں آہستہ آہستہ بڑھاتی ہیں لیکن اس سے فرق نہیں پڑتا - قیمتیں بھی آہستہ آہستہ بڑھتی ہیں - کچھ کم کچھ زیادہ - لیکن اوسط قیمت میں اتنی ہی نسبت سے فرق پڑے گا - جتنی نسبت سے روپیہ وغیرہ کی مقدار میں - یہ ایک کرنسی میں ایک مسلمہ اصول ہے - اس لئے جب گورنمنٹ ہند نے دوران جنگ میں نوٹوں کی بھرمار ملک میں کی تو اس کا یقینی نتیجہ یہ نکلنا تھا - کہ قیمتیں بڑھ جائیں + اس اصول کی تشریح میں بہت موٹی مثال دی ہے اور کئی ایک [illegible] اصول تسلیم کر لئے ہیں - اس تھوڑی کو سمجھانے کے لئے بڑی لمبی تحریر کی ضرورت ہے جو کہ اس جگہ نہیں کی جا سکتی لیکن

ارتھ شاستر کے سمجھنے والے جانتے ہیں۔ کہ موجودہ کرنسی نظام کی پیچیدگیوں کے باوجود یہ تھیوری ٹھیک ہے۔ ہندوستان میں اشیا گرانی کے مطالعہ کے تعلق میں ہمیں اس تھیوری کی مدد کی ضرورت ہوگی

کرنسی کی ابتدا اور اصولوں پر روشنی ڈالتے ہوئے اب ہم ہندوستان کی کرنسی کے مختصر حالات لکھنا چاہتے ہیں۔ آریوں کی کتابوں۔ پرانے سکوں سے جو ملک میں جا بجا دستیاب ہوئے ہیں۔ اور غیر ممالک کے سیاحوں کی تحریروں سے پتا چلتا ہے۔ کہ آریہ ورت میں سکے کا رواج بہت مدت سے چلا آتا ہے۔ سونا۔ چاندی۔ تانبا اور کوڑیاں سکے کا کام دیتی تھیں۔ لیکن ہندوؤں کے زمانے کی یہ خصوصیت رہی ہے کہ بڑا سکہ ہمیشہ سونا رہا ہے۔ مدراس سپرانت میں جہاں اسلامی اثر بہت کم ہوا سنہ ۱۸۱۸ء کے شروع تک سونے کا پن جس کو انگریز پگوڈا کہتے ہیں۔ بڑی مقدار میں رائج رہا۔ حتےٰ کہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے اس کو بطور سکہ کے موقوف کر دیا۔ مسلمانوں کے وقت میں بھی سونے کی مہریں جاری رہیں۔ لیکن چاندی کا استعمال بطور سکہ کے بہت ترقی پکڑ گیا۔ محمد تغلق جس کو پاگل بادشاہ کہا جاتا ہے۔ در اصل کرنسی معاملات میں ایک موجد ہوا ہے۔ اور اس نے تانبے کے سکے جن کی بازاری قیمت ان کی اصلی قیمت سے کئی درجہ کم تھی۔ جاری کر کے آجکل کے کاغذی روپیہ کے بنیادی اصول کی بنا رکھی۔ موجودہ چاندی کے روپے جس کو پہلے ٹنکہ کہتے تھے سنہ ۱۲۳۳ء میں سلطان التمش نے جاری کیا تھا۔ اور آہستہ آہستہ سارے شمالی ہند میں رائج ہو گیا۔ شیر شاہ غوری کے عہد میں اس کا وزن ۱۸۰ گرین (ایک تولہ) ہوا۔ اور اسکا نام بھی "روپیہ" پڑا۔ لیکن اس کے بعد اتنی تبدیلیاں آئیں۔ کہ جب سنہ ۱۷۶۶ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے کرنسی میں کچھ ایزادی کرنی چاہی۔ تو اس وقت حالت یہ تھی۔ کہ ہندوستان کے مختلف حصص میں ۱۳۹ قسم کی سونے کی مہریں رائج تھیں۔ مدراس کا

سونے کا سکّہ بھی ایک قسم کا نہیں تھا۔ بلکہ ۶۱ قسم کا۔ روپے کا ۵۵۶ قسم کے اور علاوہ انہیں ۲۱۴ قسم کے غیر ملکی سکے بھی جاری تھے۔ دراصل بات یہ تھی۔ کہ ہر ایک بادشاہ۔ شہزادہ اور راجہ اپنے سکّے جاری کر دیتا تھا۔ ان مختلف قسم کے سکّہ جات کا اثر یہ تھا کہ تجارت کو سخت نقصان پہنچتا تھا۔ اور دھوکے کا امکان بہت زیادہ تھا۔ اِس دقّت کو دُور کرنے کی غرض سے ایسٹ انڈیا کمپنی کی طرف سے ۱۷۷۸ میں شاہ عالم ثانی کے اُنیسویں سال کا جاری شدہ چاندی کا سِکّہ یعنی روپیہ جاری کیا گیا۔ اور تین اور قسم کے روپے بھی جاری رہے۔ ۱۸۱۸ء میں سونے کا سِکّہ مدراس سے بھی موقوف کر دیا گیا۔ جس پر کچھ ایجیٹیشن بھی ہوا۔ اور دراصل سونے کے سکّے کو بالکل موقوف کر دینے میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی غرض صرف اصلاح کی خواہش نہیں کہی جا سکتی۔ آخرکار ۱۸۳۵ء میں بنگال والا روپیہ (وزنی ۱/۱۲ حصّہ کھوٹ اور ۱۱/۱۲ حصّہ چاندی)۔ سارے ہندوستان کے لئے قانونی سکّہ کے طور پر legal tender جاری کیا گیا۔ اسوقت سے لے کر موجودہ وقت تک روپیہ کے وزن میں یا کھوٹ اور چاندی کے تناسب میں کچھ فرق نہیں ڈالا گیا۔ ۱۸۳۵ء سے ۱۸۷۳ء تک معمولی تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں مثلاً ۱۸۴۰ء میں لوگوں کے ایجیٹیشن کے جواب میں گورنمنٹ نے سونے کی مُہریں بھی خزانوں میں لینی شروع کر دیں۔ اور روپیہ اور مہر کا تبادلہ ۱۵۔ اور ایک کا رکھا۔ ۱۸۴۷ء کے بعد سونے کی کانیں آسٹریلیا میں دستیاب ہوئیں اور سونا بہت سستا ہو گیا۔ اِس لئے پہلا حکم منسوخ کرنا پڑا۔ اور ۱۸۴۲ء میں اعلان کیا گیا۔ کہ شرح تبادلہ مُہر اور روپیہ کی ایک اور دس ہوگی۔ اور چار سالوں کے بعد یہ شرح بھی تبدیل کرنی پڑی۔ ہندوستان کی کرنسی کی دلچسپ تواریخ دراصل ۱۸۷۳ء سے شروع ہوتی ہے۔ ۱۸۷۱ء سے چاندی بازار میں سستی ہونی شروع ہوئی۔ کانوں سے زیادہ مقدار میں نکالی گئی۔ اور جرمنی نے بھی اس سال اپنا چاندی کا سکّہ موقوف کر دیا۔ اس سے ہندوستان

میں تکلیف شروع ہو گئی۔ ہم پہلے کہہ آئے ہیں۔ کہ ۱۸۳۵ء سے چاندی کا روپیہ ہندوستان کا سکّہ قرار دیا گیا۔ اور ہندوستان میں روپوں میں ہی خرید و فروخت اور قیمتوں کا تقرّر ہوتا رہا۔ انگریزی میں یوں کہا جائے گا۔ کہ ہندوستان کا Standard of Value چاندی کا روپیہ مقرّر ہوا۔ ہندوستان کی زیادہ تر تجارت ولایت کے ملکوں اور خاص کر انگلستان سے تھی اور اب بھی ہے۔ اور ولایت کے اکثر ملکوں میں سونے کا سکّہ رائج تھا اور ہے۔ اسلئے ولایت سے جو مال آتا تھا وہ تو پاؤنڈ شلنگ میں Exchange کیا جاتا تھا۔ اور ہندوستانی بیوپاری کے پاس روپے آتے ہوتے تھے۔ تبادلہ کا کام تبادلہ کے بینک اور ساہوکار کرتے تھے۔ اب جبکہ چاندی سستی ہونی شروع ہوئی اور دن بدن گھٹتی گئی۔ تو ولایت کے سونے اور ہندوستان کے چاندی کے سکّے کا تناسب قائم نہیں رہ سکتا تھا۔ اور مال منگواتے وقت یا ملک سے باہر بھیجتے وقت یہ یقین نہیں ہو سکتا تھا۔ کہ کتنے روپے دینے پڑیں گے یا لینے نکلیں گے۔ جس سے کہ ایک غیر یقینی کی سی حالت تجارت درآمد برآمد میں واقع ہو گئی۔ مثال کے طور پر فرض کرو جیسا کہ تھا بھی۔ کہ ۱۸۷۳ء میں شرح تبادلہ ۲ شلنگ برابر ایک روپیہ کے تھی۔ اور چونکہ بیس ۲۰ شلنگ کا ایک پونڈ ہوتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں شرح تبادلہ دس ۱۰ روپیہ فی پونڈ تھی۔ اب چاندی سستی ہونے کے کارن دس سے زیادہ روپیہ فی پاؤنڈ دینے پڑے یعنی گیارہ ۱۱۔ بارہ ۱۲۔ تیرہ ۱۳ وغیرہ۔ تو صاف ظاہر ہے کہ اگر ایک سوداگر نے ہزار ۱۰۰۰ پاؤنڈ کا مال باہر بھیجا ہو۔ جب شرح دس ۱۰ روپے مساوی ایک پاؤنڈ تھی اور ہنڈی جاری کرنے وقت تک شرح تبادلہ گیارہ ۱۱ روپیہ فی پاؤنڈ ہو گئی ہو تو اس کو بجائے دس ۱۰ ہزار روپیہ کے جس کی اس کو توقع تھی گیارہ ہزار روپیہ مل جائیں گے۔ اور اگر کسی دوسرے سوداگر نے ہزار روپیہ کا مال باہر سے منگوایا ہو تو اس کو فی پاؤنڈ گیارہ

روپیہ خرچ کر کے خریدنے ہونگے۔ اس طرح گیارہ ہزار روپیہ دینا پڑے گا۔ حالانکہ جب مال کا آرڈر دیا تھا اس نے دس ہزار روپیہ کا حساب کیا تھا۔ اور شاید اپنا تھوڑا سا منافع شامل کر کے پہلے بھیجنے کا سٹہ کر دیا تھا۔

سنہ ۱۸۷۳ء سے یہ وقت شروع ہو گئی۔ کہ چاندی کے سستا ہونے سے شرح تبادلہ گرنی شروع ہو گئی۔ یعنی فی پاؤنڈ دس ۱۰ سے زیادہ روپے ہو گئے اور اس سے جیسا کہ اوپر دی ہوئی مثال سے واضح ہو گا۔ باہر سے مال منگوانے والوں کو نقصان پہنچنا شروع ہوا۔ اور یہاں سے باہر مال بھیجنے والوں کو منافع۔ یعنی تجارت درآمد کو نقصان اور تجارت برآمد کو فائدہ۔ لیکن غیر یقینی کی حالت سے جوسٹے بازی شروع ہوئی۔ اس سے ان سالوں میں مال منگوانا یا باہر بھیجنا ایک جوآ بازی سے کچھ کم نہ تھا۔

تجارت درآمد میں چونکہ انگلستان والوں کا حصہ زیادہ ہے۔ اس لئے انگریز سوداگروں نے واویلا مچانا شروع کیا۔ نوکر شاہی بھی ان کی پشت پر کچھ عرصہ بعد ہو گئی۔ کیونکہ انگریز افسر جو اپنے بال بچوں کی پرورش اور تعلیم ولایت میں ہی کرتے ہیں۔ ان کو شرح تبادلہ کے گرنے سے پہلے جتنے ہی پاؤنڈ وہاں بھیجنے کے لئے اب زیادہ روپے دینے پڑتے تھے۔ گورنمنٹ کو بھی کثیر نقصان اٹھانا پڑا۔ یا یوں کہو کہ مالی مشکل پڑ گئی جس سے ٹیکس بڑھانے پڑے۔ کیوں کہ جیسا کہ ناظرین جانتے ہونگے پنشن۔ سٹورز۔ بحری فوج

سود وغیرہ کے لئے ہر سال ہندوستان کو بیس ملین پاؤنڈ لگ بھگ تیس کروڑ روپیہ ولایت بھیجنا پڑتا ہے۔ جن کے بھیجنے کا طریقہ یہ ہے کہ وزیر ہند ولایت میں انگریز سوداگروں وغیرہ سے پاؤنڈ لے کر سرکار ہند کے نام ہنڈی جاری کر دیتا ہے۔ اور سرکار ہند کو روپے دینے پڑتے ہیں۔ یہ گویا طریقہ ہے جس سے

سرکار ہند وزیر ہند کو اُس کے خرچ کے لئے روپیہ بھیج سکتی ہے۔ یہ ولائتی ہُنڈی وزیر ہند بازار کے نرخ پر ہی بیچ سکتا ہے۔ اب جبکہ نرخ گر رہا ہو ظاہر ہے۔ کہ ایک پاؤنڈ کے بھیجنے کے لئے سرکار کو پہلے کی نسبت زیادہ روپیہ دینے ہونگے اور یہ ایک قسم کا سرکار کو نقصان یا زیادہ بوجھ برداشت کرنا پڑے گا۔ یہ اندازہ لگایا گیا ہے۔ کہ شرح تبادلہ کے ایک پنس یا ایک آنہ گر جانے سے تقریباً سرکار کے بجٹ پر ایک کروڑ روپے کا اثر پڑتا تھا۔

چائے کے باغیچوں کے مالک جو چائے کی برآمد کرتے ہیں۔ رُوئی کی صنعت والے جن کو کپڑے کے درآمد کے رُکنے سے فائدہ تھا۔ اور جو اُس وقت چین جاپان وغیرہ میں مال بھی بھیجتے تھے۔ اور اس طرح سے جن کو ڈبل فائدہ تھا۔ اُنہوں نے شور مچانا شروع کیا۔ کہ سرکار کو شرح تبادلہ کے بارے میں کچھ نہیں کرنا چاہئے۔ سرکار ہند کئی ایک سال اسی تذبذب میں پڑی رہی۔ اور اپنی طرف سے بہت کوشش کی کوئی سمجھوتا بین الاقوامی کوئی ایسا کیا جاوے جس سے چاندی کی قیمت گرنے سے رُک جاوے۔ لیکن جب ساری کوششیں بے سود ثابت ہوئیں تو ۱۸۹۳ء میں لاچار ایک کمیٹی لارڈ ہرشل کے ماتحت مقرر کر کے اپنی تجاویز اُس کے سامنے رکھیں۔ کمیٹی کی سفارش پر جون ۱۸۹۳ء میں ہندوستانی ٹکسال میں چاندی کا روپیہ لوگوں کو آزادانہ طور پر بنا کر دینا بند کر دیا گیا۔ جیسا کہ اُس وقت تک رواج تھا اور گورنمنٹ نے خود بھی چند سال روپیہ مضروب کرنے سے پرہیز کیا۔ تاکہ روپیہ کم ہونے سے اُس کی قیمت بڑھ جاوے۔ اور اُس کی بازاری قیمت (Market Value) اور Real Value اُس کی اصلی قیمت میں تفاوت واقع ہو جاوے۔ مگر جنوری ۱۸۹۵ء تک شرح تبادلہ گرتی ہی گئی۔ اس وقت یہ ۱۲ ۱/۲ پنس فی روپیہ تھی۔ یعنی ۱۹ ۱/۵ روپیہ فی پاؤنڈ۔ اس کے بعد بڑھنی شروع ہوئی حتیٰ کہ ۱۸۹۹ء

میں یہ ۱۶ پنس یعنی ۱۵ روپیہ فی پونڈ تک پُہنچ گئی اور یہ شرح تھی جو پرشل کمیٹی نے مقرّر کرنے کی تجویز کی تھی۔ یہ واضح رہے کہ روپیہ میں ۱/۱۱ تولہ چاندی ہے۔ اِس کی بازاری قیمت کے حساب سے دراصل روپیہ اُس وقت بھی تقریبًا ۹۔۱۰ پنس کے برابر تھا اور اگر لوگ ۱۶ پنس اُس روپیہ کے لئے دینے کو تیار تھے۔ تو اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ کاروبار چلانے کے لئے روپیہ ہی سرکاری قانونی سکّہ تھا۔ پونڈ وغیرہ اُس وقت نہ تھے۔ اور روپے بنانے اور چلانے والی صرف سرکار ہند تھی۔ جعلی روپیہ بنانا تو جُرم تھا ہی۔ اور اگر لوگ چاندی ٹکسال میں لیجا کر اپنے روپے مضروب کروانا چاہتے تھے جیساکہ وُہ پہلے کیا کرتے تھے۔ اور اجازت تھی۔ وہ بات تو ۱۸۹۳ء ۶ جون سے سرکار ہند نے پہلے ہی بند کر دی ہوئی تھی۔ اس لئے لاچار جب روپیہ کی مانگ بڑھی۔ اور اور کوئی ذریعہ روپیہ بنانے یا دستیاب ہونے کا نہ ہؤا۔ تو لوگ سرکاری قیمت مقرّرہ پر ہی لینے کے لئے مجبُور ہو گئے۔ اُس وقت سے چاندی کا روپیہ ایک token coin یعنی نقلی سکّہ بن گیا۔ اور اس کا یہ فائدہ ہؤا۔ کہ اب خواہ چاندی کتنی ہی کیوں نہ سستی ہو۔ روپیہ کی قیمت وہی رہے گی سستی چاندی کا نتیجہ صرف یہ ہوگا۔ کہ جہاں پہلے گورنمنٹ کو فی روپیہ سات آنے منافع بچ رہتا۔ چاندی سستی ہونے سے آٹھ آنے یا نو آنے بچ رہیں۔ ۱۸۹۸ء میں فاولر کمیٹی مقرر کی گئی تاکہ مزید سفارشات کرے۔ اِس کمیٹی نے پونڈ اور نصف پونڈ کو بھی قانونی سکّہ بنانے کا مشورہ دیا اور سفارش کی۔ اب چُونکہ ہندوستان کی قیمتوں کا معیار یا ماپ چاندی کی بجائے پونڈ یعنی سونا کر دیا گیا ہے۔ سونے کے سکّے بھی بھاری مقدار میں رائج کئے جاویں جیساکہ ہم پہلے کہہ آئے ہیں۔ سرکار ہند کو اب ایک روپیہ بنانے میں ۹ آنے کے قریب خرچ آتے تھے۔ کیونکہ روپے میں ڈالی ہوئی چاندی کی اِتنی ہی قیمت تھی لیکن سرکار سولہ آنے کے حساب سے روپے رائج کرتی تھی۔ اِس طرح ساتھ آنے

کے قریب ہر ایک روپے پر سرکار کو منافع بچتا تھا۔ فولر کمیٹی نے سفارش کی کہ یہ منافع ایک علٰحدہ ریزرو میں رکھا جاوے۔ اور جب کسی سبب سے شرح تبادلہ گرنے لگے یعنی روپیہ کی قیمت سولہ پنس سے گر کر چودہ یا پندرہ پنس ہونے لگے۔ تو سرکار کُھلم کُھلا لوگوں کو سولہ پنس ہی فی روپیہ دینے کو تیار ہو۔ اور یہ ریزرو اسی مطلب کے لئے استعمال کیا جاوے۔ یعنی ریزرو سونے کی صورت میں رکھا جاوے۔ اور روپوں کے عوض پونڈ مقررّ کردہ شرح تبادلہ پر لوگوں کو دیئے جاویں۔ ایسا کرنے کا نتیجہ یہ ہوگا۔ کہ شرح تبادلہ گرنے سے رُک جاویگی۔ کیونکہ گورمنٹ سے جب ایک روپے کے ۱۶ پنس ملتے ہوں۔ تو بازار میں ۱۶ سے کم کوئی بھی لینے کو تیار نہ ہوگا +

کیمٹی نے یہ بھی سفارش کی کہ سونے کا سکہ ہندوستان میں ہی مضروب کرنے کے لئے بمبئی میں ٹکسال کھولی جاوے +

یہ حالت تھی ہندوستان کی کرنسی کی ۔ اُنیسویں صدی کے اخیر یعنی ۱۹۰۰ء سے ستمبر ۱۹۱۴ء تک یعنی جنگ کے آغاز تک کی تاریخ پر مختصر سی روشنی ڈالی جاسکتی ہے دورانِ جنگ میں جو تبدیلیاں اور مشکلات ہماری کرنسی مشین میں پیدا ہوگئیں اُن کا مفصّل حال کسی اگلی فصل میں بتایا جاوے گا۔ اور چودہ سالوں میں صرف ایکدفعہ ۱۹۰۷ء میں جب نیویارک میں ایک دو بینک فیل ہوگئے۔ اور اُن کا اثر لنڈن کے بازار پر پڑتا ہوا۔ ہندوستان میں بھی پڑا۔ اور جبکہ قحط کے سبب سے تجارت برآمد بہُت کم ہوگئی۔ ہندوستان کی شرح تبادلہ مقررّ کردہ حدود سے گر گئی۔ لیکن یہ زیادہ تر سرکاری افسران کی ناتجربہ کاری کے سبب سے تھا۔ اور جُوں ہی روپوں کے بدلے پونڈ دینے سرکار نے شروع کر دئے۔ شرحِ تبادلہ اپنی اصلی حالت پر آگئی۔ لیکن سب سے ضروری امر جو قابلِ نوٹ ہے۔ وُہ یہ ہے کہ بارادہ یا بلا

ارادہ سرکار ہند نے فولر کمیٹی کی سفارشات پر عمل نہیں کیا۔ ٹکسال کھولنے کی تیاریاں کرتے کرتے سکیم ولایت کے افسران خزانہ کی مخالفت کے سبب سے ترک کر دی گئی۔ سونے کے سکّہ کا رواج مُلک میں نہیں کیا گیا۔ اگرچہ یہ سرکاری بیان ہے۔ کہ لوگوں نے خود کوئی زبردست خواہش پونڈ لینے کی ظاہر نہیں کی کہ سرکار کی طرف سے پونڈ لوگوں کو دئے گئے۔ لیکن لوگوں میں روپے کی خواہش اتنی زبردست تھی۔ کہ پونڈ واپس خزانوں میں آگئے۔ بلکہ اُن پر کچھ گھاٹا بھی تھوڑے عرصہ کے لئے نمودار ہو گیا تھا۔ اِس بیان کو قطعی طور پر سچا نہیں مانا جا سکتا۔ خزانے میں پونڈوں کا واپس آنا ظاہر کرتا ہے۔ کہ سونا ملک میں واقعی رواج پانے لگ پڑا تھا۔ کیونکہ ایسا نہ ہوتا تو پونڈ پھر پھرا کر واپس خزانہ نہ آتے۔ بلکہ لوگ دفن کر چھوڑتے یا گھروں میں ہی رکھ چھوڑتے۔ باقی رہا روپؤں کے لئے زبردست خواہش۔ سو وہاں یہ بات عیاں ہے کہ ہر شخص یا ہر سودے کے لئے پونڈ کار آمد نہیں ہو سکتے۔ کم تنخواہ والے مزدوروں کو روپے کی ہی ضرورت رہے گی تیسرے چاندی کا روپیہ برتنے کی اتنی مُدّت کی عادت فوراً غائب نہیں ہو سکتی تھی۔ اِس لئے جب پونڈ لوگوں کو دئے گئے اور روپیہ کی بہم رسانی کم کی گئی یا جائز ضرورت کے لئے پوری نہ کی گئی۔ تو نتیجہ تو پہلے ہی ظاہر تھا۔ کہ یار کی نیّت میں کچھ شک ہے جیسا کہ سرکار ہند کا مشہور وطیرہ ہے کہ جب یہ کسی پالیسی پر عملدر آمد کرنا چاہتی ہے تو خواہ یہ کمیٹی مقرر کرے۔ خواہ شاہی کمیشن۔ خواہ کرنسی کا تجربہ ہی کرے۔ نتیجہ یا سفارشات ہمیشہ من بھاتی ہی نکلیں گی +

سونے کے سکّہ کا رواج نہ کرنے یا نہ ہونے کے سبب سے اور گورنمنٹ کی پالیسی کا نتیجہ یہ نکلا۔ کہ فولر کمیٹی اور سارا ہندوستان سوچتا تو کچھ اور رہا اور نتیجہ کچھ اور کا اور ہی نکل آیا یعنی گھر سے تو چلے تھے۔ گولڈ سٹینڈرڈ سسٹم

کے لئے ۔ لیکن ۔ از روئے عمل نکل آیا (گولڈ ایکسچینج سسٹم) جس کا مطلب یہ ہے کہ ملک کی اندرونی تجارت وضروریات کے لئے تو چاندی کا روپیہ سکہ ہے اور دوسرے ملکوں کے سوداگروں کی ادائیگی کے لئے یا روپیہ بھیجنے کیلئے سونا ۔ چنانچہ اندرونی کام کے لئے گورنمنٹ پونڈ دینے کی ذمہ وار نہیں ۔ لیکن اگر روپیہ باہر بھیجنا ہو تو روپوں کے عوض مقررہ شرح تبادلہ پر پونڈ مہیا کرنے اس کا فرض ہے ۔ دوسرے الفاظ میں ہم دونوں سسٹم میں جو فرق ہے وہ اس طرح بیان کر سکتے ہیں ۔ کہ مقدم الذکر سسٹم میں Standard of Value قیمتوں کا معیار (ماپ) بھی سونا ہے ۔ اور بڑا سکہ بھی سونے کا ہے ۔ جس کی اصلی قیمت اور بازاری قیمت میں کوئی فرق نہیں ۔ مؤخر الذکر سسٹم میں Standard of Value سٹینڈرڈ آف ویلیو تو سونا ہی ہے ۔ لیکن بڑا سکہ چاندی کا نقلی روپیہ ہے جس کی اصلی قیمت تو صرف ۹ آنے تھی ۔ لیکن جس کی تبادلہ کی قیمت سرکار کی طرف سے سولہ آنے مقرر کی گئی +

ایک اور امر جس پر سارے ملک میں بڑا ایجیٹیشن اس چودہ سال کے عرصہ میں ہوتا رہا اور اب بھی ہے ۔ وہ یہ تھی کہ گورنمنٹ نے فولر کمیٹی کی سفارش پر عمل کرتے ہوئے روپیہ بنانے پر جو منافع ساڑھے سات آنے فی روپیہ ہوتا تھا ۔ اُس کو ایک علیحدہ گولڈ سٹینڈرڈ ریزرو G. S. Reserve میں رکھنا تو شروع کر دیا ۔ لیکن یہ سارے کا سارا سٹینڈرڈ پہلے چند سالوں میں اور بعد ازاں بہت سا حصہ ہندوستان میں رکھنے کی بجائے لنڈن میں رکھنا شروع کر دیا ۔ گو ریزرو اس غرض سے جمع کیا جاتا ہے ۔ کہ جب شرح تبادلہ گر جاوے ۔ تو سرکار روپیہ کے عوض پونڈ اس ریزرو سے نکال کر مقررکردہ شرح پر دے ۔ تاکہ ایسا کرنے سے شرح مقرر کردہ حدود کے اندر رہے ۔ لیکن دوسری غلطی جو سرکار نے کی اور جس پر اعتراض

کیا جاتا ہے۔ وہ یہ تھی۔ کہ ریزرو میں چاندی بھی رکھنی شروع کر دی۔ اور وہ چاندی ہندوستان میں بطور ریزرو کی شاخ کے رکھی گئی۔ ایسا کرنے سے لوگوں کو خواہ مخواہ شک پیدا ہو گیا۔ کہ کہیں لنڈن کے مشہور چاندی کے سوداگروں کو روپیہ کمانے کے لئے ہی چاندی خرید کر نئی شاخ نہ کھول دی گئی ہو۔ کیونکہ ضرورت تو اس کی بالکل نہ تھی ہی نہیں۔ ممکن ہے یہ بات غلط ہو اور جنگ کے دنوں کے سبق سے تو ہم شاید خوش ہوتے کہ یہ شاخ رہنے دی جاتی اور بند نہ کر دی جاتی۔ لیکن اس وقت کم از کم لوگوں کو شک کرنے کی کافی وجوہات تھیں +

تیسری بات جو گورنمنٹ نے کی وہ ریزرو کا غلط استعمال تھی۔ ریزرو کا تو فائدہ اور در اصل منشا کا ادیش ہی یہ ہے کہ اس میں خالص سونا یا پونڈ رکھے جاویں۔ تا کہ بوقت ضرورت وہ سرکار کی پہنچ میں ہوں۔ لیکن وزیر ہند نے اس ریزرو سے انگریز سوداگروں اور بینکروں کو قرضہ جات دینے شروع کر دیئے اور شرح سود بھی بازاری شرح سود سے کم لینی شروع کر دی۔ یہ قرضہ جات وزیر ہند ایک دلال کی معرفت کرتا ہے۔ جس کو بڑی بھاری کمیشن کی آمدنی ہے۔ اور اس پر بھی بس کرتے ہوئے ریزرو کا سونا ولایت اور انگریزی نو آبادیوں کے سرکاری قرضہ جات کے تمسک Gold Securities خریدنے میں بھی لگانا شروع کر دیا۔ ان باتوں سے جو ملک میں ارتھ شاستر کے جاننے والوں کی طرف سے واویلا مچا اچھی طرح سمجھ میں آسکتا ہے۔ در اصل ریزرو رکھنے کا اصلی مقصد مفقود ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اگر یکایک کسی تجارتی یا بینک کی انجمن سے Commercial or Banking concern لوگ گورنمنٹ کو روپیہ دے کر باہر بھیجنے کے لئے سونا مانگنا شروع کر دیں تو وزیر ہند کو ریزرو سے دیا ہوا قرضہ واپس یکا یک مانگنا پڑے۔ ممکن ہے مل جاوے اور غالب ہے کہ بینک کا دیوالہ ہی نکل جاوے اور روپیہ ہی ضائع ہو جاوے یا تمسک نہ بکنے

پڑیں یا گروی رکھنے پڑیں۔ لیکن جلدی بیچنے میں جو نقصان ہوگا۔ اُس کا اندازہ ناظرین خود لگا سکتے ہیں +

۱۹۱۳ء میں ایک شاہی کمیشن کرنسی معاملات اور متعلقہ امور پر رپورٹ کرنے کے لئے مقرر کیا گیا۔ لوگوں کا خیال تھا۔ اُن کی نکتہ چینی شائد کارگر ثابت ہوتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن رپورٹ جو جنگ سے کچھ عرصہ پہلے ہی مرتب کی گئی۔ ایک سفیدی پھیرنے والی رپورٹ ہی ثابت ہوئی۔ کثرت رائے نے گورنمنٹ کی ہوئی سب باتوں کو دلیلوں سے ثابت کر کے بتا دیا۔ کہ سرکار ہند اور وزیر ہند مبرا بلا خطا ہیں۔ مثلاً اُنکی رائے میں ہندوستان کے لئے سونے کے سکّے کی ضرورت نہیں ہے۔ روپوں اور نوٹوں پر گذارہ کرنا چاہیئے۔ سونے کا استعمال ان کی رائے میں خواہ مخواہ کی فضولخرچی ہے۔ سونے کے سکّے کے لئے ٹکسال کی بھی ضرورت نہیں۔ اگرچہ وہ اس کی قائمی پر اعتراض نہیں کریں گے +

ریزرو لنڈن میں ہی رکھنا چاہیئے۔ کیونکہ بین الاقوامی تجارت میں لنڈن ساری دُنیا کا مرکز ہے۔ اور عام طور پر ایک شخص نے خواہ کسی بھی مُلک میں ادائیگی کرنی ہو۔ وہ لنڈن کی وساطت سے ہی کرتا ہے۔ اس لئے ریزرو کی ضرورت لنڈن میں ہوگی۔ اور بھی کئی ملک اپنے ریزرو وہاں ہی رکھتے ہیں۔ ریزرو کے کچھ حصّہ کو قرضہ دینے کے لئے استعمال کرنا مناسب اور منافع کا کام ہے۔ کیونکہ سُود آتا رہتا ہے۔ اگرچہ خالص سونا بھی کافی مقدار میں رکھنا چاہیئے۔ کمیشن نے یہ بھی رپورٹ کی کہ اس ریزرو کے لئے کوئی آخیری حد مقرر نہیں کی جا سکتی۔ اور سرکار ہند کو چاہیئے۔ کہ اسکو بڑھاتی چلی جاوے۔ چاندی ریزرو میں نہیں رکھنی چاہیئے۔ وغیرہ وغیرہ +

جنگ کے شروع ہو جانے سے رپورٹ کھٹائی میں پڑ گئی۔ اور جنگ نے ایسی نئی کرنسی مُشکلات اور دقتیں پیدا کر دیں۔ کہ دو سال کے اندر ہی اندر چمبرلین رپورٹ

کی سفارشات بے سود ہوگئیں۔ جنگ کے متعلق شرح تبادلہ اس کے بڑھنے گھٹنے کے اسباب اور جنگ کے بعد سے آج تک کی ہسٹری ہم اگلے مضمون میں لکھیں گے۔

یہاں ہم یہ بھی بتا دینا چاہتے ہیں۔ کہ دورانِ جنگ اور اُس کے بعد ریزرو میں بہت تبدیلی واقع ہوگئی ہے۔

۳۱ مارچ ۱۹۱۳ء کو گولڈ سٹینڈرڈ ریزرو کی مقدار وغیرہ یوں تھی۔ تخمیناً کروڑ روپوں میں:-

تمسکات .... چونتیس کروڑ روپیہ

انگریز سوداگروں کو قرضہ .... ڈیڑھ کروڑ روپیہ

سونا جو بینک آف انگلینڈ میں رکھا ہوا تھا.. ڈھائی کروڑ روپیہ

ہندوستان میں چاندی .... چھ کروڑ روپیہ

دورانِ جنگ میں ریزرو کا تقریباً سارا سونا سرکار انگریزی کے تمسکات خریدنے میں لگا دیا گیا۔ دوسرے الفاظ میں وزیر ہند نے ہندوستان کا روپیہ سرکار انگریزی کو قرضہ کے طور پر دے دیا۔

مثلاً نومبر ۱۹۱۹ء میں یہ ریزرو تین کروڑ ۴۷ لاکھ ۸۰ ہزار ۳ سو ۱۷ پونڈ تھا جن میں سے نقد صرف ۲۷ ہزار ۹۳ پونڈ تھا۔

شرح تبادلہ

ہندوستان میں روپیہ ایک جگہ سے دوسری جگہ کس طرح بھیجا جاتا ہے۔ لاہور سے بمبئی کو منی آرڈر بھیجنا ہو۔ تو خواہ نومبر میں بھیجو۔ خواہ دسمبر میں سَو روپے کے لئے ایک روپیہ منی آرڈر کی فیس دینی ہوگی۔ اور سو روپے کی جگہ سوا ہی روپیہ دینا ہوگا لیکن جن لوگوں نے کبھی ولایت کو روپیہ بھیجا ہو۔ انہیں معلوم ہوگا۔ کہ کبھی تو ۱۰۰ روپے لیکر انہیں ۱۲ پونڈ کا منی آرڈر کرنے کی اجازت دے دیجاتی تھی۔ اور کبھی وہی ۱۰۰ روپے ۸ یا ۹ پونڈ بن جاتے تھے۔ آخر کیا وجہ ہے۔ کہ لاہور اور بمبئی کے رشتے میں فرق پڑ جاتا ہے۔ وجہ یہ ہے۔ کہ لاہور میں ہندوستانی ٹکسال کا روپیہ چلتا ہے۔ اور بمبئی میں بھی وہی روپیہ رائج ہے۔ اس لئے لاہور سے بمبئی روپے بھیجنے میں کوئی تکلیف نہیں ہوتی۔ ذرا اب لاہور اور لنڈن کا مقابلہ کرو۔ اگر جہلم ہاؤس لنڈن سے ہزار پونڈ کا مال منگواتا ہے۔ تو اس کے لئے ضروری ہے۔ کہ وہ ہندوستان کے روپوں کو ولایت کے پونڈوں میں تبدیل کرے۔ اور پھر اپنے لنڈن کے قرضخواہ کا حساب صاف کرے۔ وہ یہاں سے روپے منی آرڈر کر کے نہیں بھیج سکتا۔ بلکہ پہلے روپوں کے پونڈ خریدتا ہے اور جیسے بازار میں اور چیزیں فروخت ہوتی ہیں اور ان کے نرخ کم و بیش ہوتے رہتے ہیں۔ ویسے ہی پونڈوں کی قیمت بھی گھٹتی بڑھتی رہتی ہے۔ اس لئے کبھی سو روپے کے ۱۲ پونڈ ملتے تھے۔ اور کبھی صرف آٹھ یا نو پونڈ ہی دستیاب ہوتے ہیں۔

وجہ یہ ہے۔ کہ دنیا کے سارے ملک ابھی تک اس بات کا فیصلہ کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں کہ سارے جہان میں ایک ہی سکہ رائج ہو۔ اگر ایسا ہو جائے۔ تو سوائے فیس منی آرڈر کے یا اس طرح کے جو دوسرے ذریعے ہوں۔ ان سے روپیہ بھیجنے پر انگلستان والے کوئی

تکلیف سامنے نہ آئے۔ مگر اب ایک مُلک کے سکوں کو دوسرے مُلک کے سکوں میں تبدیل کرنا پڑتا ہے +

شرح تبادلہ کس اصول پر مبنی ہے

پہلی بات تو یہ ہے کہ سونا چاندی قیمتی دھاتیں ہیں۔ یہ زیورات وغیرہ کے لئے استعمال ہوتی ہیں۔ اس لئے ان کی قیمتیں بازار میں قیمتی دھاتوں کے طور پر بھی ہیں چنانچہ اگر کسی مُلک کے سکے کو دوسرے مُلک کے سکے میں تبدیل کرنا ہو۔ تو قیمت کا تقریباً فیصلہ اس بات پر ہو جاوے گا۔ کہ ایک سکے میں دوسرے سکے کی نسبت کے گُنا دھات ہے مثلاً اگر پونڈ میں ایک تولے کے قریب خالص سونا ہو۔ اور کسی اَور مُلک کے سکے میں آٹھ ماشے ہوں۔ تو دو پونڈ تقریباً دوسرے مُلک کے تین سکوں کے برابر ہونگے لیکن یہاں ہی سارا فیصلہ نہیں ہو جاتا +

(۲) اگر بمبئی سے ولایت روپیہ بھیجنا ہو تو روپے کے بھیجنے میں بھی کچھ خرچ ہوگا۔ اس لئے ضروری ہے۔ کہ ہم اس خرچ کو بھی ساتھ شامل کرلیں۔ گو یہ خرچ بہت ہی تھوڑا ہوتا ہے۔ لڑائی کے دنوں سے پہلے کی بات لو۔ ایک روپے کو ولایت بھیجنے کا خرچ ¼ پنس آتا ہے۔ اِس لئے ایک روپیہ ولایت جا کر بجائے ۱۶ پنس کے ¾ ۱۵ پنس کے برابر ہو جاتا ہے۔ اسی طرح سے ولایت سے ۱۶ پنس بھیجنے کا خرچ ⅛ پنس ہوتا ہے جس کے معنے یہ تھے۔ کہ ⅛ ۱۶ پنس ولایت سے بھیجنے پر ہندوستان میں ایک روپیہ ملتا تھا۔ روپے کی قیمت اِن دونوں حدود کے اندر بدلتی رہتی تھی۔ لیکن معمولی ایام میں روپیہ کی قیمت ¾ ۱۵ پنس سے کم اور ⅛ ۱۶ پنس سے زیادہ نہیں ہوتی تھی +

اب روپے کی پالیسی اور سکے کی زیادہ سے زیادہ اور کم سے کم قیمت تو قائم ہو گئی۔ سوال صرف یہ رہ گیا ہے۔ کہ مختلف وقتوں پر مختلف قیمت کیوں ہوتی ہے۔ اس کا فیصلہ اس بات سے ہوگا۔ کہ بازار میں سکہ کس قدر تعداد میں موجود ہے۔ اور اُسکی

کس قدر مانگ ہے۔ اب یہ دیکھنا ہے کہ سکّے کی مانگ اور اُس کی بہم رسانی سے کیا مراد ہے۔

وہی مثال لو۔ جہلم ہاؤس نے ولایت سے ہزار پونڈ کا مال منگوایا۔ تو جہلم ہاؤس کو لاہور میں ہزار پونڈ کی مانگ ہے۔ لیکن دُوسری طرف سمجھو۔ رالی برادرس نے کسی لاہوری دوکاندار کی معرفت ہزار پونڈ کی گندم خرید کی ہے۔ چنانچہ لاہور دوکاندار کے پاس ہزار پونڈ آنے ہیں۔ اب اگر رالی برادرس ولایت سے گندم کے دوکاندار کو ہزار پونڈ بھیجیں اور جہلم ہاؤس ولایت کو اپنے سودے کے ہزار پونڈ بھیجے تو دونوں کو جہاز کا کرایہ مفت میں دینا پڑے گا ۔۔۔۔۔ آسان طریقہ تو یہ ہے کہ گندم کے دوکاندار اپنے ہزار پونڈ کا دعوے لے جہلم ہاؤس کو بھیجدیں اور وصولی لیجہلم ہاؤس ہزار پونڈ کے اس دعوے کو اپنے قرضخواہ کے پاس بھیجدیں اور وُہ ولایت میں رالی برادرس سے روپیہ وصول کرے۔ اس طرح سے دونوں طرفوں کو روپے کے بھیجنے اور منگوانے کا خرچ بچ جائے تجارتی کاروبار میں اس خرچ کو بچانے کا انتظام کیا گیا ہے۔ جہلم ہاؤس کو ولایت روپیہ بھیجنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ بلکہ جہلم ہاؤس انڈین نیشنل بنک کے پاس جاکر اس سے ہزار پونڈ کی ہنڈی خرید کر وہ ہنڈی اپنے قرضخواہ کو ولایت بھیجدے گا۔ اور وُہ انگریزی دوکاندار انڈین نیشنل بنک کی شاخ لنڈن سے وُہ ہنڈی دے کر اپنا روپیہ وصول کرلیگا۔ اُدھر رالی برادرس بھی غالباً انڈین نیشنل بنک کی شاخ لنڈن سے ہزار پونڈ کے روپے خرید کر اُس کی ہنڈی کو ہندوستان بھیجدے گا۔ اور لاہور کا گندم کا سوداگر اس ہنڈی کے ذریعہ اس بنک کی لاہور کی شاخ سے اپنے روپے وصول کرے گا۔ اور دونوں طرف سے حساب ٹھیک ہو جاوے گا۔ اسی طرح بنک ہندوستان کے سودوں کے لئے ہندوستان والوں کو۔ اور ولایت کے سودوں کے لئے ولایت والوں کو روپیہ ادا کردے گا +

یہ تو ایک بڑی سادہ سی مثال دی گئی ہے۔ عملی مُعاملات میں بات اتنی سادہ نہیں

ہوتی ہے۔ یہ کم ہی ہوتا ہے۔ کہ ہندوستان والوں نے اُتنا ہی مال منگوایا ہو۔ جتنا کہ ولایت والوں نے منگوایا ہے۔ یا جتنا کہ ولایت والوں کا ہمارے ذمّہ ہے۔ کام کرنے والے بینک بھی کئی ہوتے ہیں۔ لیکن عام طور پر سودے ایسے ہی طے ہوتے ہیں۔ دونوں مُلکوں کے روزانہ مطالبوں میں جو فرق ہوتا ہے۔ وُہ فرق ہی شرح تبادلہ کو پہلے طے شدہ مدّوں کے اندر گھٹاتا بڑھاتا ہے۔ مثلاً اگر کسی دِن ولایت کو روپیہ بھیجنا ہو۔ ایک لاکھ پونڈ ولایت پر تمسّک ملتے ہوں۔ صرف ۹۰ ہزار پونڈ کے تو مختلف سوداگروں میں اس بات کے لئے مقابلہ ہوگا۔ کہ کون شخص اپنے روپے کو ولایت بھیج سکتا ہے۔ اس مقابلے کا نتیجہ یہ ہوگا۔ کہ پونڈ کی قیمت بڑھ جائے گی۔ اِسی طرح سے اگر ولایت کے تمسّکات ایک لاکھ دس ہزار پونڈ کے ملتے ہوں تو پونڈ کی قیمت گر جائیگی +

تقرّری قیمت میں گورنمنٹ کا ہاتھ

عام حالات میں ایسا ہوتا ہے۔ لیکن ہندوستان ایک عجیب مُلک ہے۔ جہاں گورنمنٹ کا دائرۂ اثر بڑا وسیع ہے۔ اور بجائے اس کے کہ گورنمنٹ پونڈ اور روپے کی قیمت کو بازار کی ضرورت کے مُطابق گھٹنے بڑھنے دے۔ گورنمنٹ نے اس کام کو اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے۔ چند اصولوں کو مدّ نظر رکھ کر گورنمنٹ روپیہ کی قیمت انگریزی سکّہ میں رکھ دیتی ہے۔ لڑائی سے پہلے ایک پونڈ کی قیمت ۱۵ روپیہ تھی یعنی ایک روپیہ سولہ پنس کے برابر تھا۔ گورنمنٹ نے یہ انتظام کیا ہوا تھا۔ کہ اگر روپیہ کی قیمت سولہ پنس سے بڑھ جاوے یعنی اگر ولایت والوں کو ایک پونڈ کے ۱۵ روپے بازار میں نہ ملیں۔ تو وزیر ہند ہر ایک آدمی کو اس قیمت پر روپے دینے کو تیار رکھتا +

اس کا فائدہ یہ بتلایا جاتا ہے۔ کہ روپیہ کی قیمت بڑھے گی نہیں۔ اور تاجروں کے فیصلوں میں کوئی دقت نہ ہوگی۔ دوسری طرف اگر روپیہ کی قیمت ۱۶ پنس سے کم ہو جاوے

تو گورنمنٹ ہند صاحب وزیر ہند کی اجازت سے لوگوں کو ایک روپیہ کے ۱۶ اپنس دینے کو تیار تھی - وزیر ہند کے پونڈوں کے سودوں کو کونسل بل کہتے ہیں - اور گورنمنٹ ہند کے سودوں کو ریورس (الٹے) کونسل بل +

اُوپر کے بیان سے صاف ظاہر ہے - کہ جب کبھی روپیہ کی قیمت ۱۶ اپنس سے کم ہو جاوے تو گورنمنٹ کو روپیہ کے ۱۶ اپنس دینے میں گھاٹا ہے - دوسری طرف اگر ایک روپیہ کی قیمت ۱۶ اپنس سے زیادہ ہو جاوے یعنی ایک پونڈ کی قیمت ۱۵ روپے سے گر جاوے - تو گورنمنٹ کے اس خزانے کی قیمت جو پونڈوں میں تھی کم ہو جاوے گی - دونوں طرح سے گورنمنٹ کو گھاٹا ہی تھا - آخر اس گھاٹے کو پورا کرنے کے لئے کہاں سے روپیہ آتا تھا - اسکا جواب روپیہ کی بازاری قیمت سے معلوم ہوگا - روپیہ کی قیمت خزانے میں ۱۶ اپنس تھی لیکن اس میں چاندی صرف ۹ پنس کی تھی - اس طرح سے گورنمنٹ کو روپیہ بنانے میں نفع تھا ہر ایک روپے کے پیچھے گورنمنٹ کو ۷ پنس کا فائدہ تھا - یہ رقم خزانہ میں ایک جدی مدّ میں رکھی جاتی ہے - اور معمولی آمدنی میں شامل نہیں کی جاتی - اس مدّ میں یہ گھاٹا پورا کیا جاتا ہے - اس کا نام گولڈ سٹینڈرڈ ریزرو (Gold standard Reserve) ہے -

چاندی اور روپیہ کی قیمت کیوں بڑھی

لڑائی شروع ہونے کے وقت یہ حالت تھی - جس وقت لڑائی ہوئی - لنڈن کے دلالوں نے جو سودے غیر ملکوں کے تاجروں سے کئے تھے - ان کا روپیہ انہیں نہ ملا - نتیجہ یہ ہوا - کہ سارے کھلبلی مچ گئی — بینک روپیہ ادا کرنے کے ناقابل تھے - گورنمنٹ نے لاچار ہو کر بینکوں کو کچھ دنوں کے لئے چھٹی دے دی Moratorium سٹاک ایکسچینج بند کر دیئے گئے - بینکوں پر روپیہ اور ریزگاری کے لئے حد درجہ کا مقابلہ شروع ہو گیا - اور آخر گورنمنٹ کو خود میدان میں آنا پڑا +

ہندوستان بہت کچھ اِن حادثات سے محفوظ رہا۔ اگست ۱۹۱۷ء تک ہندوستان کی منڈی میں کچھ شورشرابہ پیدا نہیں ہُوا۔ لیکن اگست ۱۹۱۷ء کے بعد الجھنیں پڑنی شروع ہو گئیں۔ چاندی کی قیمت بڑھنی شروع ہوئی۔ اور اگست میں ہی روپیہ کی قیمت بڑھا کر ۱۶ پنس کرنی پڑی۔ قیمت بڑھتی ہی گئی۔ حتیٰ کہ ۱۲ دسمبر ۱۹۱۹ء کو روپیہ کی قیمت ۲۸ پنس تک آپہنچی۔ جو کہ پہلی قیمتوں سے تقریباً دُگنی ہوگئی۔ آؤ دیکھیں اس کی تہ میں کیا بات تھی۔

(۱) ہندوستان کچی چیزیں بہم پہنچاتا ہے۔ لڑائی کے دِنوں میں اِن چیزوں کے لئے گاہکی زیادہ رہی۔ لیکن دُوسری طرف جن ممالک سے اشیا درآمد آتی تھیں۔ وہ لڑائی کی وجہ سے انہیں بھیج نہ سکتے تھے۔ ہندوستان کی تجارت برآمد بہت زیادہ ہوگئی۔ جس کا نتیجہ یہ ہُوا۔ کہ ہندوستان کے سرمایہ داروں نے ولایت والوں سے روپیہ لینا تو بہت ہُوا۔ لیکن دینا کم۔ اس کا نتیجہ یہ ہُوا۔ کہ پونڈوں کے تمسک بازار میں زیادہ آگئے۔ اور اُن کے گاہک کم۔ قدرتاً پونڈ کی قیمت گر گئی۔ یا دوسرے الفاظ میں روپے کی قیمت بڑھ گئی۔

(۲) وزیرِ ہند کے پاس ایک اور طرف سے پونڈ جمع ہونا شرُوع ہوگئے۔ دولتِ برطانیہ کو ہندوستان سے چیزیں خریدنے کی ضرورت تھی۔ ان کی قیمت اس وقت تک تو ہندوستان میں دی نہیں جاسکتی تھی۔ وہ وزیرِ ہند کو لنڈن میں ادا کر دی گئی۔ اور گورنمنٹ ہند نے ہندوستان میں روپیوں میں ان کی قیمت دی۔ جس کی وجہ سے روپیوں کی مانگ زیادہ ہوگئی اور اُن کی قیمت بھی قدرتاً بڑھ گئی۔

(۳) اِدھر ولایت میں سونا ملنا بند ہوگیا۔ اور باقی مُلکوں نے بھی سونا باہر بھیجنا بند کر دیا۔ جہاں لڑائی سے پہلے پانچ سالوں میں ۱۲ کروڑ پونڈ کا سونا ہندوستان میں کھپت ہُوا تھا۔ وہاں لڑائی کے دِنوں میں صرف ۳ کروڑ ۔ ۱۰ لاکھ پونڈ کا سونا مل سکا۔ ہماری اشیاء برآمد کی قیمت کچھ تو اشیائے درآمد کے تمسکوں سے کٹ جاتی تھی۔ مگر باقی قیمت کی ادائیگی

سونے میں کرنی ہوتی تھی۔ اب ہندوستان کی تجارت برآمد تو بڑھ ہی گئی تھی۔ اِس لئے باقی ملکوں کو ہندوستان کے لئے روپیہ دینا تھا۔ جب سونا نہیں ملا تو چاندی کے لئے ہی کوشش کی گئی۔ اس بڑھی ہوئی مانگ نے چاندی کی قیمت اور اُس کے ذریعے روپے کی قیمت بڑھا دی +

قیمت بدلنے کی کیا ضرورت پڑی؟ اگر جس وقت چاندی کی قیمت ۴۸ پنس فی اونس تھی۔ روپیہ کی قیمت ۱۶ پنس ہی رہنے دیجاتی تھی تو کیونکہ روپیہ میں چاندی کوئی ۲۸ پنس کی تھی۔ جو آدمی روپیہ کو پگھلا لیتا وہ ۱۲ پنس فی روپیہ کا فائدہ اُٹھاتا اور گورنمنٹ کو ہر ایک روپے کے پیچھے ۱۲ آنے کا نقصان اُٹھانا پڑتا۔ لوگوں نے روپیہ پگھلا کر چاندی باہر بھیجنی شروع کر دینی تھی۔ اور گورنمنٹ ہند کے پاس روپیوں کی مانگ بہت زیادہ ہو جاتی۔ یہی وجہ تھی کہ گورنمنٹ نے اعلان کر دیا کہ وزیر ہند ولایت میں روپوں کی ہنڈیاں اِس نرخ پر بیچے گا۔ جس نرخ پر کہ وہ بازار میں چاندی خرید کر روپیہ کو بغیر گھاٹے کے بیچ سکتا ہے۔ اگست ۱۹۱۷ء سے اس اعلان پر عملدر آمد ہونا شروع ہُوا +

اس تبادلہ کے کم و بیش ہونے سے ہمارا بڑا تعلق ہے۔

جنہوں نے ولائتی چیز خریدی ہے۔ وُہ جانتے ہیں۔ کہ کبھی تو شلنگ کے ۱۵ آنے چارج ہوتے تھے۔ کبھی ۱۰ آنے۔ کچھ دن تو ۸ ہی چارج کئے گئے۔ پھر بھلا سائیکلوں کی قیمتیں جو اتنی گر گئی تھیں اس کی کیا وجہ تھی۔ یہ بھی شرح تبادلہ کا ہی ایک ظہور تھا۔ آؤ دیکھیں کس طرح سے ہر ایک آدمی اس شرح تبادلہ سے مُوثر ہوتا ہے +

فرض کرو۔ کاہن برادرس نے ولایت سے ہزار پونڈ کا مال منگوایا۔ اُدھر کسی ولایت کے کارخانہ دار نے ہندوستان سے ہزار پونڈ کی دوائی منگوائی۔ اب دیکھئے جب روپے کی قیمت ۱۶ پنس تھی تو کاہن برادرس کو ہزار پونڈ کے عوض میں ۱۵ ہزار روپیہ دینا پڑتا تھا۔ جب روپے کی قیمت ۲ شلنگ ہوگئی تو کاہن برادرس کو دس ہزار روپیہ دینا پڑا۔ اسطرح

سے دوسری حالت میں اسے ۵۰۰۰ روپیہ کم دینا پڑا +

دوسری طرف اس ہندوستانی دوکاندار کو لیں جس نے ولایت کو ہزار پونڈ کی دوائی بھیجی تھی پہلی حالت میں اسے ۱۵ ہزار روپے ملنے تھے۔ اور پونڈ کی قیمت دس روپے ہونے کی صورت میں اُسے صرف دس ہزار روپے ملے گا۔ بیچارے کو پانچ ہزار ظاہرا گھاٹا پڑ گیا۔ اس طرح سے یہ بات صاف ہو گئی۔ کہ ولایت سے مال منگوانے والوں کو روپے کی قیمت بڑھ جانے سے فائدہ ہے اور ولایت کو مال بھیجنے والوں کو نقصان +

روپیہ کی قیمت بڑھ جانے کا ایک اور فائدہ ہے۔ وہ یہ ہے کہ جب یہاں سے چیزیں بھیجنے والوں کو .... اپنے مال کے عوض کم روپے ملیں گے۔ تو ضرور ہی ان چیزوں کی قیمت یہاں بھی گر جائے گی۔ دوسری طرف ولایت سے منگوائے ہوئے مال کی قیمت تو خود بخود گر جائے گی۔ کیونکہ اُن کی قیمت تو شلنگوں میں ہو گی۔ اور جب شلنگ کی قیمت کم ہو گی تو چیز کی قیمت بھی کم ہو جائے گی۔ ممکن ہے کچھ لوگوں کے دلوں میں یہ خیال پیدا ہو رہا ہو کہ کاغذ پر "تو قیمت گر جائے گی" لکھا ہوا بڑا اچھا معلوم ہوتا ہے لیکن جنگ کے دنوں میں قیمت گری ہوئی بہت کم چیزوں کی دیکھی۔ اسکی وجہ یہ ہے۔ کہ کچھ اور اسباب ایسے پیدا ہو گئے تھے۔ جن کی وجہ سے قیمتوں کی کمی پورے طور پر نمایاں نہ ہو سکی۔ لیکن ہندوستان کے کاشتکاروں کو اس بات سے سراسر نقصان ہے۔ ان کے مال کی قیمت دوسرے ملکوں کی منڈیوں میں گر گئی۔ اور اُنہوں نے نقصان اُٹھایا ہے۔ دوسری طرف باہر سے آئی ہوئی چیزوں کی کم قیمت نے بھی ہماری کئی صنعتوں کو نقصان پہنچایا۔ اگرچہ یہاں بھی یہ بات قابل نوٹ ہے۔ کہ ہماری اشیاء کے لئے باہر کی مانگ اتنی زبردست تھی۔ کہ شرح تبادلہ کا اثر در اصل قیمتیں کم نہیں کر سکا۔ اور اسی طرح باہر کا مال بھی سستا دستیاب نہیں ہو سکا۔ انگریزی

ہم یُوں کہیں گے۔ کہ شرح تبادلہ کا اثر اشیاء درآمد برآمد کی قیمتوں پر potential تھا نہ کہ actual

روپیہ کی بڑھی ہوئی قیمت کے لیئے ایک اور جرمانہ بھی دینا پڑا ہے۔ جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے۔ ہندوستان کی گورنمنٹ نے گورنمنٹ برطانیہ کے لیئے کوئی ۴۰ ملین پونڈ کا مال خریدا تھا۔ یہ روپیہ ولایت میں وزیر ہند کے پاس پڑا تھا۔ نہ معلوم وزیر ہند کو کیا خیال آگیا۔ کہ اُس نے اِس روپے کو ہندوستان بھیجنے کا فوراً انتظام کرنا شروع کر دیا۔ پونڈ کی قیمت گری ہوئی تھی۔ چاہیئے تو یہ تھا۔ کہ وہ گھاٹے کا سودا نہ کرتے لیکن اُس نے اپنے پونڈوں کو ہندوستان میں روپے کی ہُنڈیوں کے بدلے بیچنا شروع کر دیا۔ جن لوگوں نے ہندوستان سے ولایت روپیہ بھیجنا تھا۔ وُہ گورنمنٹ ہند کو کلکتہ میں روپے دے کر اس سے وزیر ہند کے نام پونڈوں میں ہُنڈی خرید لیتے تھے۔ جیسے کہ پہلے بتلایا گیا ہے۔ اس طرح سے پونڈ بیچنے کی ضرورت صرف اُسوقت ہوتی ہے۔ جب شرح تبادلہ گر جائے لیکن شرح تبادلہ کے بُہت زیادہ ہوتے ہوئے بھی گورنمنٹ نے یہ سودے کرنے شروع کر دئیے۔ اور جہاں پونڈ کی قیمت ۱۵ روپے تھی تو اب اُنہوں نے ۹ روپے فی پونڈ تک سودے کئے اور ہر ایک پونڈ کے عوض میں ہند کو ۴ روپے کا گھاٹا پڑا۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ اِسطرح سے ہندوستان کو ۵۰ کروڑ روپیہ کا نقصان ہُوا ہے۔ یہ نقصان ایک اور وجہ سے بڑھ گیا۔ کہ گورنمنٹ نے پونڈ کو بازاری نرخ سے بھی سستا بیچنا شروع کر دیا۔ کہا جاتا ہے کہ روپے کی قیمت ۲ شلنگ کرنیکے لیئے یہ سودے ضروری تھے۔ لیکن کیا ان سودوں کا نتیجہ یہ ہُوا ہے۔ اسوقت روپیہ کی قیمت ۲۰ پنس ہو گئی اور گورنمنٹ کا پچاس کروڑ روپیہ کا نقصان مفت میں ہو گیا ہے۔ گورنمنٹ نے اِسبات کا خیال نہ کیا۔ کہ ہندوستان کی تجارت برآمد پر اِس شرح تبادلہ کا کیا اثر پڑیگا۔ اب جبکہ تجارت برآمد تجارت درآمد سے کم ہو گئی ہے۔ نہ معلوم موجودہ شرح تبادلہ جو ۲۴ پنس فی روپیہ کی بجائے ۲۰ پنس ہے کب تک رہے۔ اور ہندوستان کے سوداگروں کو شرح تبادلہ کے مذاق کا کب تک نقصان اُٹھانا پڑے ÷

کاغذ کا روپیہ یا نوٹ

کرنسی کے بیان میں یہ تو ہم بتا ہی آئے ہیں۔ کہ کس طرح آبادی اور کاروبار کے بڑھنے سے لوگ مجبور ہوئے۔ کہ اُلٹے سٹے کے رواج کو چھوڑ کر سکّے کا استعمال شروع کریں۔ یہ تبدیلی کوئی جلسہ کر کے یا ریزولیوشن پاس کر کے کسی خاص تاریخ سے عمل میں نہیں لائی گئی۔ بلکہ آہستہ آہستہ کسی نہ کسی چیز کا استعمال بطور سکّے کے سوسائٹی میں جاری ہوتا گیا۔ جو چیز بھی ایک مُلک یا گروہ کے حالات کے مُطابق خاص قدر رکھتی تھی۔ پہلے پہل اُسکا استعمال بطور سکّے کے شروع ہؤا اور جن جن میں کوئی نقص ظاہر ہوتا گیا۔ اُس کا تیاگ ہوتا گیا۔ حتّےٰ کہ مہذب دُنیا نے آخر کار سونے چاندی کے استعمال کو موجودہ زمانے میں اِس کام کے لئے سب سے اچھا سمجھا۔ پائدار۔ دلربا۔ کمیاب ہونے کے علاوہ دیکھنے میں بھی خوبصورت ہیں۔ اور زیور وغیرہ بنانے کے بھی استعمال آتی ہیں۔ اِسلئے اگر چاندی یا سونے کے اصلی سکّے پر سے مُہر اُٹھائی بھی جاوے۔ یا راج بدل جاوے تو سکّہ ضائع نہیں جاتا۔ کیونکہ اُس کو پگھلانے سے دھات بازار میں فروخت ہو سکتی ہے۔

لیکن جس طرح سونے چاندی نے باقی چیزوں کو سکّہ کے طور پر برتے جانے سے ردّ کر دیا۔ اُسی طرح اب معلوم ہوتا۔ کہ کاغذ جیسی ہیچ چیز اس کو اپنی پدوی سے گرانے والی ہے۔ کیونکہ نوٹ۔ چیک اور ہنڈیوں کا رواج ہر مہذب مُلک میں بڑھتا جاتا ہے اور آئندہ مُستقبل قریب میں نوٹ ہی آدرش کرنسی ہونگے۔

آبادی تہذیب کے بڑھ جانے سے کاروبار لین دین اور تجارت کی مقدار دن دُگنی اور رات چوگنی بڑھتی جاتی ہے۔ لیکن یہ تبادلہ کا سارا کام کرنے کے لئے سونے چاندی کے سکّوں کی مقدار ناکافی ثابت ہو رہی ہے۔ کیونکہ اِن کی پیداوار میں قدرت کا ہاتھ ہے

اور جہاں جہاں سونے کی کانیں ہیں وہاں سے ہی سونا نکالا جا سکتا ہے۔ اس میں اضافہ نہیں ہو سکتا۔ ویسے بھی سونا چاندی جیسی خوبصورت دھاتوں کو ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں دینا یعنی چیزوں کی خرید و فروخت میں استعمال کرنا کوئی شاعرانہ نقطہ خیال سے اچھا معلوم نہیں ہوتا۔ ان سے بہتر سلوک ہونا چاہئیے۔ سکے گھس گھس کر بھی وزن میں کم ہوتے رہتے ہیں۔ اور اگر ہر ایک سکہ سال بھر میں ایک آنہ یا دو پیسے یا ایک پیسہ ہی گھس کر کم ہوتا ہے۔ تو ایک ملک کے سارے سکوں کے گھسنے کے اعداد جمع کئے جاویں تو لاکھوں روپیہ کا یہ نقصان ملک کو برداشت کرنا پڑتا ہے۔ ایک جگہ سے دوسری جگہ پر لیجانے کی تکلیف۔ خرچ اور بوجھ علیحدہ ہے۔

سونا چاندی کھانے پینے یا اوڑھنے کے کام نہیں آتا۔ یہ اصلی دولت نہیں بلکہ صرف ذریعۂ تبادلہ ہے۔ تو کیا یہ افسوسناک بات معلوم نہیں ہوتی۔ کہ ذریعہ تبادلہ کو حاصل کرنے کے لئے لاکھوں مزدور۔ کروڑوں روپیہ کی مشینیں اور بڑے بڑے اعلےٰ دماغ ماہر کانوں میں اس کو کھودنے کے لئے لگائے جاویں۔ جبکہ اس سے بھی اچھا ذریعہ تبادلہ مل سکتا ہے۔ جس پر خرچ نام کو بھی نہیں آتا۔ اور جس کے ایک جگہ سے دوسری جگہ پر لیجانے کا خرچ اور خطرہ بھی بہت کم ہے اور جسکی مقدار میں حسب ضرورت تجارت اضافہ بھی ہو سکتا ہے۔ کیونکہ وہاں قدرت کا ہاتھ نہیں ان ہی فائدوں کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے سوداگروں اور تاجر لوگوں نے مدت مدید سے ہندوستان میں ہنڈیوں کا رواج شروع کر دیا تھا۔ تاکہ ایک شخص کو ایک شہر سے دوسرے شہر میں خرید و فروخت کے لئے جاتے وقت سکوں کا بوجھ نہ اٹھانا پڑے۔ جس سے اس کی زندگی بھی شاید خطرہ میں پڑ جاوے۔ ایک کاغذ کا پرزہ ان دونوں تکالیف سے بچانے کے لئے کافی تھا۔ ایڈم سمتھ لیجو کہ اقتصادیات کا بانی سمجھا جاتا ہے۔ کہتا ہے کہ کاغذی روپیہ یا نوٹ ایک قسم کی ہوائی سڑک کو

کی مانند ہیں۔ کیونکہ اگر سڑکیں ہوا میں بنائی جاویں تو نیچے والی زمین کے لاکھوں ایکڑ غلہ کی کاشت کے لئے دستیاب رہتے ہیں۔ یعنی اسوقت جو لاکھوں مزدور اور بیشمار روپیہ سونا کھودنے میں لگایا جا رہا ہے۔ یہ سب کچھ ضروریات زندگی مہیا کرنے میں لگایا جا سکتا ہے۔

سب سے پہلی شکل کاغذی روپیہ کی جیسا کہ ہم نے کہا ہے ہنڈی تھی۔ لیکن ہنڈی عام استعمال میں نہیں آسکتی۔ کیونکہ کوئی بھی شخص جو ہنڈی لکھنے والے اور جسکے نام پر لکھی گئی ہو اِن دونوں کو اچھی طرح نہ جانتا ہو۔ اور اُن پر اعتبار نہ ہو۔ لینے کو تیار نہ ہوگا۔ اس لئے روپیہ کی بجگہ لینے کو ہنڈی تیار نہیں ہوسکتی۔ اور نہ ہی اس طرح موجودہ سکوں کے چیک جو بھی ایک قسم کی ہنڈیاں ہی ہیں۔ اس لئے ہم اس جگہ صرف اُن نوٹوں کے متعلق لکھیں گے جو کسی ملک کی گورنمنٹ یا نیم سرکاری بنک یا اُن بنکوں کی طرف سے جاری ہوئے ہوں جن کو گورنمنٹ کی طرف سے اس قسم کی اجازت ملی ہو اور جو ملک میں قانونی سکہ کی حیثیت رکھتے ہوں legal tender۔ جہاں ہم نے نوٹوں کے استعمال کے فائدے بیان کئے ہیں۔ وہاں دھات کے سکے اور نوٹ میں جو فرق ہے اُسپر بھی کچھ کہنا چاہتے ہیں۔

اوّل تو کاغذی روپیہ یا نوٹ کی قیمت ایک ہی نہیں رہ سکتی۔ کیونکہ ان کی قیمت بالکل سرکاری تعلق پر انحصار رکھتی ہے۔ اگر سرکار اُن کے بدلے روپے دینے سے انکار کر دے۔ تو وہ صرف کاغذ کے پرزے رہ جاتے ہیں۔ خاص کر جب راج بدل جاوے یا بدل جانے کی کچھ سمبھاونا ہی ہو تو اِن کاغذ کے نوٹوں کو کوئی پوچھے بھی نہ۔ یہ تکالیف دھات کے سکوں میں نہیں ہیں۔ کیونکہ راج بدل بھی جاوے تب بھی تو سکے پگھلائے جاسکتے ہیں۔ اور دھات بازار میں بک سکتی ہے۔ یا اُس کے بدلے دوسری اشیاء خریدی جاسکتی ہیں۔

نوٹ بین الاقوامی تجارت میں بالکل کام نہیں آسکتے۔ اُن کی قیمت مُلک کے قانون پر منحصر ہے۔ اور جہاں ایک مُلک کا قانون نہیں مانا جاتا۔ وہاں وہ نوٹ بھی صرف کاغذ کے ٹکڑے ہی ہیں۔ سونا چاندی یا سکّے بھی اس کام میں لائے جاسکتے ہیں کیونکہ صرّاف جن کا کام ایک مُلک کے سکّوں کے بدلے دُوسرے ملک کے سکّے دینے ہیں۔ وُہ یہ کام ایک کمیشن کے بدلے کرنے کے لئے ہمیشہ طیار ہوتے ہیں۔ سکّوں میں جتنی جتنی خالص دھات ہوتی ہے۔ اُس کے مُطابق بین الاقوامی تجارت میں اُن کی قیمت مقرر ہو جاتی ہے لیکن کاغذ کے نوٹ کی قیمت تو ایک پائی سے بھی کم ہے +

تیسرے نوٹوں کے جاری کرنے میں ہمیشہ یہ خطرہ رہتا ہے کہ وہ زیادہ تعداد میں جاری کئے جائیں گے۔ اور اس طرح جیسا کہ ہم پہلے بیان کر آئے ہیں۔ وُہ ملک میں قیمتیں بڑھانے کا مُوجب بن جائیں گے۔ سونے چاندی کے سکّوں میں یہ بات نہیں ہے کیونکہ سونا یا چاندی کی مقدار بڑھانی سرکار پر منحصر نہیں +

دراصل بات یہ ہے کہ نوٹوں کا رواج اُسی ملک میں عرُوج پکڑ سکتا ہے۔ جہاں کہ تعلیم عام ہو۔ اوسط آمدنی اچھی ہو۔ اور کاغذی روپیہ کی اقتصادی اہمیّت سے لوگ اچھی طرح واقف ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ یوروپ اور امریکہ میں نوٹوں اور چیکوں کے استعمال کا رواج بہت ترقی پذیر ہو گیا ہے۔ حتیٰ کہ سونے کا سکّہ تمام لین دین میں دیکھنے میں بھی نہیں آتا +

ہندوستان میں پہلے پہل نوٹ ۱۸۰۶ء میں جاری کئے گئے۔ اور اس سال سے لے کر مارچ ۱۸۶۲ء تک سرکار ہند کا نوٹوں کے اجرا کے ساتھ کوئی بڑا زبردست تعلق نہیں تھا یہ نوٹ تین پریزیڈنسی بنکوں اور دوسرے پرائیویٹ بنکوں کی طرف سے جاری کئے جاتے تھے اور اُن کی مقدار کبھی بہت زیادہ نہیں ہوئی۔ کیونکہ یہ نوٹ قانونی سکّہ legal tender نہیں تھے۔ اور سرکار کا کوئی بھی تعلق نہ ہونے سے لوگوں کا اعتبار بھی اُن پر کم تھا۔ دراصل یہ نوٹ انگریزی سوداگروں۔ افسروں اور کلکتہ بمبئی مدراس

بڑے بڑے شہروں میں بیوپار کرنے والے تاجروں کی سہولیت کے لئے مختلف بنک جاری کرتے تھے۔ جس سے کہ اُن کو کچھ منافع بھی بچ رہتا تھا۔ ہندوستانی آبادی میں ان کا رواج بہت کم تھا۔

سنہ ۱۸۶۲ء تک یہ حالت رہی۔ پریزیڈنسی بنکوں کی مجموعی نوٹوں کی مقدار جو کہ وہ جاری کر سکتے تھے۔ اُس وقت ۵ کروڑ روپیہ تھی۔ جس کے بدلے ۱¼ کروڑ روپیہ یا ۲۵ فیصدی اِن بنکوں کو نقدی کی صورت میں رکھنا پڑتا تھا +

نوٹوں کی اِس قلیل تعداد سے ظاہر تھا۔ کہ جب تک گورنمنٹ یہ کام خود اپنے ہاتھ میں نہ لے گی۔ نوٹ ملک میں کبھی ہر دلعزیز نہ ہوسکیں گے۔ چنانچہ بہت سے بحث مباحثہ اور وزیر ہند کے ساتھ خط و کتابت کرنے کے بعد گورنمنٹ ہند نے سنہ ۱۸۶۱ء میں کاغذی سکے کا قانون پاس کیا۔ جس پر عملدرآمد مارچ سنہ ۱۸۶۲ء سے شروع ہوا۔ اِس قانون کی رُو سے ہندوستان میں نوٹ جاری کرنے کا ٹھیکہ گورنمنٹ ہند نے خود اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ کسی پرائیویٹ بنک کو نوٹ جاری کرنے کی اجازت نہ دی گئی۔ جتنے نوٹ سرکار جاری کرے اُن کے بدلے روپے کے پیچھے نقد چاندی یا سونا پیپر کرنسی ریزرو میں رکھنا پڑتا تھا۔ اگرچہ ایک خاص مقدار تک سرکار سکّے کی بجائے سرکاری تمسک بھی رکھ سکتی تھی یہ نوٹ سوائے کرنسی آفس کے جہاں سے وہ جاری کئے جاویں۔ کل برٹش انڈیا میں قانونی سکّہ قرار دئے گئے +

سنہ ۱۸۶۲ء سے سنہ ۱۹۰۸ء تک چالیس سالوں میں کئی ایک قانون پاس کئے گئے۔ اور نوٹوں کی مقدار و سرکاری تمسکات کی مقدار۔ نوٹ جاری کرنے والے سرکلوں کی تعداد میں بڑھاؤ گھٹاؤ ہوتا رہا۔ حتیٰ کہ سنہ ۱۹۱۴ء میں جنگ سے پہلے ہندوستان میں نوٹ سسٹم کی مندرجہ ذیل حالت تھی۔

جہاں سنہ ۱۸۶۲ء میں ۷ کروڑ ۲۳ لاکھ روپیہ کے نوٹ جاری تھے وہاں سنہ ۱۹۱۴ء میں

اُن کی مقدار ۶۶ کروڑ ۱۲ لاکھ تک پہنچ گئی تھی۔ اور اِن نوٹوں کی پُشت پر جو پیپر کرنسی ریزرو تھا۔ اس میں ۴۲ کروڑ ۷۰ لاکھ روپیہ کا چاندی سونا ہندوستان میں اور ۹ کروڑ ۱۵ لاکھ کا سونا ولایت میں رکھا ہُوا تھا۔ باقی ۱۴ کروڑ روپیہ کے نوٹوں کے بدلے سرکار ہند اور سرکار برطانیہ کے قرضہ کے تمسکات تھے۔

۱۸۶۲ء میں جب سرکار نے نوٹ جاری کرنے کا کام خود اپنے ہاتھ میں لیا۔ سارا ملک آٹھ سرکلوں میں تقسیم کیا گیا جو پیچھے صرف سات کئے گئے اور ایک سرکل کا نوٹ دُوسرے سرکل میں قانونی طور پر سرکاری خزانے سے نہیں تُڑایا جا سکتا تھا۔ سرکل مندرجہ ذیل سات شہر تھے۔ کلکتہ۔ مدراس۔ بمبئی۔ لاہور۔ رنگون۔ کانپور اور کراچی یہ بندش شرُوع شروع میں چھوٹے سے چھوٹے نوٹ پر بھی عاید تھی۔ یعنی اگر بمبئی سرکل کا ۵ روپیہ کا نوٹ لاہور سرکل میں کسی کے پاس ہو تو وُہ اُس کے بدلے سرکاری خزانہ یا کرنسی آفس سے روپیہ قانونی طور پر لینے کا مجاز نہیں تھا۔ اگرچہ عام عمل میں انکار کبھی نہیں کیا جاتا تھا۔ یہ بندش چھوٹے نوٹوں کے لئے آہستہ آہستہ اُڑا دی گئی۔

چنانچہ شروع جنگ میں ۵ روپیہ سے لے کر ۱۰۰ روپیہ تک کے نوٹ univer
sal قرار دئے گئے۔ یعنی وہ ہندوستان میں کسی بھی جگہ کرنسی آفس میں تُڑائے جا سکتے تھے۔ ایسا کرنے سے نوٹوں کی ہر دلعزیزی میں بہت اضافہ ہُوا۔ ۱۹۱۳ء کی چیمبرلین کمیشن نے ہندوستان کے نوٹ سسٹم میں چند تبدیلیوں کی سفارش کی جنہیں سے سب سے اہم یہ سفارش تھی۔ کہ پیپر کرنسی ریزرو میں جو نوٹوں کی پُشت پناہ ہے بجائے کچھ مقدار تک تمسک اور بعد ازاں سونا چاندی رکھنے کے۔ سونا چاندی۔ اور کل نوٹوں کی تعداد میں ایک نسبت مقرر کی جاوے جس سے کہ نوٹوں کی مقدار میں اضافہ ہونے کے ساتھ ساتھ کرنسی ریزرو میں تمسکات کی مقدار بھی خود بخود بڑھائی جا سکے۔ اس سفارش پر ابھی عملدرآمد نہیں ہو سکا تھا کہ جنگ شروع ہو گیا۔

جنگ کے سال ہندوستان کے نوٹ سسٹم کے لئے بڑے دلچسپ ہیں۔ ایک وقت تو ایسا بھی آیا تھا۔ جبکہ اندیشہ تھا۔ کہ سرکار نوٹوں کے بدلے چاندی دینے کے بالکل ناقابل ہو جاوے گی۔ اور نوٹوں کی ہردلعزیزی کو سخت دھکا لگے گا۔ لیکن امریکہ کی بروقت امداد سے یہ بلا ٹل گئی۔ جنگ سے جرمنی۔ فرانس۔ اور روس اور یوروپ کے دوسرے ممالک کے نوٹ سسٹم کو جو نقصان پہنچا ہے۔ اُس کا دسواں حصّہ بھی ہندوستانی نوٹ سسٹم کو نقصان نہیں پہنچا۔ جنگ کی خبر آنے کے ساتھ ہی لوگوں نے نوٹ طلب کرنے شروع کر دئے۔ لیکن چونکہ روپیہ لینے میں تکلیف نہ ہوئی۔ اس لئے جلدی ہی لوگوں کو پھر سے اعتبار جم گیا۔ اور کاروبار کے بڑھاؤ کے ساتھ نوٹوں کی مقدار میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ چاندی کی قلّت کی وجہ سے سرکار کی طرف سے بھی یہ کوشش رہی۔ کہ روپیہ کی جگہ نوٹ بڑھتی ہوئی مقداروں میں جاری کئے جاویں +

اسی غرض سے ایک روپیہ اور ۲½ روپیہ کے نوٹ دسمبر ۱۹۱۷ء اور جنوری ۱۹۱۸ء میں بالترتیب جاری کئے گئے ۔ ۳۱ مارچ ۱۹۱۴ء سے ۳۱ مارچ ۱۹۱۹ء تک نوٹوں کی مقدار ۶۶ کروڑ روپیہ سے ایک ارب ۵۳ کروڑ روپیہ تک پہنچ گئی۔ گویا نوٹوں کی مقدار میں ۱۳۲ فیصدی کا اضافہ ہؤا۔

لیکن چاندی اور اس لئے روپیہ کی کمی کے ساتھ خطرہ رونما ہو گیا۔ اور سارے ملک میں نوٹ پر Discount یعنی "دٹا" شروع ہو گیا۔ کریانہ کے سکّے بھی مانگ کی نسبت کم تھے۔ جس سے کہ کئی جگہوں پر ڈاکخانہ کے ٹکٹوں سے اُن کا کام لینا پڑ گیا۔ دراصل بات یہ تھی۔ کہ لوگوں نے روپیہ اور چاندی کی قلّت کی وجہ سے چھوٹے سکّے بھی دفن کرنے اور گھروں میں جمع کرنے شروع کر دیئے +

لوگوں نے کرنسی آفسوں سے نوٹوں کے بدلے روپے لینے دھڑا دھڑ شرو‌ع کر دئے۔ جس سے یہ خطرہ پیدا ہو گیا۔ کہ مبادا روپیہ کرنسی ریزرو میں بالکل ہی نہ رہے

اور سرکار کو اس بات کا اعلان کرنا پڑے۔ کہ نوٹوں کی جگہ روپیہ نہیں دیا جائے گا +

اس خطرہ کو دور کرنے کے لئے سونا چاندی کا ایک جگہ سے دُوسری جگہ پر لیجانا منع کیا گیا اور اس طرح سوائے کرنسی آفس کے جہاں سرکار کو قانوناً مجبور کیا جا سکتا ہے۔ باقی سرکاری خزانوں سے نوٹوں کے بدلے روپیہ دیا جانا بند کیا گیا۔ کرنسی آفس میں بھی ایک مقدار مقرر کی گئی۔ جس سے زیادہ ایک دن میں ایک شخص کو روپیہ نہیں ملتا تھا +

لیکن جیسا کہ ہر ایک آدمی سمجھ سکتا ہے۔ ان بندشوں سے خطرہ کم ہونے کی بجائے بڑھ جاتا ہے۔ اور نوٹوں پر اعتبار اور بھی کم ہو جاتا ہے۔ اس لئے سرکار ہند نے سرکار برطانیہ کی معرفت امریکہ کی گورنمنٹ سے چاندی خریدنے کی کوشش کی جس میں وہ کامیاب ہو گئی۔ اور اس طرح خطرہ کچھ کم ہُوا +

جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے۔ جنگ سے پہلے قانوناً سرکار ہند پیپر کرنسی ریزرو میں ۱۴ کروڑ روپیہ کے تمسکات رکھ سکتی تھی۔ باقی کل ریزرو میں سونا یا چاندی رکھنا پڑتا تھا اب دورانِ جنگ میں جب نوٹوں کی مقدار میں اضافہ کرنا ضروری ہوا۔ اور جبکہ اُسی وقت سونا اور چاندی باہر سے دستیاب ہونا مشکل ہو گیا۔ یہ بندش دُور کرنی پڑی۔ کیونکہ اس بندش کے ہوتے ہوئے سرکار کو ہر ایک ۵ روپیہ کے نوٹ کے بدلے نو روپیہ نقدی کی صورت میں ریزرو میں رکھنا پڑتا تھا۔ جس سے کہ نقدی کی قلت کو دور کرنے کی بجائے نقدی کے لئے اور بھی مانگ بڑھ جاتی۔ اس بندش کے دُور کرنے کے لئے ۱۹۱۵ء سے ۱۹۱۹ء تک سرکار کو چھ مرتبہ قانون میں تبدیلی کرنی پڑی۔ حتیٰ کہ قانون نمبر ۲ ۱۹۱۹ء کی رُو سے سرکار ہند کو اجازت دی گئی۔ کہ وہ کرنسی ریزرو میں ایک ارب روپیہ کے تمسکات رکھ سکے۔ جن میں سے ۸۶ کروڑ کے تمسکات سرکار برطانیہ کے ہوں۔ دوسرے صاف الفاظ میں اس کا مطلب یہ تھا۔ کہ سرکار ہند کو اب نوٹ جاری کرتے ہوئے نقدی نہیں رکھنی پڑتی تھی۔ چنانچہ ۱۹۱۹ء میں ایک ارب ۵۳ کروڑ ۹۶ لاکھ روپیہ کے نوٹوں

کے بدلے کرنسی ریزرو میں صرف ۵۴ کروڑ ۸۸ لاکھ روپیہ سونے چاندی کی صورت میں تھا
اور ۹۸ کروڑ ۵۸ لاکھ کے تمسکات تھے۔ جن میں سرکار ہند کے اپنے تمسکات بھی شامل تھے
سنہ ۱۹۲۰ء کی کرنسی کمیٹی نے اس سارے معاملہ پر غور کرکے رپورٹ کی ہے کہ کُل نوٹوں کا کم از
کم ۴۰ فیصدی نقدی کی صورت میں کرنسی ریزرو میں رکھنا چاہیئے۔ ان کی رائے میں نوٹوں
کو Commercial رکھنے میں بہ نسبت تمسکات اور نقدی کی ریزرو میں کافی ہے۔

اس ساری ہسٹری پر غور کرنے سے یہ معلوم ہوگا۔ کہ پچھلے دس بارہ سالوں میں نوٹوں
کی تعداد مقدار اور ہر دلعزیزی میں بہت ترقی ہوئی ہے۔ نوٹ اب اسی شک کی نگاہ
سے نہیں دیکھے جاتے۔ جس سے وہ پہلے دیکھے جاتے تھے۔ اگرچہ شہروں سے دُور اُفتادہ
دیہات میں اب بھی لین دین میں اُن کے برتنے میں تکلیف ہے۔ نوٹوں کے رواج پانے
سے سونے چاندی کو زمین میں دفن کرنے کا رواج بھی ایک گونا کم ہو گیا ہے۔ لیکن
باوجود ان حوصلہ افزا باتوں کے اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ کہ ملک میں نوٹوں کے
اجراء میں پچھلے چند سالوں میں زیادہ سرگرمی سے کام لیا گیا ہے۔ جو خطرہ سے خالی نہیں ہے
کیونکہ ملک کی کثیر آبادی ان پڑھ اور قدامت پسند ہے اور کاغذی روپیہ کے فوائد اُنکے
ذہن نشین نہیں ہوئے۔ اَن پڑھ لوگ تو ایک طرف بیشمار پڑھے لکھے ہوئے ہندوستانیوں
کے دل میں بھی یہ شک ہے۔ کہ سرکار کاغذ کے نوٹ جاری کرکے سونا چاندی مُلک سے
باہر نکال کرلے جا رہی ہے۔ اس لیئے ضرورت ہے کہ اس طرف آہستہ آہستہ قدم اُٹھایا جاوے
نوٹ جاری کرنے میں سرکار کو بھی فائدہ ہے۔ کرنسی ریزرو میں جو تمسکات رکھے جاویں
اُن پر سُود آتا ہے۔ نوٹ چھپوانے میں خرچ کچھ بھی نہیں۔ اور جب کبھی کوئی چیز سرکار
نے خریدنی ہو یا اپنے نوکروں کو تنخواہیں دینی ہوں۔ تو اس کا آسان طریقہ یہ ہے کہ
نوٹ چھپوا کر سرکار قیمتیں اور تنخواہیں دینی شروع کردے۔ اب اگر سرکار قانوناً مجبور ہو
کہ ایک مقررہ مقدار کے بعد ہر ایک نوٹ کے پیچھے نقدی ریزرو میں رکھے تو اس میں

چنداں حرج نہیں۔ کیونکہ نوٹ اُس وقت ریزرو میں پڑے ہوئے سونے چاندی
کو Represent کرتا ہے۔ یعنی اُس کی نمائندگی کرتا ہے۔ لیکن اگر سرکار خود
ہی قانون پاس کر کے جب چاہے ریزرو میں رکھنے والی نقدی کی مقدار کو گھٹا سکے۔ یا
اور اس قسم کی بندشوں سے اپنے آپ کو آزاد کر لے تو یہ ایک خطرناک بات ہو جاتی ہے
کیونکہ اس کا مطلب یہ ہو جاتا ہے۔ کہ جب کبھی بھی سرکار کے خزانے میں روپیہ پیسہ نہ
رہے یا بجٹ میں گھاٹا پڑے۔ تب ہی سرکار اس گھاٹے کو نئے نوٹ جاری کر کے پورا
کر سکتی ہے ٭

یہی بات سرکار ہند پچھلے جنگ کے سالوں میں کرتی رہی ہے۔ اور یہی بات جرمنی
اور رُوس والوں نے کی اور کر رہے ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا ہے۔ کہ جرمنی اور روس
کے کاغذی سکے کی قدر قیمت اُس کاغذ کے ٹکڑے کی قیمت کے برابر بھی نہیں رہی۔
جس پر وہ سکے چھاپے جاتے ہیں ٭

نوٹ زیادہ مقدار میں اور آسانی چھاپنے کا یہ بھی نقصان رہتا ہے۔ کہ سکوں
کی تعداد (کاغذی اور دھات کے) بڑھ جاتی ہے۔ اور جیسا کہ ہم پہلے بیان کر آئے
ہیں۔ اُس سے چیزوں کی قیمتوں میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ جو کہ عوام کے لئے ایک دکھ
کی بات ہے۔ موجودہ گرانی اشیاء میں گورنمنٹ ہند کی زیادہ نوٹ جاری کرنے کی
پالیسی بھی کچھ حد تک ذمہ وار ہے۔ انگریزی میں اس پالیسی کو Inflation
of currency کہتے ہیں۔ نوٹ واپس لینے اور دھات کے سکے ان کے بدلے
جاری کرنے سے سکوں کی مقدار میں کمی کر کے سرکار ہند بڑھتی ہوئی گرانی کو کچھ حد
تک روک سکتی ہے ٭

بینک

موجودہ تہذیب نے اپنی روزمرہ کی تجارتی اور کاروباری ضروریات کے لئے جس
چیز کا سب سے زیادہ سہارا لیا ہے۔ وہ بینک ہے پیشتر جن لوگوں کے پاس کافی روپیہ
نہیں ہوتا تھا۔ وہ تجارتی یا صنعتی کاروبار کرنے کے بالکل ناقابل تھے کیونکہ قرض لے کر
کام کرنا بڑا ہی مہنگا تھا۔ موجودہ زمانہ میں مختلف کمپنیوں اور کارخانوں نے اپنا کام اس قدر
بڑھا رکھا ہے۔ کہ ان کے لئے سارا کا سارا روپیہ نقد مہیا کرنا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے
اس لئے جہاں اب مشترکہ سرمائے کی کمپنیاں اور کارخانے کھل رہے ہیں وہاں بینکوں سے
روپیہ قرض لے کر کام کرنے کا حلقہ بھی بہت وسیع ہو رہا ہے۔ اب مختلف آدمیوں کی ہنڈیاں
چلنے کے بجائے بینکوں کی ہنڈیاں چلتی ہیں۔ اور چونکہ بینک کروڑوں روپیوں کا کاروبار
کرتے ہیں۔ اس لئے وہ بہت کم سود پر لوگوں کا کام کر سکتے ہیں۔ آپ کو ولایت روپیہ
بھیجنے کی ضرورت ہو تو بینک تھوڑی فیس پر کام کر دیں گے۔ آپ کوئی کارخانہ کھولنا
چاہتے ہیں۔ اس تجویز میں اگر آپ بینک والوں کو اس بات کا یقین دلا سکتے ہیں۔ کہ مجوزہ
کام ضرور نفع خیز ہوگا۔ تو بینک والے آپ کی مدد پر آمادہ ہو جائیں گے۔

اگر آپ مشترکہ سرمائے سے کام کرنا چاہیں۔ تو بینک والے آپ کی کمپنی کے حصے
خرید لیں گے۔ نیز حصص کے فروخت کی کوشش کریں گے۔ اگر آپ تاجر ہیں اور دو ہزار
روپیہ کا مال آپ کے یہاں پڑا ہوا ہے۔ لیکن آپ پندرہ ہزار روپیہ کا سودا اور کرنا چاہتے
ہیں۔ تو بینک والے پہلے مال کی ضمانت پر ایک تمسک لکھا کر بازاری شرح سود پر آپ کو
روپیہ قرض دے دیں گے۔ آپ نے مال فروخت کیا۔ اور آپ کو ۳۰ دن کی میعادی ہنڈی
ملی تو یہ ضروری نہیں۔ کہ آپ اتنے دن انتظار کریں۔ آپ کسی بینک میں جا کر اپنی ہنڈی
فروخت کر سکتے ہیں یعنی آپ کی ہنڈی بازاری شرح سود پر قیمت کاٹ کر خرید لی جائیگی

اور آپ اسی وقت کوئی نیا سودا کر سکیں گے۔ اگر کسی نے مال خریدا ہے اور اس کے عوض ۳۰ دن کی ہُنڈی لکھی ہے۔ اور مال فروخت نہیں ہو سکا۔ تو بھی بینک مدد کے لئے موجود ہیں کیونکہ پرامیسری نوٹ یا کسی چیز کی ضمانت پر رقم مل سکتی ہے۔ بالفرض آپ لکھ پتی یا کروڑ پتی ہیں۔ تو یہ نہیں کر سکتے۔ کہ بازار جاتے وقت اپنے سارے کاروبار کے لئے روپوں کی تھیلیاں ساتھ لیجائے۔ اس کے لئے یہ ہو سکتا ہے۔ کہ آپ روپیہ بینک میں جمع کرا دیجئے۔ آپ کو ایک چیک بُک ملجائے گی جس وقت کسی کو روپیہ ادا کرنا ہو۔ چیک بُک سے ایک صفحہ پھاڑئے اور مقررہ طریقے پر بینک کے نام روپیہ کی ادائیگی کا حکم لکھ دیجئے۔ اگر آپ کو کسی نے چیک دیا ہے تو ضروری نہیں کہ آپ اُسی بینک سے روپیہ لائیں۔ نہیں آپ اپنے بینک میں لائیے۔ آپ کے بینک والے خود حساب سمجھ لیں گے اور روپیہ آپ کو دیدینگے۔ بشرطیکہ آپ یہ یقین دلا سکیں۔ کہ آپ دیوالہ نکالنے والے نہیں ہیں۔ اگر آپ کو کسی کاروبار میں روپیہ لگانا ہے۔ تو بینک والے آپ کو صحیح مشورہ دیں گے۔ اگر آپ زمیندار ہیں۔ اور روپیہ کی ضرورت ہے تو آپ اپنے بینک کو جائیے۔ وہ آپ کو مناسب شرطوں پر روپیہ دے گا۔ اور اُس کی واپسی کے متعلق آپ کے حسب منشا انتظام کر سکے گا۔ غرضیکہ یہ اور اس قسم کی ہزاروں خدمات ہیں۔ جو بینک سرانجام دیتے ہیں۔ اور وہ بھی بالکل معمولی اُجرت پر۔

یہی وجہ ہے۔ کہ ہر ایک تعلیم یافتہ قوم نے بینک کی طرف خاص توجہ دی ہے۔ جاپان میں پہلا بینک ۱۸۷۵ء میں کھلا تھا۔ اور ۱۹۱۵ء میں وہاں ۲۱۲۵ بینک ہو گئے تھے۔ انگلستان کی آبادی کوئی پانچ کروڑ کے قریب ہے۔ لیکن وہاں بینک کے دفتروں کی تعداد ۹۱۴۴ ہے۔ کینیڈا کے ایک کروڑ کی آبادی میں چار ہزار کے قریب بینکوں کی شاخیں ہیں۔ انگلستان کے بینکوں میں جو روپیہ جمع ہے۔ ان کا اوسط ۴۷۰ روپیہ فی کس کے قریب پڑتا ہے۔ ہندوستان کی حالت اس بارے میں قابلِ افسوس ہے۔ ۳۱ کروڑ کی آبادی کے لیے صرف ۱۶۵ مقامات پر بینکوں کا انتظام ہے۔ چھوٹے بڑے بینک شامل کرکے یہاں

۹ ہیڈ آفس ہیں اور قریباً ۳۰۰ بینکوں کی شاخیں کام کر رہی ہیں۔ ۵۰ ہزار سے زائد آبادی والے شہر ہندوستان میں تقریباً ۷۰ ہیں۔ جن میں سے ۱۴ کسی بینک یا اُنکی شاخ سے محرُوم ہیں۔ ۱۰ ہزار سے زائد والے آدمی کے شہروں میں صرف ۲۰ فیصدی بینک ہیں۔ مختلف بینکوں میں جمع شدہ روپیہ کا اوسط ۱۹۱۱ء میں کوئی ۵ روپیہ فی کس پڑتا تھا۔ ہندوستان کے سارے بینکوں میں جتنا روپیہ جمع ہے۔ اُس سے کہیں زیادہ انگلستان کے کئی بینکوں میں فرداً فرداً جمع ہے +

ہندوستان میں تو ایسے بینک بہت کم ہیں۔ جو باقاعدہ طور پر صنعت و حرفت کے کاموں میں ہاتھ لگاتے ہوں۔ جو بینک تجارتی کاروبار میں حصّہ لیتے ہوں۔ اُنکے لیئے ایک لازمی شرط یہ ہے کہ اُنہوں نے ہُنڈیاں ایسے طریقے پر خریدی ہوں۔ جس سے روز بروز اُن کے خزانے میں روپیہ باقاعدہ آتا رہے۔ ایسے بینکوں کے لیئے محفوظ راستہ یہی ہے۔ کہ وُہ لمبی مدّت والے قرض نہ دیں اور اپنے روپیہ کو ایسی چیزوں میں نہ پھنسائیں جنہیں فروخت کرنے میں بہ دقت ہو۔ صنعتی و حرفتی کام کرنے والے بینکوں کو لازمی طور پر کارخانوں اور عمارتوں کی ضمانت پر روپیہ قرض دینا پڑتا ہے۔ اور بیشتر حالتوں میں قرضہ کی میعاد بھی لمبی ہوتی ہے۔ تجربہ سے معلوم ہُوا ہے۔ کہ کسی بینک کے لیئے دونوں کام تجارتی و صنعتی عموماً کرنا خطرہ سے خالی نہیں۔ یہاں تجارتی بینک تو موجود ہیں۔ لیکن دوسری طرح کا کام کرنے والے بینک نہیں ہیں سوائے ٹاٹا انڈسٹریل بینک کے اور ابھی کوئی ایسا نہیں ہے۔ جس کی ساخت مکمل پیمانہ پر کی گئی ہو۔ ٹاٹا انڈسٹریل بینک کے کام کا اندازہ اُس کی مختصر سی زندگی سے نہیں لگایا جا سکتا۔ لیکن مُلک کی بہت سی اُمیدیں اُس سے وابستہ ہیں۔ ضرورت اِس بات کی ہے۔ کہ اسی قسم کے اور بھی بینک مُلک میں قائم کیئے جائیں۔ ہندوستان میں اِس وقت بھی روپیہ موجود ہے۔ جس کے صحیح استعمال کا طریقہ مالکان متعلقہ کو معلوم نہیں۔ اور یہ لوگ روپیہ کو زمین کی خریداری۔ مہاجنی یا سٹابازی

کے کاموں میں لگاتے ہیں۔ لیکن قطع نظر شخصی فائدہ کے اس سے عموماً کسی قسم کا ملکی مفاد
نہیں ہو سکتا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ یہ پس انداختہ روپیہ قومی اور شخصی دونوں فائدوں
کے لیے کام میں لایا جائے اس کی یہ تدبیر ہے کہ ہر بڑے شہر میں بینکوں کی شاخیں
یا بینک ہوں۔ جو مقامی ضروریات کو سمجھتے ہوئے مقامی روپیہ کو نفع بخش بنا سکیں۔
بڑی ضروری بات ایک مرکزی بینک کی قائمی ہے ہر ملک میں ایسی قسم کے بینک ہیں۔
جن پر آڑے وقت چھوٹے چھوٹے بینک بھروسہ کر سکتے ہیں۔ عام خیال ہے کہ اگر ۱۹۱۳ء
میں کوئی ایسا مرکزی بینک ہوتا تو اتنے بینک نہ ٹوٹتے۔ حال میں ایک قانون پاس کیا گیا ہے
جس کی رو سے بنگال بینک۔ بمبئی بینک اور مدراس بینک کو ملا کر ایک مرکزی بینک بنا دیا
جائے گا۔ اس بات کا انتظام کیا گیا ہے کہ اس کے ڈائرکٹروں کے بورڈ پر کچھ ہندوستانی
بھی ہوں۔ اگرچہ ہندوستانی تجارت پیشہ اصحاب اس تعداد کو نہایت قلیل و حقیر
سمجھتے ہیں۔ پھر بھی ہندوستانی ضروریات کیلئے ۵ سال کے اندر اس بینک کی ۱۰۰ شاخیں
کھولی جائیں گی جس سے امید کی جاتی ہے کہ تقریباً ہر ایک ضلع کے صدر مقام میں
کسی نہ کسی بینک کی شاخ ضرور قائم ہو جائے گی تیسری بڑی ضروری بات ہندوستانیوں
کو بینکنگ کا کام سکھلانے کے متعلق انتظام کرنا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ مجوزہ مرکزی بینک
اس کام کو بھی پورا کر سکے گا۔ اس وقت مسٹر لوکھن والا کے سوا۔ جو بمبئی کے ایک مشہور
بینک کے منیجر ہیں۔ بہت کم ہندوستانی ایسے ہیں۔ جنہیں اس جانب اپنی قابلیت دکھانے
کا موقع دیا گیا ہو۔ پنجاب نے اس بارہ میں کافی کام کیا ہے لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ
یہاں بینکنگ کا کام بخوبی سکھلائے جانے کا کوئی بندوبست کیا گیا ہے۔ ضرورت ہے
کہ کامرشل کالجوں وغیرہ میں بینکنگ کے جملہ اصولوں کی تعلیم دی جائے اور پھر کسی بینک میں
عملی کام سیکھنے کا انتظام کیا جائے۔ کیا یہ امید کی جا سکتی ہے کہ مجوزہ مرکزی بینک
سے ایسے طلباء پر آزادانہ کام سکھلانے کا کام لیا جا سکے گا ؟

انڈسٹریل بنکوں کے متعلق پہلے کہا جاچکا ہے - علاوہ بریں یہ بھی ضروری ہے - کہ مختلف ضروریات کو مدنظر رکھتے ہوئے مختلف قسم کے بینک کھولے جائیں - زمینداروں کے لئے تو کہیں کہیں کچھ زمینداری بینک کھل رہے ہیں - اور گورنمنٹ اس کام میں دلچسپی بھی لے رہی ہے لیکن عموماً ہر شخص کا اور خصوصاً ساہوکاران کا اس وقت تک یہ خیال ہے - کہ یہ بینک مؤخرالذکر کو تنگ کرنے کی نیت سے کھولے جارہے ہیں - پس ضروری ہے کہ روپیہ کمانے کے نئے طریقے بتلائے جاکر مہاجنوں کو بھی اس کام میں شریک کر لیا جاوے تو وہ بھی ایسے کاموں میں رکاوٹ ڈالنے کی بجائے مدد کرنے پر آمادہ ہو جائیں گے +

اگر ان باتوں کا مکمل بندوبست ہو جائے - تو ملک کی تجارت و صنعت و حرفت کو ایک بڑی قوت بخش تحریک ملے گی - اور ہندوستان بھی کاروباری دنیا میں اپنی جگہ لینے کے جلدی قابل ہو جائے گا +

ملک میں جو اس وقت مختلف بینک کام کر رہے ہیں اُنکی مختصر تاریخ اور حالات پر نظر ڈالنی خالی از دلچسپی نہ ہوگی

ہندوستان میں چار قسم کے بینک کام کرتے ہیں :-

(۱) دیسی بینکرز یعنی صراف مہاجن اور ساہوکار لوگ جن کی ہنڈیاں سارے ملک میں لاکھوں کا بیوپار چلاتی ہیں - جو گاؤں گاؤں اور قصبہ قصبہ میں اب بھی زمینداروں کی پشت پناہ ہیں - اور جن کے بغیر ہندوستانی تجارت بہت کم ہو جاوے - مارواڑ کے مارواڑی - جنوبی ہند کے چیٹی - بمبئی اور گجرات کے پارسی اور بھاٹیہ لوگ اور شمالی ہند کے مہاجن خاص طور پر یہ ساہوکارہ چلا رہے ہیں +

(۲) دوسرے درجہ پر تین پریذیڈنسی بینک مدراس بمبئی اور کلکتہ والے ہیں - جو کہ اب

سارے ملکر نیم سرکاری امپیریل بینک آف انڈیا بن گئے ہیں۔ جس کا ذکر ہم نے پچھلے صفحہ پر کیا ہے۔ بنگال بینک ۱۸۰۶ء میں کھولا گیا۔ بمبئی بینک ۱۸۴۰ء میں اور مدراس بنک ۱۸۴۳ء میں۔ یہ بنک نیم سرکاری بنک تھے اور ۱۸۶۶ء تک سرکار ہند بہت سا خزانہ کا روپیہ ان کے پاس رکھتی رہی۔ لیکن ۱۸۷۴ء میں روپیہ لینے میں وقت واقع ہوئی اس لئے آئندہ روپیہ رکھنا بند کر دیا گیا۔ ۱۸۷۶ء کے قانون کے ماتحت ان بینکوں کے کام وغیرہ پر چند شرائط بھی عاید کر دی گئیں اور یہ بھی ٹھیکہ کیا۔ کہ گورنمنٹ ان بینکوں میں کئی لاکھ روپیہ امانتاً ضرور رکھا کرے گی۔ اور اگر ایسا نہ کر سکے تو بینک کو عوضانہ دینے کی ذمہ وار ہو گی +

ہندوستانی نکتۂ خیال سے یہ بینک اگرچہ نیم سرکاری گنے جاتے تھے۔ اور ملک کے روپے ان کے خزانوں میں رکھے جاتے تھے یا دوسرے الفاظ میں سرکار انکی سرپرستی کرتی تھی +

لیکن یہ بینک عملاً ہندوستانیوں سے بہت کم لین دین کرتے تھے۔ زیادہ تر سہولتیں یہ یوروپین تاجروں اور سوداگروں کو ہی مہیا کرتے تھے۔ ہم امید کرتے ہیں۔ کہ اب جبکہ ایک ہی بینک بن گیا ہے۔ اور چند ڈائرکٹر بھی ہندوستانی ہیں۔ ہندوستانی مفاد کا زیادہ دھیان رکھا جاوے گا +

تیسرے گروپ میں exchange بینک یا تبادلہ کے بینک رکھے جا سکتے ہیں۔ جن کے ہیڈ آفس تو ہندوستان سے باہر واقع ہیں۔ اور جو کام ہندوستان اور دوسرے ملکوں میں بھی کرتے ہیں۔ ان میں سے چند بینک تو مثلاً انڈین نیشنل بینک وغیرہ تو زیادہ تر کاروبار ہندوستان میں ہی کرتے ہیں۔ بین الاقوامی تجارت کو نبھانا ان تبادلہ کے بینکوں کا کام ہے۔ ہندوستان میں ہی روپیہ لے کر ولایتی ہنڈی جاری کر دیتے ہیں۔ جس سے باہر سے مال منگوانے والے اپنا قرضہ بیباک کر سکتے ہیں۔ اور

انگریز سوداگروں نے جنہوں نے ہندوستان روپیہ بھیجنا ہوتا ہے انکو پونڈوں کے عوض روپیہ کی ہنڈی دیدیتے ہیں۔ کچھ روپیہ تو اُن کے پاس ولایتی ہنڈی جاری کرتے وقت ہندوستانی سوداگروں سے آجاتا ہے۔ لیکن چونکہ عام طور پر یہ کم ہوتا ہے۔ کیونکہ تجارت درآمد تجارت برآمد سے کہیں کم ہے۔ اس لئے عام طور پر یہ بنک لندن میں وزیر ہند سے کونسل بل خرید لیتے ہیں۔ اور اس طرح ہندوستان میں روپیہ مہیا کرسکتے ہیں۔ ان خرید و فروخت کے سودوں سے اِن بینکوں کو معقول کمشن کی آمدنی ہو جاتی ہے۔ دوسرا معمولی کام بھی کرتے ہیں۔ اور سونے چاندی کی درآمد بھی ہندوستان میں ان کی معرفت ہی ہوتی ہے۔

چوتھی قسم کے ہندوستانی جائنٹ سٹاک بینک یا مشترکہ سرمایہ والے بینک ہیں۔ جو کہ پچھلے سولہ سترہ سال سے ہی شروع ہوئے ہیں ۱۹۱۴-۱۵ء میں اُن کی کل تعداد ۴۷۵ تھی۔ اور اداشدہ سرمایہ صرف تخمیناً ۸ کروڑ روپیہ سودیشی کے ایجی ٹیشن کے ساتھ ان بینکوں کا خوب فروغ ہوا۔ اور لوگ اپنا روپیہ لگانے میں ذرا بھی نہ جھجکے۔ ہندوستانی سوداگروں کو سہولتیں مہیا کرنے میں ان بینکوں نے بڑا کام کیا ہے۔ لیکن ۱۹۱۳ء میں پیپلز بنک آف انڈیا کے فیل ہونے سے جو بینک سارے ملک میں فیل ہو گئے اُس سے کئی سال تک سودیشی بینکوں کو بڑا دھکا لگا ہے فیل ہونے کے کئی ایک اسباب تھے۔ بہت سے بینکوں کے ڈائرکٹر بینک کے کام سے بالکل نابلد تھے اور اس طرح بینک کے کام کو (Control) انتظام میں نہیں رکھ سکتے تھے۔ کئی ایک سٹہ بازی میں بینک کے روپیہ کو ناجائز طور پر استعمال کرنے لگ پڑے۔ اور کئی دوسرے اپنی کامیابی جتلانے کی خاطر منافع ہو یا نہ ہو

سرمایہ سے ہی منافع نکال کر بانٹتے رہے۔ کئی ایک نے اپنا روپیہ ایسی جگہوں پر لگایا ہُوا تھا کہ وُہ جلدی میں دستیاب نہ ہو سکتا تھا۔
کل ۷۸ بینک سارے ہندوستان میں فیل ہوئے۔ اور ان فیل ہونے والے بینکوں کا منظور شدہ سرمایہ اگرچہ پندرہ کروڑ سے زیادہ تھا لیکن ادا شدہ سرمایہ صرف ایک کروڑ چالیس لاکھ روپیہ تھا۔ جو کہ بہت ہی غیر تسلی بخش بات تھی۔ ان ہی سالوں میں کئی ایک دھوکا باز لوگوں نے طرح طرح کے فنڈ جاری کر کے لوگوں کو خوب لوٹا۔ فیل ہونے والے بینکوں میں سے کئی ایک کے بڑے عالیشان نام تھے۔ اگرچہ وُہ نام نہاد کے ہی بینک تھے۔
پیپلز بینک آف انڈیا کے فیل ہونے کی کہانی لالہ ہرکشن لعل کی زبانی منی بینکن کو سنائی گئی تھی۔ لالہ صاحب نے اپنی گواہی میں بیان دیا تھا کہ بینک آف بنگال یا گورنمنٹ اگر ذرا سی بھی مدد کر دیتی تو بینک ہرگز فیل نہ ہوتا۔ اُنہوں نے امداد کے لئے درخواست بھی کر دی تھی۔ لالہ صاحب نے یہ بھی بتایا تھا کہ جب فیل ہونے کی خبر انگریز سوداگروں اور افسروں کو ملی تو لاہور میں انہوں نے خوشی کے جلسے منائے۔ اور سودیشی بینکوں کی صحت کا طنزاً جام پیا۔ اُس وقت کے لاٹ صاحب بہادر اُوڈوائر تھے۔ اور جو چڑھ اور ضد اور نسلی غرور اُن میں تھا۔ اُس سے خیال پڑتا ہے کہ یہ کہانی مبالغہ آمیز نہ تھی۔ بینکوں کے فیل ہونے میں بھی شاید پرماتما کا ہاتھ تھا۔ کیونکہ اس سے کمزور نام نہاد بینکوں کا صفایا ہو گیا۔ اگرچہ ایک دو اچھے بینک بھی ساتھ ہی بیٹھ گئے۔ اور آئندہ کے لئے بینک چلانے والے منتظموں اور روپیہ جمع کرنے والے لوگوں کو ایک اچھا سبق مل گیا۔ گورنمنٹ کو آئندہ کے لئے قانون بنانا پڑا جس سے لوگوں کے مفاد کی حفاظت کی جائے۔ اور

بینکوں کو غلطی سے بچایا جائے +

لوگوں کی سہولت کے لئے سرکاری (Savings Bank) بچت کے بینک بھی جاری ہیں ۱۸۸۲ء سے پہلے یہ کام پریزیڈنسی بینک کرتے تھے - اور جہاں ان کی شاخیں نہیں تھیں وہاں سرکاری خزانے یہ کام کرتے تھے - لیکن اس سال سے یہ کام ڈاکخانے کے سپرد کر دیا گیا جس سے سیونگ کے کام کو بہت ترقی نصیب ہوئی - ۱۹۱۱ء میں ڈاکخانہ کے سیونگ بینک میں ۱۷ کروڑ روپیہ جمع تھا - جس میں سے ۱۵½ کروڑ روپیہ ہندوستانیوں کا تھا - سیونگ بینک کے روپیہ کو سرکار unfunded debt غیر میعادی قرضہ تصور کرتی ہے - اور کام میں لاتی ہے ۱۹۱۴ء میں یہ ۲۴ کروڑ تھا - پریذیڈنسی بینک" مشترکہ سرمایہ والے بینک بھی اپنا اپنا سیونگ بینک رکھتے ہیں +

امپیریل بینک

یورپ کے ہر ایک ملک میں ایک نہ ایک مرکزی بینک ہے - جو ایک طرف گورنمنٹ کے خزانچی کا کام دیتا ہے - اور دوسری طرف ملک بھر کے بینکوں کے لئے آڑے وقت میں سہارا ہوتا ہے - ہندوستان میں ایک ایسی سنستھا کی ضرورت بہت دیر سے محسوس کی جا رہی ہے - گورنمنٹ ہند خود کئی ایسے کام سر انجام دیتی ہے - جو دوسرے ملکوں میں اس قسم کے بینکوں کے ہاتھ میں ہوتے ہیں - یہ ہنڈیاں بیچتی اور خریدتی ہے - اپنے خزانوں میں روپیہ جمع کرتی ہے - خود قرضہ لیتی ہے - اور لوگوں کو قرضہ دیتی ہے - میونسپل کمیٹیاں - ڈسٹرکٹ بورڈ - صوبوں کی گورنمنٹیں

اس سے قرضہ لیا کرتی ہیں۔ اس کے پاس روپیہ بنانے کی بچت کا روپیہ ایک طرف جمع ہے۔ اور نوٹوں کی کفالت کا دوسری طرف۔ پریذیڈنسی بنکوں کے ذریعے گورنمنٹ اپنا تعلق روپیہ کی ہنڈی سے رکھتی تو تھی۔ لیکن یہ تعلق کچھ اتنا گہرا نہیں تھا۔ اور نہ ہی ان بنکوں پر گورنمنٹ کی نگرانی کافی تھی +

سرکاری بنک کا خیال ہندوستان میں سب سے پہلے ۱۸۶۷ء میں پیش کیا گیا تھا۔ اس کے بعد یہ ایک نہ ایک شکل میں لوگوں کے سامنے آتا رہا۔ مدت تک تینوں پریذیڈنسی بنک اور دوسرے یورپین بنک اس خیال کے مخالف رہے۔ بات یہ تھی کہ جتنی سکیمیں بھی اس کے متعلق پیش کی گئیں اُن میں ہر ایک میں ایک نہ ایک شکل میں ان بنکوں کے سود و بیو میں ہاتھ ڈالنے کا سوال تھا۔ اور کوئی سکیم بھی ان لوگوں کو اس بات کی منہ مانگی قیمت دینے کو تیار نہ تھی۔ دوسرے ہندوستانی پبلک رائے ان پریذیڈنسی بنکوں کو ملا کر ایک مرکزی بنک بنانے کے متعلق ہمیشہ ہی لاپرواہی بلکہ مخالفت کا اظہار کرتی رہی۔ جیسا کہ سب سے پہلے کہا جا چکا ہے۔ ہندوستانی سوداگروں میں یہ خیال عام ہے کہ یہ بنک ہندوستانی لوگوں کو قرضہ دینے میں بہت لیت ولعل کرتے تھے صنعتی کمشن کے سامنے شہادت دیتے ہوئے آنریبل مسٹر ہرکشن لعل اور لالہ ملک راج دونوں نے اس بات پر زور دیا تھا کہ پنجاب میں ۱۹۱۳ء میں کئی بنکوں کا دیوالہ نکلنے کی وجہ یہ بھی تھی کہ بنگال بنک نے ان کو مدد دینے سے انکار کر دیا۔ پریذیڈنسی بنکوں کے ڈائرکٹروں میں بھی ہندوستانی کم ہی رہیں اور ۱۹۲۰ء تک مدراس بنک کا ایک بھی ڈائرکٹر ہندوستانی نہیں تھا۔

ہندوستانیوں کو باہر رکھنے کے اس سلوک سے متاثر ہو کر ہندوستانی پبلک رائے ایک جُدے مرکزی بینک کے حق میں رہی۔ اور ۱۹۲۰ء تک اس سوال پر کوئی سمجھوتہ نہ ہو سکا۔

آخر اس سال تینوں پریذیڈنسی بینکوں نے مل کر ایک سکیم تیار کی۔ اور وُہ سکیم ایک بل کی شکل میں مارچ ۱۹۲۰ء میں امپیریل لیجسلیٹو کونسل میں پیش ہوئی۔ گورنمنٹ ہند نے بہت بہت زور ڈالا کہ یہ ویسی کی ویسی ہی کونسل میں پاس ہو جائے لیکن ہندوستانی ممبروں نے اس بات پر زور دیا کہ جلدی نہ کی جائے۔ اور اس سوال پر اچھی طرح سے غور ہو۔ آخر کار ستمبر ۱۹۲۰ء میں یہ بل پاس ہو گیا۔ اور ہندوستانی ممبر سکیم کو کئی پہلوؤں سے ہندوستانی نکتہ نگاہ سے بہتر بنانے میں کامیاب ہو گئے۔ اس بل کے پاس ہو جانے سے تینوں بینکوں کا خاتمہ ہو گیا۔ اور ایک نیا بینک امپیریل بینک کے نام سے ان کی راکھ سے پیدا ہُوا۔ اس بینک کا سرمایہ ۵۰۰ روپیہ کے ۲۲۵۰۰۰ حصوں میں منقسم ہو کر کل ۱۱ کروڑ ۲۵ لاکھ ہے۔ اور اس کا محفوظ شدہ منافع ۴ کروڑ ۵ لاکھ سرمایہ کا کل روپیہ ابھی ساتھ نہیں دیا گیا ہے۔ اور صرف آدھا روپیہ ہی لیا گیا ہے۔ حصّہ دار بنانے وقت ان بینکوں کے حصّہ داروں کو ترجیح دی گئی۔ اور ہر ایک پرانے حصّہ دار کو دو نئے حصّہ خریدنے کی اجازت تھی۔ اس کے علاوہ نئے بینک نے پرانے بینکوں کو ان کا اثاثہ خریدنے پر بھی اس کی موجودہ قیمت لگا کر ہر ایک حصّہ دار کو حصّہ رسدی نذرانہ دیا۔ بینک کا عام انتظام ایک مرکزی بورڈ کے ماتحت ہے۔ پرانے مدراس بنگال۔ اور بمبئی بینکوں کے ڈائرکٹروں کی جگہ اب تینوں جگہ سنتھانیہ بورڈ

ہیں۔ مرکزی بورڈ کے ممبر ۱۵ ہیں۔ ان میں سے ۹ تو ستھانیہ بورڈوں
کے پریذیڈنٹ وائس پریذیڈنٹ اور سکریٹری ہیں۔ اور ۵ ممبر گورنر جنرل
کے نامزد (Nominated) شدہ ہیں۔ ان پانچ میں سے ایک تو
Controller of Currency ہے۔ اور چار ہندوستانی ممبر ہیں
اس بورڈ کے علاوہ اس کے دو Governors ہیں۔ جو روزانہ
کام کے ذمہ دار ہیں۔ اس بورڈ کا کام شرح سود کا فیصلہ۔ روپیوں کا
مختلف جگہ ردو بدل اور عام نگرانی ہے۔ اور یہ ہی ہر ایک ہفتے گورنمنٹ
گزٹ میں بینک کے حساب کتاب کی فہرست نکالنے کا ذمہ دار ہے۔
بینک نے اب روپیہ اور نوٹ بنانے کے کام کو چھوڑ کر گورنمنٹ ہند کا
سارا مہاجنی کا کام سنبھال لیا ہے۔ سرکاری قرضہ بھی اب اس کے
ماتحت ہے۔ اس کی ایک شاخ لندن کھول دی گئی ہے۔ جس سے کہ اس
کے ساتھ حساب کتاب رکھنے والے کو ولایت کو روپیہ بھیجنے کی سہولت
ہے۔ ملک میں بینکنگ کی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے پانچ سال کے
عرصہ میں یہ بینک سو شاخیں کھولے گا۔ اور اندازہ یہ ہے کہ ہر ایک ضلع
کے صدر مقام میں اس کی ایک شاخ ہو۔ ہندوستانیوں کو بینکنگ کی
اعلیٰ تعلیم دینے کا بھی اس نے انتظام کیا ہے۔ اور ہر سال ایک خاص
تعداد ایسے آدمیوں کی لی جاتی ہے، جو اس قسم کی تربیت پانا چاہیں جیسا
کہ پہلے کہا جا چکا ہے اس کے مرکزی بورڈ کے پندرہ ممبروں میں سے چار
ہندوستانی ہیں۔ اب مختلف اعلیٰ عہدوں پر بھی ہندوستانی مامور ہونے
شروع کر دئے گئے ہیں۔ اور تھوڑے ہی دن ہوئے کہ کچھ ہندوستانی
بیمہ کی چند شاخوں کے ایجنٹ بنائے گئے تھے۔

یہ سب کچھ ہے۔ لیکن پھر بھی یہ کہنا مشکل ہے کہ بینک اِس معاملہ میں پوری کوشش کر رہا ہے۔ ایک سال کے قریب گزرا جب کہ بینک نے مختلف عہدوں کے لئے آدمیوں کے واسطے اشتہار دیتے وقت ہندوستانی اور انگریز آدمیوں کے لئے خاص طور پر اشتہار دیا تھا۔ یہ صحیح ہے کہ ہم نے ابھی بینکنگ میں بہت کچھ سیکھنا ہے لیکن اس بینک کا بڑا مدعا یہ کام سکھانا ہے۔ امید کی جاتی ہے کہ ہندوستانی ایجنٹوں کی آمد بینک کی پالیسی میں نئے نقطہ نگاہ کو ظاہر کرتی ہے

حصّہ سوئم
دولت کی تقسیم

دولت کی تقسیم

Distribution of wealth

ہم ذرائع پیداوار کے بیان میں لکھ چکے ہیں۔ کہ
کسی چیز کے بنانے یا پیداوار کے لئے چار اشیاء کا ہونا ضروری ہے۔ اوّل
خام مصالحہ جس سے کوئی چیز بنتی ہو۔ دوسرے مزدور یا کام کرنے والا
کاریگر۔ تیسرے سرمایہ جس سے کہ ہماری مراد اوزار مشین وغیرہ سے ہے
چوتھے صنعتی لیڈر جو کہ اپنے دماغ میں اس شے کو بنانے کا نقشہ تیار کرتا ہے۔ اور یہ
فیصلہ کرتا ہے کہ خام مصالحہ کتنا درکار ہوگا۔ اور مزدور کتنے درکار ہونگے مشینوں
اور اوزاروں اور کارخانہ بنانے کے لئے کتنا سرمایہ لگیگا۔ اور ہر ایک فیکٹر کی
مناسب مقدار لے کر کام شروع کرتا ہے۔ اب ان ذرائع پیداوار پر غور کرنے
سے معلوم ہوگا کہ در اصل صرف دو ہی فیکٹرز ہیں۔ یعنی خام مصالحہ اور مزدوری
کیونکہ سرمایہ یعنی مشین وغیرہ تو خام مصالحہ سے مزدور بنا لیتے ہیں۔ اور لیڈر
صرف ایک قسم کی دماغی مزدوری ہے۔ اور در اصل شروع زمانہ میں اور
آج کل بھی ان غیر مہذب ممالک میں جہاں کہ لوگوں کی ضروریات بہت قلیل
ہوں۔ انسانی ضروریات پیدا کرنے میں کچھ بہت سرمایہ اور دماغی لیڈر کی
ضرورت نہیں رہتی۔ ایک وحشی افریقہ کے جنگل میں رہنے والا پیاس لگنے
پر چلتے ہوئے دریا سے پانی پی لیگا۔ اور بھوک لگنے پر درخت سے پھل وغیرہ
توڑ کھائیگا۔ اور اس طرح اس کو کسی سرمایہ کی ضرورت نہ پڑیگی لیکن یہ حالت
بہت دیر تک نہیں رہتی کیونکہ اکثر پھل توڑنے شکار کرنے مکان بنانے
میں دیر لگتی ہے۔ کام بھی اچھا نہیں ہوتا۔ اس لئے انسانی ضروریات خود بخود

شروع شروع ہی میں اُس حبشی کو سکھا دیتی ہیں۔ کہ پھل توڑنے کے لئے وُہ پہلے ایک پتھر کی تلاش کرے۔ یا جانور مارنے کے لئے کسی نوکدار پتھر کے ساتھ لکڑی کا ٹکڑا لگا کر تیر کمان ہی بنالے۔ یا پانی نکالنے کے لئے چمڑے کا بیگ ہی بنالے۔ ان باتوں کے لئے اُس کو وقت صرف کرنا پڑتا ہے اور اپنا آرام چھوڑنا پڑتا ہے۔ لیکن اُس کا معاوضہ پیچھے کافی مل جاتا ہے۔ کیونکہ وہ جہاں پہلے سارا دن دوڑ دھوپ کے بعد کسی پرندے کو یا جانور کو پکڑنے میں کامیاب ہوتا تھا اب صرف ایک دو گھنٹہ کی تلاش اور محنت سے وُہ کئی جانور یا پرندوں کو مار سکتا ہے۔ گویا تیر کمان وغیرہ اوزار بنانے سے اُس کو باقی ساری عمر وقت کی بچت بھی رہی اور ساتھ ہی وُہ اپنی دولت میں بھی اضافہ کر سکا۔ ان ہی فائدوں کی بدولت آہستہ آہستہ دنیا میں جتنی بھی چیزیں بنتی ہیں اوزاروں اور مشینوں کی مدد سے بننی شروع ہوئیں۔ آج کل مہذب ممالک میں یہ ضروری نہیں جیسا کہ سوسائٹی کی ابتدائی حالت میں تھا۔ کہ ہر ایک انسان اپنا وقت صرف کر کے اپنے اوزار خود بنائے اوزار بنانے کے لئے علیحدہ کارخانے ہیں۔ اور جس کے پاس روپیہ ہو وُہ مشین خرید کے کام شروع کر سکتا ہے۔ اس لئے کاروباری دنیا میں آج کل جب ہم سرمایہ کی ضرورت کسی کارخانے کے لئے جتلاتے ہیں تو ہمارا مطلب یہی ہوتا ہے کہ اگر روپے پیسے ہوں تو کام چل سکتا ہے۔

بلکہ آج کل تو بینکوں۔ صرافوں اور ساہوکاروں کے رواج سے یہ بھی ممکن ہو گیا ہے کہ ایک شخص بغیر ایک پیسہ اپنی جیب سے خرچ کئے کارخانہ کھول سکتا ہے۔ اور چلا سکتا ہے۔ بلکہ موجودہ صنعتی دور میں تو یہ ایک مسلمہ ہوتا جاتا ہے۔ کہ روپیہ اُدھار لے کر کام چلایا جاوے۔ اندازہ

کیا گیا ہے کہ انگلینڈ میں جو کارخانہ جات کام کر رہے ہیں۔ اُن میں ساٹھ فیصدی روپیہ اُدھار لیا ہُوا ہے۔ اس کو سامنے رکھتے ہوئے ہم نے چار فیکٹرز پیدائشی دولت کے بنائے ہیں۔ اور سرمایہ دار اور کارخانہ چلانے والے کو علیحدہ علیحدہ بتایا ہے۔ ۱۹۰۰ء سے پہلے یہ حالت نہ تھی۔ اور ہندستان میں تو اب تک بھی نہیں۔ اس وقت سرمایہ دار اور کام چلاؤ کرنے والا ایک ہی شخص ہوتا تھا۔ مشترکہ سرمایہ کی کمپنیاں اور بنکوں کے اجراء سے یہ اب ممکن ہو گیا ہے کہ اگر ایک لائق شخص کسی کام کو چلا کر کامیاب بنا دیوے تو یقین کسی بنکر کو کرا دے تو روپیہ اُس کو مناسب مشرح سود پر مل سکتا ہے۔ اسی طرح پہلے فیکٹرز کی بات بھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ اُس کی اہمیت میں بھی تبدیلی واقع ہو گئی ہے۔ کارخانہ کھولنے کے لئے ضروری نہیں کہ زمین اُس کی اپنی ہو۔ خام مصالحہ وُہ اپنی زمین سے نکالے یا پیدا کرے۔ یا لوہے کوئلے وغیرہ کی کانیں بھی اُس کی اپنی ہوں۔ سب چیزیں کرایہ پر یا ٹھیکہ پر لی جا سکتی ہیں جس کے کہ دو فائدے ہو جاتے ہیں۔ ایک تو مالک زمین یا کان کو گھر بیٹھے ایک مقررہ رقم سالانہ یا ماہواری مل جاتی ہے اور اُس کی چیز نکمی نہیں پڑی رہتی۔ اگر وُہ خود استعمال کرنے یا فائدہ اٹھانے کے قابل نہیں۔ دویم ایک شخص جس کے پاس صنعتی تجربہ اور لیاقت ہے۔ وُہ ایک معمولی عوضانہ کے بدلے کان یا زمین کا استعمال کر کے اپنا کام چلا سکتا ہے اسی طرح نہ صرف دونوں پارٹیوں کو فائدہ پہنچ جاتا ہے۔ بلکہ سوسائٹی بھی منافع میں رہتی ہے۔ کیونکہ قدرت کی عطا کی ہوئی اشیاء کا مناسب استعمال ہو کر دولت میں اضافہ ہوتا ہے۔ یہاں بھی یہ بات یاد رکھنے کے لائق ہے کہ ہندوستانی زراعت میں اس بات کا رواج ابھی بہت زیادہ نہیں کہ مالک زمین اور کاشتکار علیحدہ اشخاص ہوں۔ خود کاشت زمیندار خود ہی مالک ہے اور خود ہی

ولایت اور خاص کر انگلینڈ میں مالک زمین دار اپنی زمین چند
سالوں کے لئے ٹھیکہ دار کو دیدیتا ہے۔ اور اس سے کرایہ وصول کرتا ہے۔ اور
ٹھیکہ دار اپنے مزدور لگا کر کاشت کرواتا ہے۔ اخیر یہ مزدوری کی بات
بھی یہی دیکھا جاتا ہے۔ کہ موجودہ صنعتی دور میں مزدور کا وہ درجہ نہیں۔ جو پہلے
تھا۔ جب گھریلو طریقہ دستکاری جاری تھا اس وقت وہ خود ہی اپنا صنعتی
لیڈر Entrepreneur اور خود ہی مزدور تھا۔ نفع نقصان
اس کے سر پر ہی پڑتا تھا۔ اور اشیاء کے سستا اور مہنگا ہونے کا فوری
اثر اس کی خوشحالی پر ہوتا تھا۔ بلکہ اگر اس سے بھی پہلے زمانے کی طرف جاویں
تو معلوم ہوگا کہ اس وقت مالک زمین۔ سرمایہ دار۔ مزدور اور
صنعتی لیڈر یہ چاروں ایک ہی شخص ہوتا تھا۔ ہندوستان کی زراعت
میں آج تک یہ بات دیکھنے میں آتی ہے۔ زمیندار ہل کنوؤاں اپنی گرہ سے
بنواتا ہے بیج بھی خود ڈالتا ہے محنت مزدوری بھی آپ اور اپنے کنبہ کے
ممبروں سے لیتا ہے۔ اور نفع نقصان برداشت کرتا ہے گویا وہ خود ہی اپنا
مزدور۔ سرمایہ دار اور صنعتی لیڈر ہے۔ لیکن جیسا کہ ہم نے لکھا ہے صنعتی
انقلاب کے رونما ہونے کے دن سے پچھلی صدی ڈیڑھ صدی میں صنعتی دنیا
کی کایا پلٹ گئی ہے۔ اور آج کل جہاں زمین کے مالک علیحدہ ہیں سرمایہ دار
علیحدہ اور صنعتی کام چلانے والے علیحدہ وہاں مزدور بھی علیحدہ ہیں۔ جن کا تعلق
صرف اس بات سے ہے۔ کہ مقررہ گھنٹے کام کر کے مقررہ شرح مزدوری لے کر اپنا
پیٹ پالے۔ کارخانہ کی ملکیت سے اُن کا کوئی تعلق نہیں۔ اس سے مزدور
کو یہ فائدہ پہنچ گیا ہے کہ وہ کارخانہ یا کام کی ذمہ داری سے چھوٹ گیا ہے۔ اور
نقصان سے بری الذمہ ہے۔ مقررہ گھنٹے محنت کی اور سب چھٹی۔ چیز کے

یا نہ بکے نفع ہو یا نقصان۔ ان باتوں سے اس کوئی واسطہ نہیں۔ اور انسانی خصلت بھی اس رواج کو شاید زیادہ پسند کرتی ہے۔ بہت تھوڑے انسان ہوں گے جو اپنے آپ کو فکر و افکار میں ڈالنا چاہتے ہوں۔ انگریزی میں اس کو Risk کہتے ہیں یعنی نامعلوم نتائج کو بھگتنے کی ذمہ داری بہت تھوڑے انسان اٹھانے کو تیار ہوتے ہیں یہی وجہ ہے کہ لائق لائق آدمی سرکاری یا نجی نوکریاں کم تنخواہ پر کرنے کو بھی تیار ہو جاتے ہیں۔ جب کہ وہ بیوپار کاروبار میں زیادہ کما سکتے ہوں۔ دراصل چیز کا بنانا اور اس کا بیچنا یہ دو علیحدہ کام ہیں۔ اور دونوں کے لئے سوسائٹی کو ماہر اشخاص ملنے چاہئیں۔ پرانے طریقہ دستکاری میں یعنی گھریلو طریقہ میں یہ دونوں کام ایک ہی شخص کو مجبوراً کرنے پڑتے تھے۔ جس سے شاید دونوں کام اچھی طرح نہیں ہو سکتے تھے۔ موجودہ فیکٹری سسٹم میں یہ کام علیحدہ علیحدہ اشخاص کے ذمہ ہیں۔ اور شاید اچھی طرح سے کئے جاتے ہیں۔ آج کل بھی ہندوستان میں پرانا طریقہ بہت رائج ہے۔ لیکن اس کا پھولنا پھلنا محال دکھائی دیتا ہے۔ جب تک کہ کوآپریٹو طریقہ سے اس قسم کے مال کی فروخت کرنے کا انتظام نہیں کیا جاتا۔ جس جولاہے کو ایک دو عدد دری یا کھیس بنا کر چار پانچ دن تک بازار میں اٹھا کر پھرنا پڑے اس کو کیا مالی فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ اس کا خیال ناظرین ہی کر سکتے ہیں۔ بناتے وقت بھی یکدلی سے نہیں بنا سکتے۔ کیونکہ فکر دامنگیر رہتا ہے کہ شاید بک سکے یا نہ یا شاید قیمت مناسب نہ ملے۔ خیر جہاں مزدور کو کارخانہ یا کام کی ذمہ داری سے چھٹکارا مل گیا وہاں اس کی پوزیشن بھی سوسائٹی میں قدرے کم ہو گئی ہے۔ آخر کو وہ آج کل دولت کی مشین کا ایک پرزہ

ہی ہے جس جیسے ہزاروں اور پرزے دستیاب ہوسکتے ہیں ۔ وہ مزدوری مجسم ہے اور عام طور پر کارخانہ دار اس کو ایک زندہ انسان جس کے پہلو میں بھی محسوس کرنے والا دل ہے ۔ نہیں سمجھتا ۔ انگریزی میں مزدوروں کو کارخانہ دار ہینڈس (hands) کہتے ہیں ۔ یعنی ہاتھ ۔ اور دراصل اسی نقطہ نظر سے اس کو دیکھتے ہیں ۔ وہ ایسا اوقات بھول جاتے ہیں کہ وہ منہ ۔ دل اور معدہ بھی رکھتے ہیں ۔ اور کہ ان کو بھوک اور پیاس بھی لگتی ہے ۔ اور چونکہ کوئی ایک مزدور ہزاروں میں سے ایک ہے اس لئے اُس کو نوکری سے برخاست کرنے میں تامل بھی نہیں کیا جاتا ۔

خیر ہمارا مطلب اس جگہ موجودہ سسٹم اور پرانے سسٹم کے درمیان مقابلہ کرکے دکھانا نہیں ہے ۔ ہم صرف یہ بات بتانا چاہتے ہیں کہ موجودہ صنعتی دنیا میں مزدور کا رتبہ اور کام وہی نہیں ہے جو پہلے تھا ۔

ہم نے پیداوار کے چاروں ذریعوں یا factors پر ایک سرسری نظر ڈالی ہے ۔ ہمارا مطلب ایسا کرنے سے ناظرین کے دل پر اُن کی اہمیت اور باہمی تعلق کو ذہن نشین کرنیکا تھا ۔

مندرجہ بالا بیان سے یہ صاف ظاہر ہے کہ موجودہ سسٹم میں صنعتی لیڈر ایک مرکز کا کام دیتا ہے ۔ وہ اپنے دل میں کسی چیز کو بنانے کا قصد کرتا ہے ۔ اُس کی بہم رسانی اور مانگ کا مطالعہ کرتا ہے ۔ اور اپنے دماغ میں اس چیز کا ایک مکمل نقشہ تیار کرتا ہے ۔ اور پھر سرمایہ دار سے جس کے پاس کچھ روپیہ ہے لیکن کاروباری لیاقت یا تجربہ نہیں ہے یا کاروبار میں خود پڑکر اپنے روپے کو خطرہ میں ڈالنا نہیں چاہتا وہ روپیہ اُدھار لیتا ہے ۔ اور ایک مقررہ شرح سود اس روپے پر دینے کا اقرار کرتا ہے اس روپیہ سے

وہ کارخانہ بناتا ہے۔ مشینیں اور اوزار خریدتا ہے۔ اور ایک تعداد مزدوروں کی نوکر رکھتا ہے۔ جن کو وہ مزدوری دینی کرتا ہے۔ اسی طرح زمین کا کرایہ وغیرہ دینے کا بھی وہ ذمہ لیتا ہے۔ اور کام شروع کر دیتا ہے۔ اپنی کل آمدنی سے وہ شرح سود۔ تنخواہ اور کرایہ وغیرہ دے کر جو کچھ بچاتا ہے وہ اس کا منافع ہے۔ جس کی کوئی مقررہ مقدار نہیں ہو سکتی۔ ممکن ہے کہ اس کو کچھ بھی نہ بچے۔ ممکن ہے کہ وہ ہزاروں لاکھوں روپیہ چند ہی دنوں میں کما لے۔ یہ منافع اس بات کا معاوضہ ہے کہ اس نے باقی سب فیکٹرز کی نسبت زیادہ رسک (Risk) اٹھایا۔ تقسیم دولت میں عام طور پر اس کا حصہ بھی زیادہ ہی رہتا ہے۔ دنیا میں نوکر یا بادشاہ بھی جو آج کل مہذب دنیا میں تنخواہ دار پردھان ہی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اتنے امیر اور دولتمند نہیں ہو سکتے جتنے کہ کاروباری اور تجارتی آدمی۔ امریکہ کے ارب پتی کارخانوں کے مالک دنیا کے کئی تاجدار بادشاہوں کو اپنے گھروں میں اُن کی موجودہ تنخواہیں دے کر نوکر رکھ سکتے ہیں ÷

ہم نے سرمایہ دار اور کارخانہ چلانے والے اشخاص میں تمیز کی ہے اور ان کو دو فیکٹر بتایا ہے۔ کیونکہ آج کل عام طور پر ایسا ہی دیکھا جاتا ہے۔ پرانا سسٹم بھی کچھ حد تک ساتھ ہی ساتھ جاری ہے۔ جہاں کہ سرمایہ دار ہی کارخانہ چلانے والا ہوتا ہے۔ لیکن ایسا جاننے سے ہماری تقسیم دولت کی تھیوری میں فرق واقع نہیں ہوتا۔ کیونکہ خالص منافع کا اندازہ کرنے میں ہر ایک کاروباری آدمی اپنے گنج سے لگائے ہوئے روپے پر بازاری شرح سود لگا کر اس کو علیحدہ تصور کرتا ہے۔ اور اس طرح فرق صرف اتنا پیدا ہوا کہ سود اور منافع بجائے دو اشخاص

کے پاس جانے کے ایک ہی شخص کے پاس گیا۔ اسی طرح مشترکہ سرمایہ کی کمپنیوں کے اجراسے بھی کفیوری غلط ثابت نہیں ہوتی۔ ان کمپنیوں کی آ۔جا کے اہمیت یہ ہے کہ سرمایہ اور کام اُس کمپنی کے ہاتھ میں ہے جس کو ہم ایک شخص تصور کر سکتے ہیں۔ سرمایہ تھوڑی تھوڑی رقوم میں حصہ داروں سے وصول کیا گیا ہے اور انتظام ڈائرکٹران کے ہاتھ میں ہے جو کہ کمپنی کے تنخواہدار صنعتی لیڈر سمجھے جا سکتے ہیں۔ اور اسی طرح منافع تقسیم کیا جاتا ہے۔ اس میں روپے کا سود اور کام چلانے کا خالص منافع دونوں شامل ہیں ٭

تقسیم دولت پر بحیثیت مجموعی ایک نظر ڈالتے ہوئے اب ہم مزدوری سود۔ کرایہ اور منافع پر علیحدہ علیحدہ بحث کریں گے۔ جس میں کہ ہندوستانی حالات بھی خاص طور پر مدنظر رکھیں گے۔

مزدوری

شرح مزدوری پر بحث کرنے سے پہلے ہم مزدور جماعت کو دو حصوں میں منقسم کر سکتے ہیں۔ عام مزدور جو کہ اپنے جسمانی زور کے ذریعے یا ذاتی خدمات سے روٹی کماتے ہیں اور ہنرمند اور پیشہ ور مزدور ہر ایک ملک میں بھاری تعداد پہلی قسم کے مزدوروں کی ہوتی ہے۔ ہنرمند مزدور قلیل تعداد میں ہوتے ہیں تنخواہ یا مزدوری یا تقسیم دولت میں مزدوروں کا حصہ کس طرح مقرر ہوتا ہے۔ اس کا جواب آسانی سے یوں سمجھ میں آسکتا ہے۔ اگر ہم تصور کر لیں کہ مزدوری بھی ایک عام چیز کی طرح بازار میں فروخت ہوتی جس کی قیمت اس کی مانگ اور بہم رسانی پر منحصر ہے۔ لیکن بازار میں فروخت ہونے والی دوسری اشیاء اور مزدوری میں

یہ فرق ہے کہ مزدوری مزدور سے جو اس کو فروخت کرنے والا ہے جدا نہیں
ہوسکتی۔ جیسا کہ ایک میز میز بیچنے والے سے جدا ہوسکتا ہے۔ اس فرق کا نتیجہ
یہ نکلتا ہے کہ اگر کسی جگہ مزدوری مہنگی بھی ہو تب بھی ممکن ہوسکتا ہے کہ ارد گرد
سے مزدوری کی بہم رسانی اس جگہ پر بڑھ نہ سکے۔ کیونکہ ایسا تب ہی ہوسکتا
ہے جب مزدور اپنے گھر بار چھوڑ کر اور ذاتی قربانیاں کر کے اس جگہ پر
جانے کو تیار ہوں اور یہ دیکھا جاتا ہے کہ انسانی خصلت ایسا کرنے کو جھٹ
پٹ تیار نہیں ہوجاتی۔ میز اگر کسی شہر میں مہنگے فروخت ہو رہے ہوں تو
دوسرے شہروں سے جھٹ پٹ بیوپاری لوگ بہت سے میز بھیج دیں گے
جس سے کہ وہ سستے ہو کر اپنی پرانی قیمت پر آجاویں گے۔ دوسرا فرق یہ ہے
کہ دنیا بھر کی تمام دوسری اشیاء کی نسبت مزدوری سب سے جلدی ہر لحظہ ناش
ہوجانے والی چیز ہے۔ ہر ایک منٹ جو مزدور نکما رہتا ہے وہ اس کے لئے
ضائع ہوجاتا ہے۔ اور پھر واپس نہیں آسکتا۔ اس لئے اس کی کوشش ہوتی
ہے کہ جس قیمت پر بھی ہو وہ اپنی خدمات ضرور بیچ دے۔ میز بیچنے والے کی طرح
وہ اپنی مزدوری کو جمع یا ذخیرہ نہیں کرسکتا۔ جس سے وہ مناسب قیمت
حاصل کرسکے۔ اور جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ دنیا کے ہر ملک میں مزدور جماعت
سب سے غریب جماعت ہے تو یہ بات آسانی سے سمجھ میں آسکتی ہے کہ کیوں
یہ لوگ نہایت قلیل تنخواہیں لینے پر بسا اوقات مجبور ہوجاتے ہیں۔ جبکہ
ذرا سے اڑنے سے وہ معقول گزارہ لے سکتے ہیں۔ اگر ہم ان ایک دو نقطوں
کو مدنظر رکھیں اور ان سے مزدوری کی بہم رسانی پر جو اثر پڑتا ہے اس کو نظر انداز
نہ کریں۔ تو ہم عام طور پر کہہ سکتے ہیں کہ مالک کی طرف سے مزدوری کے لئے آخری
حد اس بات پر منحصر ہے کہ مزدور مالک کے لئے

کتنے پیسے کی مزدوری کر سکتا ہے - یا کتنے کی پیداوار کر سکتا ہے - فرض کرو ایک ترکھان ایک مزدور کو اپنے ماتحت کام پر نوکر رکھتا ہے - اور اُس کو ایک روپیہ روزانہ دیتا ہے - لیکن مزدور نوکر رکھنے سے اُس کی آمدنی میں دو روپے کی بیشی ہو جاتی ہے - چونکہ کئی ایک ضروری کام جو پہلے آدمی کی کمی سے نہ ہو سکتے تھے اب پورے کئے جا سکتے ہیں - تو اس سے ظاہر ہے کہ ترکھان کی خواہش اور مزدور نوکر رکھنے کی ہوگی کیونکہ اُس میں اُس کو منافع ہے - فرض کرو دوسرا آدمی رکھنے سے ڈیڑھ روپیہ اور تیسرا رکھنے سے صرف ایک روپیہ اُس کی آمدنی میں اضافہ ہوتا ہے - (اور آمدنی میں کمی ہونی ضروری ہے کیونکہ اوزار - سرمایہ وغیرہ اُس نے نہیں بڑھایا اور سب سے ضروری کام پہلے مزدور نے کر دیا) - تب یہ امر یقینی ہے کہ ترکھان تین سے زیادہ مزدور نوکر نہیں رکھیگا کیونکہ آخری مزدور جتنا مالک کو کما کر دیتا ہے اتنا ہی بطور تنخواہ کے لے لیتا ہے - اُس کے رکھنے سے اُس کو کچھ نقصان نہیں اور نہ رکھنے سے اُس کے دل کو تسلی نہیں ہوگی - یہ اصول ہے جس سے مزدوری کے لئے کسی کارخانہ صنعت یا پیشہ میں مانگ مقرر ہوتی ہے - اس اصول پر ریاضی کے گُر کی طرح کارخانہ دار عمل نہیں کرتا بلکہ تجربہ اور مشاہدہ اُس کو خود بخود ایسا کرنا سکھلا دیتا ہے - اس مثال سے ایک اور بات بھی واضح ہوگی اور وہ یہ کہ دراصل مزدور کی تنخواہ اُس کے اپنے کام پر منحصر ہے اس لئے اگر مزدور زیادہ efficient یعنی مفید ہو تو اس کی تنخواہ میں اضافہ کی گنجائش ہو سکتی ہے - اُس کو تنخواہ کی صورت میں تقریباً وہی ملیگا جو وہ کارخانہ وغیرہ کے لئے پیدا کریگا - یہی وجہ ہے کہ مغرب

میں مزدوروں کی تنخواہیں معقول ہیں۔ اور ہندوستان میں بہت کم ہندوستانی
مزدور اور خاص کر کارخانوں کے مزدور inefficiency میں
ضرب المثال ہیں۔ مزدوری کی بہم رسانی کا سوال ملک کی آبادی کے
سوال کے ساتھ وابستہ ہے۔ جس پر ہم کسی اور جگہ غور کر آئے ہیں۔
اگر ملک کی آبادی کم ہے جیسا کہ کنیڈا۔ آسٹریلیا۔ اور دوسری برٹش کالونیز
ہیں اور کارخانوں وغیرہ کے لئے پوری تعداد میں مزدور نہیں ملتے تو
شرح مزدوری بڑھ جائیگی۔ اگر آبادی کسی وجہ سے بہت گنجان ہے
اور کام اور نوکریاں حاصل کرنے کے لئے مزدوروں کی طرف سے مقابلہ
بہت ہے تو تنخواہیں کم ہو جاوینگی۔ گویا آبادی کے بڑھاؤ گھٹاؤ کا شرح
مزدوری پر بالواسطہ بھاری اثر پڑتا ہے۔ ریکارڈو کا (جو علم اقتصادیات
کے بانیوں میں سے ایک ہوا ہے) وچار ہے کہ مزدوروں کی قسمت
میں ہمیشہ کے لئے کم از کم گزارہ ہی لکھا ہے۔ کیونکہ اُن کی رائے میں اگر
شرح مزدوری کسی وقت کچھ عرصے کے لئے مانگ کے بڑھ جانے سے بڑھ
بھی جاوے تو یہ دائمی نہیں رہ سکتی کیونکہ اُن کی رائے میں تو یہ تجربہ
بتاتا ہے کہ فارغ البالی کے زمانے میں مزدور زیادہ اولاد پیدا کرتے ہیں۔
اور اس طرح آبادی بڑھجاتی ہے۔ اور مزدوروں کا کچھ عرصہ بعد
پہلے کی طرح پھر سے مقابلہ شروع ہو جاتا ہے۔ جس سے شرح مزدوری
پھر گر کر اپنی پرانی سطح پر آجاتی ہے۔ اس خیال میں سچائی ضرور ہے۔ اور
پسماندہ ممالک پر یہ بات اب بھی حاوی ہے۔ لیکن یہ قاعدہ کلیہ نہیں
ہے۔ شرح مزدوری میں اضافہ یا فارغ البالی دو طرح استعمال میں
لائی جاسکتی ہے۔ ایک تو وہ استعمال ہے جس کی طرف ریکارڈو نے

اشارہ کیا ہے۔ یعنی آبادی کا بڑھ جانا۔ اور دوسرا استعمال یہ ہے کہ مزدور جماعت
اپنے طرز رہائش و زندگی کو اونچا کرلے یعنی اپنی بڑھی ہوئی آمدنی کو اپنے ذاتی
آرام و آسائش پر خرچ کرے۔ اور اس طرح اپنا standard of
living اونچا کرے۔ یہ خیال واقعات پر مبنی ہے۔ یورپ کے کئی
ممالک کی پچھلے پچاس سال کی تواریخ سے یہ بات ثابت ہوتی ہے۔ شرح
مزدوری اور مزدور جماعت کی فارغ البالی میں کئی گنا اضافہ ہوا ہے لیکن
اس کو مزدور جماعت نے اپنے طرز رہائش اور زندگی کو اونچا کرنے میں
استعمال کیا ہے۔ اور آبادی ساکن رہی ہے۔ یا بہت کم بڑھی ہے۔ غربت
سے نکلنے کے لئے ہندوستانی مزدور جماعت کے سامنے بھی یہی رستہ ہے۔ مزدوری
کی مانگ اور بہم رسانی پر یہاں ایک نظر ڈالی گئی ہے۔ اور اس سے ظاہر ہے
کہ کسی پیشہ یا جماعت کے لئے اوسط شرح مزدوری ان دونوں کے موازن
سے تقرر پاتی ہے۔ بعضے مزدور اپنی خاص لیاقت و محنت سے اوسط سے
زیادہ حاصل کر لیتے ہیں۔ اور بہت سے اپنی کم علمی۔ ناواقفیت یا کاہلی
سے اس سے کم۔ ہندوستان کی مزدور پیشہ جماعت اَن پڑھ ہے۔ اس
میں سنگٹھن نام ماتر کو نہیں۔ اور گھر سے ٹلنے کی عادت سے یہ کئی دفعہ دیکھنے میں آتا
ہے کہ ایک جگہ مانگ زیادہ ہے اور اچھی تنخواہ دستیاب ہو سکتی ہے لیکن
باہر سے مزدور آنا نہیں چاہتے۔ یا اُن کو پتہ ہی نہیں لگتا۔ اور اُس جگہ
مزدوری کی کمی ہے۔ اور دوسری طرف مزدوروں کی تعداد کافی سے بڑھ
کر ہے۔ لیکن مانگ نہ ہونے سے وہ کم تنخواہیں لینے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔
اب یہ دونوں حالتیں غیر تسلی بخش ہیں۔ اور اس کا مول کارن ہندوستانی
مزدوروں کی mmo-bility یعنی ایک ہی جگہ رہنے کی عادت لاعلم اور سنگٹھن

نہ رکھنے سے ہندوستانی مزدور اوسط شرح مزدوری سے عام طور کم لینے
کے لئے مجبور ہو جاتا ہے۔ ایک اور بات جو ہندوستانی شرح مزدوری
کے بارے میں یاد رکھنے لائق ہے وہ یہ ہے کہ ملک کے ہر حصے میں
شرح مزدوری کے تقرر میں مقابلے کا اصول کام نہیں دیتا۔ دیہات
میں اور خاص کر شہروں سے دور افتادہ دیہات میں۔ اب بھی رواج
بڑا زبردست ہے۔ اور مزدوروں کو وہی معاوضہ ملتا ہے جو رواجاً ابا و اجداً
کے وقت سے مقرر چلا آتا ہے۔ اس لئے شرح مزدوری کی اوپر بیان کی
ہوئی کیفیت جو مقابلہ Competition کے اصول پر مبنی ہے۔
ہندوستان کے سارے پیشوں مزدور جماعتوں اور حصوں پر اس طرح
حاوی نہیں ہو سکتی جس طرح کہ وہ کارخانوں اور شہروں و قصبوں
کے مزدوروں پر جاری ہو سکتی ہے ؛

ہم نے مزدور جماعت کو دو حصوں میں منقسم کیا ہے۔ مانگ اور
اور ہمسائی کا موازنہ Equilibrium ہی دونوں کی شرح
مزدوری مقرر کرتا ہے۔ لیکن ہنرمند اور پیشہ ور مزدوروں کی ہمسائی
Supply میں صرف معیار زندگی یا standard of
Life ہی اُن کی تعداد کو محدود نہیں کرتا۔ بلکہ تعلیم اور ہنر سیکھنے کا خرچ
بھی (Expense of training) فرض کرو سائٹی
میں سو ڈاکٹروں کی خدمات کی ضرورت ہے۔ سو طالب علم ہی ڈاکٹری کی تعلیم
حاصل کر رہے ہیں۔ اب ڈاکٹر بننے کے لئے ان کو اپنی زندگی کے کئی سال
اور کتنا ہی زر صرف کرنا پڑیگا۔ اور یہ خرچ سب کے لئے یکساں نہیں
ہوگا۔ لائق آدمی تھوڑے سے خرچ سے تعلیم حاصل کر لے گا۔ اور نالائق کو زیادہ

خرچ کرنا پڑیگا۔ اب اگر سوسائٹی کو سو ڈاکٹروں کی ضرورت ہے تو ظاہر ہے کہ ان میں سے نالائق کو بھی نوکر رکھنا ہوگا۔ اور اُس کو کم از کم وہ تنخواہ دینی ہوگی جو اُس کے تعلیم و تربیت کے خرچ کو جو اُس نے کیا ہے پورا کر دے۔ اُس کے بنا سوسائٹی کا گذارہ نہیں۔ یہ بات وکالت۔ انجنیر پروفیسر۔ لوہار۔ ترکھان وغیرہ سب ہنرمند اور پیشہ ور جماعت کے مزدوروں پر یکساں طور پر حاوی ہے۔ اگر وکیلوں کی تعداد کے بڑھ جانے سے اور ان میں مقابلہ شروع ہو جانے سے اُس کی آمدنی میں کمی شروع ہو جاوے حتیٰ کہ margin پہ والے وکیل اتنا بھی نہ کما سکیں جتنا اُن کو وکیل بننے کے لئے روپیہ دماغ اور زندگی کے سالوں کی صورت میں خرچ کرنا پڑا ہے۔ تو چند ایک سالوں میں وکیلوں کی تعداد خود بخود گھٹ جائیگی اور اُن کی آمدنی میں پھر سے اضافہ شروع ہو جاویگا حتیٰ کہ اوسط آمدن پھر سے اتنی ہو جاوے۔ جس سے کہ نالائق شخص کے وکیل بننے کا خرچ پورا ہو سکے۔ جس کی خدمات کی سوسائٹی کو ضرورت ہے۔ اور جس کے بنا کہ گزارہ نہیں ہو سکتا۔

شرح سود

روپیہ کے قرضہ پر سود لینے دینے کا رواج مدت مدید سے چلا آتا ہے۔ اگرچہ یہ بات بھی قابل نوٹ ہے کہ سود خوری پرانے یہودیوں۔ یونانیوں اور یورپ کے ممالک میں ۱۸ صدی تک بھی قانوناً جائز قرار نہیں دی گئی۔ جائز قرار دینا تو کہاں ہر ملک میں سود خوری کے قانون پاس کئے گئے جن کی رُو سے سود لینا جرم قرار دیا گیا۔ صرف ہندوؤں کی مذہبی اور قانونی پستکوں میں شروع سے ہی سود پر روپیہ پیسہ دینا ایک معمولی کاروبار مانا گیا۔ اگرچہ وہاں بھی بندش عاید کی گئی کہ سود اصل سے دگنا کبھی نہ ہونے پاوے۔ وغیرہ۔ پرانے یہودیوں میں یہ رواج تھا کہ ہر ساتویں سال چھٹی کا سال ہوتا تھا۔ یعنی کسی چیز کا خواہ کتنا ہی قرضہ اور سود واجب الادا ہو وہ اصل بمعہ سود کے خود بخود معاف گنا جاتا تھا۔ مسلمانوں میں سود پر روپیہ دینے کے برخلاف شروع سے ہی سخت جذبہ رہا ہے۔ اس طرح یہ بات واضح ہوتی ہے کہ عام طور پر ہر مذہب اور ہر ملک میں سود لینے کے برخلاف کئی سو سال تک ایک جذبہ رہا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بڑے بڑے سخت قانون پاس کئے گئے۔ لیکن حاجت مند اشخاص کو قرضہ لینا ہی پڑتا ہے۔ اور ساہوکار کو کیا ضرورت پڑی ہے کہ وہ بلا سود یا بلامعاوضہ کسی کو اپنا روپیہ دیتا پھرے۔ چنانچہ اگرچہ ہر ملک میں سود خوری کے قانون پاس کئے گئے لیکن سود لینے دینے کا رواج کہیں بھی کم نہ ہوا۔ سود کی تواریخ پڑھنے سے پتا پڑتا ہے کہ کیسے کیسے عجیب و غریب طریقے ایجاد کئے گئے۔ جس سے سود لینے دینے کا رواج بھی جاری رہا اور اس سے قانونی گرفت

بھی نہ ہو +

لیکن سوال یہ ہے کہ جب اور کسی تجارت اور سوداگری کی ممانعت
نہیں کی گئی تو سود لینے کے برخلاف ہر مذہب اور ہر ملک میں اتنا بھاؤ کیوں
رہا ہے۔ اس کا جواب یونان کے مشہور فلاسفر سقراط نے اس طرح دیا ہے
کہ اگر ایک شخص دوسرے کو گندم دے یا گائے بکری ادھار دے تو اس کو
کچھ اصل سے زیادہ ملنا چاہیئے۔ کیونکہ گندم ایک سیر بونے سے کئی سیر
پیدا کی جا سکتی ہے۔ اور اسی طرح ایک گائے یا بکری سے ایک سال
میں دو گائیں اور کئی بکریاں بن سکتی ہیں۔ گویا کہ گندم اور گائے وغیرہ کا
قدرتی بڑھاؤ ہو سکتا ہے لیکن اگر وہ شخص دوسرے کو سو روپیہ نقد ادھار
دے تو اُن سو روپوں کا بڑھاؤ نہیں ہو سکتا۔ سقراط کے الفاظ میں اُن
کے بچے offspring پیدا نہیں ہو سکتے اس لئے روپیہ کے لین
دین پر کوئی معاوضہ روپیہ کے مالک کو نہیں ملنا چاہیئے۔ یہ دلیل کتنی
ہی دلچسپ کیوں نہ ہو دراصل دلیل نہیں کہی جا سکتی۔ روپیہ کو ایک
علیحدہ چیز تصور کر لینے میں سقراط نے غلطی کھائی ہے۔ روپیہ صرف ذریعہ
تبادلہ ہے۔ اور دنیا کی باقی تمام اشیاء کی جو اس سے خریدی جا سکتی
ہیں نمائندگی کرتا ہے۔ سو روپیہ کو بجائے سو روپیہ سمجھنے کے اتنی گائیں
بکریاں یا گندم سمجھنا چاہیئے جو ان سو روپوں سے خریدی جا سکتی ہیں +

امر واقعہ یہ ہے کہ سود کا سوال آج کل اس شکل میں ہمارے سامنے
نہیں ہے جس شکل میں وہ پچھلی صدیوں میں تھا۔ صنعتی انقلاب نے
دنیا کی دولت پیدا کرنے کے ڈھنگ میں تبدیلی کر دی ہے۔ پرانے زمانے
میں گھریلو طریقہ دستکاری جاری تھا۔ کاریگر اپنے گھر میں اپنے بچوں اور

بیوی کی امداد سے ایک چیز بنا کر بازار میں فروخت کر آتا تھا۔ مشینوں کا رواج نہیں تھا سیدھے سادے اوزار جو سستے ہی دستیاب ہو جاتے تھے وہ اُس کا سرمایہ ہوتے تھے۔ اُدھار لینے کی ضرورت پڑتی ہی نہ تھی لیکن آج کل فیکٹری سسٹم کے جاری ہو جانے سے ایک شخص کے لئے اپنا کارخانہ کھولنا مشین خریدنی اور کاروبار چلانا مشکل ہو گیا ہے۔ اُس سارے کام کے لئے سرمایہ اُدھار لینے کی ضرورت ہے جس پر سود ادا کر چکنے کے بعد بھی ایک خاص رقم منافع میں بچ رہتی ہے۔ اس لئے آج کل روپیہ اُدھار لینا اُس کو کسی منافع کے کام میں لگانے کا مترادف ہے۔ جس پر سود دینا کوئی بوجھ نہیں ہے لیکن پرانے زمانے میں قرضہ کاروبار چلانے کے لئے شاذ و نادر ہی لیا جاتا تھا۔ غریب یا تنگدست بھلے مانس آدمی اپنے گھر کے کام چلانے یا خرچ پورا کرنے کے لئے اپنے اڑوس پڑوس سے اُدھار لینے پر مجبور ہوتا تھا جس پر سود لینا اپنے پڑوسی اور ہمسایہ کی مصیبت سے فائدہ اٹھانا تصور کیا جاتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اتنے سو سالوں تک ہر ملک میں سود لینا بُرا گنا گیا۔ ☆

سود کیوں دینا چاہئے۔ یا یہ کس بات کا معاوضہ ہے۔ اس پر بہت سے وچار پرگٹ کئے جاتے ہیں۔ ایک وجہ تو یہ بیان کی جاتی ہے کہ اُدھار لینے والا اُس روپیہ کو استعمال میں لا کر زیادہ روپیہ کما سکتا ہے۔ سود کا وہ ایک سکیم بنا سکتا ہے۔ اس لئے اس آمدن ہی سے کچھ روپے بطور معاوضہ کے مالک روپیہ کو دینے چاہئیں۔ ایسا کرنے سے اُس کا کچھ حرج نہیں۔ کیونکہ اگر روپیہ اس کو اُدھار نہ ملے تو وہ کچھ بھی کما نہ سکیگا۔ مالک روپیہ کو بھی فائدہ رہتا ہے کہ گھر میں کچھ تو وہ گھر بیٹھے

کما لیتا ہے۔ اُس کو کاروبار وغیرہ میں استعمال کرنے کا ڈھنگ تو آتا ہی نہیں اور اگر وُہ اُدھار نہ دے تو روپیہ اُس کے پاس بے فائدہ پڑا رہیگا۔ اس طرح دونوں قرضہ دینے والا اور قرضہ لینے والا فائدہ میں رہتے ہیں۔ اور سوسائٹی کو بھی فائدہ رہتا ہے۔ کیونکہ سرمایہ کا ٹھیک استعمال ہونے سے دولت میں اضافہ ہوتا ہے۔ اس تھیوری کو سود کی Produce-use theory یا -tavity theory کہتے ہیں۔ لیکن اگر سود اس لئے واجب الادا ہے کہ اُدھار لینے والا اس کو استعمال میں لاکر فائدہ اُٹھا سکتا ہے تو کیا لازمی نہیں ہوگا کہ اگر استعمال سے اس کو نقصان رہے تو وُہ سود نہ دے یا اُلٹا عوضانہ مانگے؟ دراصل سود اس لئے واجب الادا ہے کہ روپیہ جمع کرانے والوں کو اپنا موجودہ خرچ گھٹا گھٹا کر روپیہ جمع کرنا پڑتا ہے۔ تاکہ وُہ آئندہ خرچ کر سکیں۔ موجودہ دنیاوی سکھوں سے پرہیز کرنا پڑتا ہے تاکہ موہوم مستقبل میں وُہ خرچ کر سکیں۔ اب یہ مسلّمہ بات ہے کہ موجودہ آدھی روٹی آئندہ کی ساری روٹی سے بہتر ہے۔ یا جیسا کہ کہاوت ہے۔ ہاتھ میں آیا ہوا ایک پرندہ جنگل کے دو پرندوں کے برابر ہے مستقبل ہر ایک کے لئے تاریک ہے۔ ممکن ہے روپیہ جمع کرنے والے کی آمدن میں اتنا اضافہ ہو جائے کہ جمع کئے ہوئے روپے کی اس کو ضرورت ہی نہ پڑ سکے۔ تب اس کو مفت میں افسوس ہوگا کہ پچھلے سالوں میں وُہ اپنا پیٹ کاٹ کر جمع کرتا رہا۔ ممکن ہے کہ اشیا گراں ہو جاویں اور اُس کو افسوس ہو کہ جب چیزیں سستی تھیں تب دل کی تسلّی کیوں نہ کی۔ اور ممکن ہے اُس کی عمر ہی وفا نہ کرے۔ ان وجوہات کی ہی بنا پر یہ انسانی خصلت

کا خاصہ ہے کہ مستقبل کے مقابلہ میں حال کا خرچ زیادہ مرغوب طبع ہے۔ اس لئے ایک شخص جب موجودہ خرچ سے پرہیز کر سکے روپیہ بچا کر دوسرے کو قرض دیتا ہے۔ تو اس کو صرف اصل ہی واپس نہیں ملنا چاہئے بلکہ سود بھی کی صورت میں کچھ معاوضہ بھی ملنا چاہئے۔ شرح سود کے تقرر میں بھی مانگ اور بہم رسانی کی طرف ہم نے دیکھنا ہے۔ سرمایہ کے لئے مانگ کئی ایک باتوں پر انحصار رکھتی ہے۔ مثلاً سرمایہ کا فائدہ مند استعمال آبادی کا بڑھنا سائنس اور ایجادوں کی ترقی۔ اور لوگوں کی ضروریات زندگی میں اضافہ۔ ان باتوں کے سمجھانے کی ضرورت نہیں ہے یہ صاف ظاہر ہے کہ آبادی کے بڑھ جانے یا ضروریات زندگی میں اضافہ ہو جانے سے زیادہ کپڑے خوراک وغیرہ کی ضرورت ہوگی۔ اور اس کے لئے زیادہ سرمایہ کی۔ اس طرح ان کا اثر بالواسطہ سرمایہ کے لئے مانگ پر پڑتا ہے۔

سرمایہ کی بہم رسانی میں لوگوں کی روپیہ جمع کرنے کی خواہش اور طاقت دونوں کا ہم نے مطالعہ کرنا ہے۔ کنجوس کو چھوڑ کر جو روپیہ کو روپیہ کی خاطر جمع کرتا ہے عام دنیاوی اشخاص روپیہ اس لئے بچاتے ہیں کہ وہ آخری عمر میں جب وہ کمانے کے لائق نہیں رہینگے ان کے کام آوے۔ کسی ناگہانی آفت میں پڑ جانے پر ان کا سہارا ہو۔ لڑکے کی تعلیم یا اس کی بیاہ شادی کے اخراجات پورے کرنے کے لئے۔ کسی عمدہ موقع پر کاروبار پر لگانے کے لئے اور بالواسطہ آمدنی کے لئے یعنی سود لینے کی خاطر بھی روپیہ بچایا جاتا ہے۔

روپیہ بچانے کی طاقت یا توفیق تو ان میں ہی ہو سکتی ہے جس کے پاس پہلے ہی بچایا ہوا ہو یا جن کی آمدن معقول ہو۔

یہ بات بھی یہاں ہم واضح کر دینی چاہتے ہیں کہ روپیہ جمع کرنے والوں میں ایک طبقہ ایسا ہے جو خواہ شرح سود کچھ ہی کیوں نہ ہو روپیہ ضرور جمع کرے گا۔ بلکہ اپنے روپیہ کو حفاظت سے رکھنے کے لئے قرض لینے والے کو اپنی جیب سے سود ادا کرنے کو تیار ہو گا۔ امن و امان کے زمانہ میں ایسے لوگوں کی تعداد تھوڑی ہوتی ہے۔ عام روپیہ بچانے والے ایسے اشخاص ہوتے ہیں جو شرح سود کے لالچ سے بچاتے ہیں۔ اور اگر شرح سود بڑھ جائے تو زیادہ بچائیں گے۔ اس لئے عام طور پر دیکھا جاتا ہے کہ جب کبھی شرح سود ملک میں بڑھ گئی ہے لوگوں نے روپیہ زیادہ بچانا شروع کر دیا ہے ؛

اب شرح سود وہ سوسائٹی میں مقرر ہو گی جس پر لوگ اتنا ہی روپیہ بچائیں جتنے کے لئے کہ مانگ ہے مثلاً اگر ایک ملک کی پوزیشن ذیل کے نقشے کے مطابق ہو تو شرح سود تین روپے سینکڑہ سالانہ ہو گی کیونکہ بچت اور مانگ اس شرح پر مساوی ہیں۔ اگر چار فیصدی ہو تو بچت ۵۵ لاکھ روپیہ ہے لیکن اس بڑھی ہوئی شرح پر لوگ صرف ۴۵ لاکھ روپیہ قرض لینے کو تیار ہیں۔ اور اگر ۲ فیصدی ہو تو چونکہ شرح کم ہے لوگ ۶۰ لاکھ تک لینے کے لئے تیار ہیں مگر کوئی روپیہ بچانے والے اس کم شرح پر روپیہ ادھار دینے کو تیار نہیں ہیں۔ اس لئے بہم رسانی صرف ۴۰ لاکھ روپیہ کی ہے۔ دونوں صورتوں میں مقابلہ شرح ہو جاوے گا۔ پہلی صورت میں روپیہ بچانے والوں کی طرف سے اور دوسری صورت میں روپیہ مانگنے والوں کی طرف سے صرف ۳ فیصدی شرح ایسی ہے جہاں بہم رسانی اور مانگ برابر ہیں۔ یا جیسا کہ انگریزی میں

کتنے ہیں Equilibrium میں ہیں۔ اس لئے اس سوسائٹی میں ۳ فیصدی شرح سود قرار پائیگی۔

اعداد لاکھ روپوں میں

شرح سود	روپیہ کی بہم رسانی (سالانہ)	روپیہ کے لئے مانگ (سالانہ)
۵	۱۵	۱۰۰
۱	۲۰	۷۰
۲	۴۰	۶۰
۳	۵۰	۵۰
۴	۵۵	۴۵
۵	۶۰	۴۰

یہ شرح سود خالص شرح سود ہو گی جس کی مثال کہ کسی ملک میں سرکاری قرضہ جات سے واضح ہوتی ہے۔ ساہوکار بینک یا اور اشخاص جو روپیہ کا لین دین کرتے ہیں عام طور پر اس شرح سود سے زیادہ لیتے ہیں کیونکہ وہ خالص شرح سود پر حساب کتاب رکھنے کی تکلیف۔ روپیہ واپس مانگنے اور پھر لگانے اور اس کو خطرہ میں ڈالنے کا معاوضہ بھی شامل کر لیتے ہیں +

منافع

تقسیم دولت میں تیسرا حصہ دار کارخانہ چلانے والا ہے۔ اور موجودہ صنعتی سسٹم میں اس کا درجہ دوسرے سب ساوھنوں سے یعنی فیکٹرز Factors سے زیادہ اہم ہے۔ وہی روپیہ قرض لیتا ہے اور مقررہ شرح سود دینے کی ذمہ واری لیتا ہے۔ مزدوروں کی تنخواہ اس کے ذمہ ہے۔ خام مصالحہ وہ خریدتا ہے۔ اور جب وہ کل آمدنی سے باقی کے

حصہ داروں کو ان کا مقررہ حصہ ادا کر چکتا ہے۔ تو باقیماندہ رقم اُس کا
اپنا عوضانہ ہے۔ اس کو منافع کہتے ہیں۔ جو کہ دراصل Risk یا جوکھم
اُٹھانے کا معاوضہ ہے لیکن شرح سود کی طرح یہاں بھی کارخانہ دار
اپنا منافع خالص منافع سے کئی گنا بڑھا لیتا ہے۔ خریدار کو دھوکا دیکر
منڈی کے حالات سے پوری واقفیت کے سبب مزدوروں اور دوسرے
پیداوار کے سادھنوں کو ان کی اصل قیمت سے کچھ کم دے کر یا آپس میں
اتفاق کرکے اجارہ قائم کرکے اور اور کئی طریقوں سے کارخانہ چلانے والے
اپنا منافع بہت بڑھا لیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اگرچہ دولت کے پیدا کرنے
میں چار سادھن ہیں اور کل آمدن ان چاروں میں ہی تقسیم ہوتی ہے
لیکن ایک سادھن یعنی کارخانہ دار اس تقسیم دولت میں سب سے بڑھ
کر حصہ لے جاتا ہے۔ مزدوروں کی حالت سب سے بڑھ کر خستہ رہتی
ہے کیونکہ ان کو سب سے کم حصہ ملتا ہے

کرایہ یا RENT

پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ نوارنتی طور پر اور بغور مطالعہ کرنے سے بظاہر
ہے کہ دولت پیدا کرنے میں دو ہی چیزیں لازمی ہیں۔ مزدوری اور
قدرت کی دی ہوئی خام اشیاء اور طاقتیں۔ مزدوری کا ہم مطالعہ کر
چکے ہیں۔ قدرتی اشیاء میں قابلِ کاشت زمین دونر دھاتیں
و کوئلہ آبشار۔ قابلِ جہازرانی دریا وغیرہ سب قابل ہیں +
لیکن جن سے ہمیں زیادہ واسطہ پڑتا ہے وہ قابلِ کاشت و قابل
رہائش زمین اور کانیں ہیں۔ اور ان کے متعلق ایک دو باتیں قابل

نوٹ ہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ زمین اور کانیں اور دوسری قدرتی اشیاء جو انسان کے کارآمد ہیں۔ اور Economic goods ہیں۔ مانگ کے مقابلہ میں بہت محدود ہیں۔ اور وہ قدرت کی طرف سے محدود ہیں۔ کپڑا، شیشہ وغیرہ چیزیں بھی محدود ہیں۔ لیکن ان کی مقدار میں جتنا بھی چاہیں اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ لیکن ایک ملک میں زمین اور کانیں نہیں بڑھائی جا سکتیں۔ کپڑا اگر ایک شخص کے پاس ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ دوسرے کے پاس نہ ہو۔ مانگ کے بڑھ جانے سے ان کی بہم رسانی بھی بڑھائی جا سکتی ہے۔ لیکن زمین کا رقبہ محدود ہے۔ آبادی یا مانگ خواہ کتنی ہی بڑھ جائے اس کی مقدار میں اضافہ نہیں ہو سکتا۔ اس لئے اگر ایک شخص اضافہ زمین سے چند ایکڑ اپنے قبضہ میں کر لیتا ہے تو دوسرا ہمیشہ کے لئے اس سے محروم رہ جاتا ہے۔ اور جب سطح زمین ایک دفعہ زمیندار آپس میں بانٹ لیں تو غیر زمیندار اور اُن کی نسلیں ہمیشہ کے لئے زمین کے قبضہ سے محروم رہ جاتی ہیں۔ ایسی بات کو لے کر سوشلسٹ لوگ اس بات کا مطالبہ کرتے ہیں کہ ملک کی زمین پر اشخاص کا قبضہ نہیں ہونا چاہئے۔ اور سوسائٹی کی طرف سے اس کی کاشت وغیرہ کا انتظام ہو۔

دوسری بات زمین کے بارے میں یہ ہے کہ ایک ایکڑ زمین دوسرے ایکڑ زمین سے زرخیزی اور موقع کے لحاظ سے جدا ہے۔ کوئی دو ایکڑ بالکل برابر ایک جیسے نہیں ہو سکتے۔ اور کئی ایکڑ ایسے ہوں گے جو اگرچہ کاشت کئے جاتے ہیں۔ لیکن ان کی پیداوار سے صرف کاشت کا خرچ ہی نکلتا ہے۔ ایسی خراب زمین کے کاشتکاروں کی طرف سے اگر بھی

زرخیز زمین کے کاشتکاروں کے ساتھ مقابلہ شروع ہو جاوے گا جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ زرخیز زمین کے کاشتکار یہ پسند کریں گے۔ کہ مالک زمین کو اپنی بچت میں سے کچھ بطور کرایہ کے دیدیں۔ یہ نسبت اس بات کے کہ وہ زمین کا قبضہ چھوڑ دیں۔ اس کرایہ کی مقدار کیا ہوگی۔ اور آبادی کے بڑھنے سے اس میں اضافہ ہوگا یا کمی۔ اس ساری بحث کو Theory of Rent کہتے ہیں۔ جس پر ہم نے اس فصل میں لکھنا ہے۔

تیسری بات زمین کے بارے میں قابل یادداشت یہ ہے کہ ایک ایکڑ زمین سے یہ ممکن نہیں ہو سکتا کہ جوں جوں اس پر محنت و سرمایہ خرچ کیا جائے توں توں پرانی نسبت سے اس کی پیداوار میں اضافہ ہوتا چلا جاوے۔ مثلاً اگر دو دفع ہل چلانے اور ایک من کھاد ڈالنے سے دس من گندم پیدا ہو سکتی ہے۔ تو چار دفع ہل چلانے اور دو من کھاد ڈالنے سے گندم دگنی پیدا نہیں ہوگی۔ بلکہ اس سے کم مثال کے طور پر شائد پندرہ من اور اگر ہل آٹھ دفع چلایا جاوے اور کھاد چار من ڈالی جاوے تو چالیس من گندم کی بجائے ممکن ہے صرف ۲۰ من ہی پیدا ہو۔ اور اگر اسی طرح تجربہ جاری رکھا جاوے تو ایک وقت ایسا آئیگا جبکہ پیداوار بڑھنی بند ہو جائیگی۔ یہ ایک ایسی بات ہے جس کا تجربہ ہر ایک کسان کو ہے یعنی محنت اور سرمایہ کی نسبت سے زمین کی پیداوار نہیں بڑھتی۔ یا دوسرے الفاظ میں ایک ایکڑ زمین پر محنت اور سرمایہ کا زیادہ خرچ کرنا اور زیادہ گندم پیدا کرنے کی کوشش کرنا مہنگا پڑتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو آبادی کے بڑھاؤ کے ساتھ یہ ضرورت نہ ہوتی کہ زیادہ رقبہ کاشت میں لایا جاوے۔

آبادی کے بڑھاؤ کی نسبت سے ایک ہی ایکڑ زمین پر سرمایہ اور محنت بڑھائی جاتی اور جتنی گندم درکار ہوتی پیدا کی جاتی +

زراعت اور کانوں کو چھوڑ کر دوسری صنعتوں میں یہ دیکھا جاتا ہے کہ سرمایہ مزدوری اور خام مصالحہ کے بڑھانے سے پیداوار نسبتاً زیادہ بڑھتی ہے۔ یعنی اگر سرمایہ اور مزدوری وغیرہ دگنے کئے جاویں تو پیداوار کارخانہ کی ممکن ہے کہ تین گنی بڑھ جاوے۔ بہرحال میں دوگنی سے زیادہ ضرور ہو جائیگی۔ (اگر دوسرے حالات میں تبدیلی نہ ہو) اس امر واقعہ کو بڑھاؤ کا قانون Law of Increasing Return کہتے ہیں۔ زراعت میں اس کے متضاد بات ہے۔ جیسا کہ ہم بیان کر آئے ہیں وہاں ہمیں گھٹاؤ قانون یا Diminishing Return سے واسطہ پڑتا ہے۔ یہ ساری باتیں کانوں پر بھی حاوی ہیں۔ اور گھٹاؤ کا قانون شہری مکانات پر اسی طرح حاوی ہے جس طرح زراعتی زمین پر۔ مکان کو اونچا لے جانا کچھ حد تک تو فائدہ مند ہوتا ہے لیکن ایک حد ایسی آجاتی جہاں سراسر نقصان رہتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو شہر کی بڑھتی ہوئی آبادی ایک ہی مکان میں سما جاتی ــــ شہر کا پھیلاؤ ہوتا اور نئی زمین پر مکانات تعمیر نہ کرنے پڑتے۔

زراعتی اور قصباتی زمین کرایہ کی مقرری میں ایک ہی درجہ رکھتی ہے۔ اگر فرق ہے تو یہ ہے کہ جہاں زراعتی زمین میں زرخیزی زیادہ قابل غور چیز ہے۔ وہاں شہری زمین میں مکان بنانے کے۔ لئے موقع زیادہ قابل غور ہے۔ ایک اچھے موقع پر واقع مکان یا دوکان کے لئے دوکانداروں اور کرایہ داروں کی طرف سے مقابلہ شروع ہو جاویگا۔ اور

اور نتیجہ وہی ہوگا جو زراعتی زمین میں کاشت کاروں کے آپس میں مقابلہ سے ہوا یعنی مالک مکان اپنے مزارعہ سے کرایہ لینا شروع کردیگا - کرایہ کا سوال دیہاتی زمین اور شہری مکانات کا یکساں ہے - اس لئے ہم جو سرمایہ کی تھیوری کے بارے میں لکھینگے - اگرچہ وُہ زراعتی زمین کے بارے میں ہوگا لیکن اس کا اطلاق شہری مکانات کے کرایہ پر بھی ہوگا -

فرض کرو کہ ملک کی کل قابل کاشت زمین زرخیزی کے لحاظ سے چار ٹکڑوں میں تقسیم کی جاتی ہے - ا - ب - پ - ت - الف سب سے اچھا ٹکڑا اور ت سب سے خراب ٹکڑا ہے - یہ ظاہر ہے کہ سرمایہ اور محنت کے ایک ایکڑ پر متواتر خرچ کرنے سے پیداوار بتدریج گھٹتی جائیگی -

مندرجہ ذیل نقشہ اس بات کو اچھی طرح سے واضح کرتا ہے :-

ب	ا
١٩ من	٢٠ من
١٨ "	١٩ "
٧ "	١٨ "
١٦ "	١٧ "
١٨ من	١٧ من
١٧ "	
پ	ت

یہ بھی فرض کرو کہ زمین کی ملکیت اور کاشت مختلف شخصوں کے ہاتھ میں ہے -

اب اگر آبادی کم ہو اور ا زمین کے کچھ حصہ کی کاشت سے ہی ساری آبادی کے لئے غلہ پیدا ہو جائے تو ا کا کچھ حصہ کاشت ہوگا - باقی خالی رہیگا - اور چونکہ زمین الف کی ساری - جیسا کہ ہم نے فرض کیا ہے برابر ایک جیسی زرخیز ہے - اس لئے کاشتکار کوئی بھی رقم مالک زمین

کو نہ دیں گے۔ دوسرے مالک زمین کے جن کی زمینیں خالی پڑی ہیں بڑے خوش ہوں گے۔ اگر کاشتکار بہ پر لنے مالکوں کی زمین چھوڑ کر ان کی زمین کی کاشت شروع کر دیں۔ اب اگر آبادی کے بڑھنے سے ا کی ساری زمین کاشت ہو جاوے اور پھر بھی آبادی کا گزارہ نہ ہو۔ تو کئی کاشتکار ب ٹکڑے میں چلے جائیں گے۔ ا میں رہنے والے کاشتکار ا میں ہی زیادہ محنت و سرمایہ کا صرف شروع کر دیں گے۔ جس کا نتیجہ یہ نکلیگا کہ ب ٹکڑے کے کاشتکاروں کو جلدی پتہ لگ جائیگا کہ محنت اور سرمایہ کا دونوں ٹکڑوں میں ایک جیسا پھل نہیں ملتا۔ اس لئے ان میں آپس میں مقابلہ شروع ہو جائیگا۔ ب والے کوشش کرینگے کہ ان کو ا میں کاشت کے لئے زمین مل جائے۔ اس معاملہ کا نتیجہ یہ نکلیگا کہ ا زمین کے مالک اپنے کاشتکاروں سے کرایہ لینا شروع کر دینگے یا یوں کہو کہ وہاں کے کاشتکار خود ہی دینا شروع کر دینگے تا کہ ان سے زمین کا قبضہ چھن کر ب کے کاشتکاروں کو نہ دیا جائے۔ اس طرح جب آبادی کے بڑھاوے سے پ زمین بھی کاشت میں آجاویگی تو ب اور پ کے فرق سے ب زمین کے لئے بھی کرایہ نمودار ہو جاویگا اور ا کا کرایہ بڑھ جاویگا۔ کیونکہ پ کے کاشتکار ب ا کے کاشتکاروں سے مقابلہ شروع کر دیں گے اسی طرح پ زمین کے کاشت میں آجانے کے بعد ت زمین کی کاشت شروع ہو گی۔ اور پ زمین پر بھی کرایہ دینا شروع ہو جائے گا۔ کرایہ کی مقدار کیا ہو گی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ کرایہ ا۔ ب۔ اور پ پر اتنا ہو گا کہ اس کے ادا کر چکنے کے بعد ا۔ ب اور پ کے کاشتکاروں کی حالت آمدن کے لحاظ سے ایک جیسی رہے۔ اس کرایہ

کی تھیوری کی تشریح پہلے ریکارڈو نے کی اس تھیوری سے چند ایک باتیں ثابت ہوتی ہیں۔ اوّل کہ آبادی کے بڑھنے سے ناقص زمین کی کاشت کرنی پڑتی ہے۔ اور اس سے کرایہ بڑھتا جاتا ہے۔ دوئم کرایہ کی مقدار اچھی اور ناقص زمین کی پیداوار میں جو فرق ہے اس پر منحصر ہے۔ تیسرے ناقص زمین کی کاشت اس وقت ہوتی ہے جب آبادی کے بڑھ جانے سے مانگ بڑھ جاتی ہے۔ اور اُس کی قیمت میں اضافہ ہو جاتا ہے غلہ کی بڑھی ہوئی قیمت ہی کاشتکاروں کو اس بات پر تیار کرتی ہے کہ وُہ ناقص زمین میں بھی ہل چلا دیں۔ جہاں اگرچہ منافع نہیں لیکن خرچ کم از کم پورا ہو جاتا ہے۔ ا۔ ب۔ اور پ زمینوں کی کاشت پر خالص بچت یا منافع حاصل ہوتا ہے۔ جسکو کاشتکار آپسمیں مقابلہ کر کے مالک زمین کو کرایہ کی صورت میں دیدیتے ہیں۔ اس لئے کرایہ ایک فالتو آمدنی ہے Surplus Income جو کہ غلہ پیدا کرنے کے لئے خرچ Cost of Production سے اُوپر ہے۔ اس لئے خواہ یہ فالتو آمدنی مالک زمین کے پاس رہے۔ یا کاشتکار کے پاس۔ اس بات کا غلہ کی قیمت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اس بات کو لیکر ارتھ شاستر میں کہا گیا ہے کہ کرایہ کا قیمتوں پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ دوکانداروں کا یہ کہنا کہ وُہ زیادہ قیمت لینے پر مجبور ہیں کیونکہ وُہ کرایہ زیادہ دیتے ہیں بے معنی ہے۔ وُہ کرایہ اس لئے زیادہ دیتے ہیں کہ اس جگہ ان کی بکری زیادہ ہے۔ اور آمدن معقول ہے۔ اگر کرایہ کی زیادتی ہی مہنگائی کا ٹھیک بہانہ ہوتی تو گاؤں میں بیچنے والا دوکاندار جو کہ کرایہ برائے نام ہی دیتا ہے چیزیں سستی بیچتا۔ قیمتوں کا تقرر کئی ایک باتوں پر انحصار رکھتا ہے۔ اور

اُن کا ذکر ہم کسی اور جگہ کر آئے ہیں۔ کرایہ صرف کاشتکار اور زمیندار کے مابین فالتو آمدن کی تقسیم ہے جس کا غلہ کی قیمت پر کوئی اثر نہیں پڑ سکتا۔

کرایہ کی مندرجہ بالا تھیوری کو پڑھکر یہ سوال اٹھتا ہے کہ شاید یہ ہندوستان حاوی نہ ہو۔ کیونکہ یہاں کاشتکار مالکوں کی تعداد خاصی ہے اور اس لئے کاشتکار کے ساتھ مقابلہ کا سوال یہاں نہیں اٹھ سکتا۔ اس سوال کا جواب اشارۃً اوپر دیا جا چکا ہے۔ کرایہ خرچ سے فالتو آمدنی کا نام ہے۔ (صرف قدرتی طور پر محدود اشیاء کے لئے)، اور خواہ یہ زمیندار کے پاس جاوے یا کاشتکار کے پاس رہے۔ اس کی ہستی سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ دوسرا اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ ضرور نہیں کہ پہلے سب سے اچھی زمین زیر کاشت ہو۔ زرخیز زمین کا پتہ پیچھے لگے۔ اس کا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ جب شروع میں کاشتکاروں نے چند ایکڑ زمین پر ہل چلانے شروع کئے اور اردگرد کے ایکڑ چھوڑ دیئے تو اس ایک بات سے ہی یہ ثابت ہو گیا کہ اُن کے خیالات میں اور اُن کے اس وقت کے سامان اور حالات میں ایکڑ دوسرا ایکڑوں سے زیادہ زرخیز تھے۔

معاملہ لگان زمین اور بندوبست

ہندوستانی آبادی کا بہت سا حصہ گاؤں میں رہتا ہے۔ اور یونہی اقتصادی حالت ایسی ہے کہ وہ تہائی لوگ کھیتی پر گزارہ کرتے ہیں کھیتی ہندوستان کی قومی صنعت ہے جس کی خوشحالی سے لاکھوں کی خوشحالی کا تعلق ہے۔ اور جس کے کم ہونے سے بیشمار لوگ غریب اور تباہ ہو جاتے ہیں۔ باوجود اس بات کے کہ قدرت نے ہندوستان کو ایک زراعتی ملک بنایا ہے قدرت نے اس کی ترقی کے سارے سامان پورے نہیں لئے۔ بنگال آسام اور برہما کو چھوڑ کر باقی سب علاقوں میں اس کا گزارہ بارش پر ہے۔ اور اگر یہ کم ہو یا بے وقت ہو تو سارا ملک قحط زدہ ہو جاتا ہے۔ اس بات پر ہم پیچھے لکھ آئے ہیں۔ اس جگہ ہم ملک کے سرکاری انتظام administration کے نقطہ خیال سے ہندوستانی زراعت و زمین کے بارے میں جو سوال اٹھتے ہیں ان پر بحث کرینگے۔ ہندوستان کی زمین کی مالک گورنمنٹ ہے یا کہ کسان لوگ۔ لگان ایک ٹیکس ہے یا کہ کرایہ (Rent) اور یہ ہمیشہ کے لئے مقرر ہونا چاہیئے یا کہ کچھ سالوں کے لئے وغیرہ وغیرہ۔

لیکن ان باتوں پر وچار کرنے سے پہلے مختلف علاقوں میں زمین کی ملکیت اور کاشت کے بارے میں جو مختلف رواج پائے جاتے ہیں ان کا دھیان کرنا چاہیئے۔ مدراس بمبئی آسام اور برہما میں زمین خود کاشت زمیندار کی ملکیت ہے جس کا سیدھا تعلق لگان دینے میں گورنمنٹ کے ساتھ ہے۔ اس کو بیچنے یا رہن رکھنے میں گورنمنٹ کی اجازت نہیں لینی پڑتی۔ اور وہ سب طرح سے زمین کا خود مختار مالک ہے۔ اس کی جگہ

رعیت واڑی کہتے ہیں۔ شمالی ہندوستان میں و بنگال۔ ممالک متحدہ۔ وسط ہند اور پنجاب میں "زمینداری" رواج رائج ہے۔ لگان زمینداروں پر لگایا جاتا ہے۔ اور وہی اُس کے ادا کرنے کے ذمہ دار ہیں۔ لیکن اگرچہ زمیندار جو سرکاری لگان دیتا ہے زمین کا مالک ہوتا ہے۔ زمین کی کاشت موروثی یا غیر موروثی کاشتکار کرتا ہے۔ اس طرح زمینداری رواج میں تین پاٹیاں ہوتی ہیں سب سے نیچے کاشت کرنیوالا کاشتکار جس کی حیثیت ایک مزدور کی حیثیت سمجھنی چاہئے اُس کے اوپر زمیندار جو زمین کا مالک اور سرکاری لگان ادا کرنے کا ذمہ دار ہے اور سرکار جو زمیندار سے لگان لیتی ہے صوبہ پنجاب اور آگرہ کے کچھ علاقوں میں زمینداری رواج ذرا تبدیل شدہ شکل میں پایا جاتا ہے۔ جیسے آگرہ و پنجاب کے کئی گاؤں میں سرکاری لگان سارے گاؤں کے لئے ایک رقم میں کر دیا جاتا ہے۔ اور وہ گاؤں کے زمیندار جو عموماً ایک ہی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ آپس میں بانٹ کر نمبردار کے ذریعے سرکار کو ادا کر دیتے ہیں۔ گاؤں کی زمین ان سب کی مشترکہ ملکیت ہوتی ہے۔ چونکہ پٹی داری کے اصول پر وہ آپس میں بانٹ کر کاشت کرتے ہیں۔ آگرہ میں اس کو "محل واڑی" رواج اور پنجاب میں پٹی واری کہتے ہیں۔ زمینداری اور رعیت واڑی رواج میں فرق اس طرح بھی بیان کیا جاتا ہے کہ زمینداری رواج میں زمین کا خود مختار مالک زمیندار ہے۔ رعیت واڑی میں وہ بطور سرکار کے موروثی کاشتکار کے مالک ہے جس کو بیچنے یا رہن رکھنے کا کامل اختیار ہے۔ اب سرکار کی طرف سے کہا جاتا ہے کہ زمین کی مالک سرکار ہی ہے۔ کیونکہ یہ رواج پرانے ہندوؤں اور مسلمانوں کے وقت سے چلا آتا ہے۔ زمیندار صرف

لگان وصول کرنے کے ایجنٹ تھے اور ہیں کہ سرکار ہند کاشت کار کے لئے کئی ایک ایسے کام کرتی ہے جو کہ اصلیت میں دوسرے ملکوں میں صرف زمین کا مالک ہی کرتا ہے۔ یعنی روپیہ اُدھار دینا۔ کنوئیں کھودنا پانی کی نکاسی و روک تھام کا انتظام کرنا۔ اور بھی اُس کو کئی طرح کی مدد دینا۔ سرکار کے اس خیال کو کونسل میں اور سرکاری کتابوں میں کئی دفعہ اچھی طرح بیان کیا گیا ہے۔ اور اگر یہ بات مان لی جائے تو ہندوستان کے چھوٹے بڑے زمینداروں کا درجہ ایک کاشتکار مزدور کے درجے کے برابر ہو جاتا ہے لیکن اس میں سچائی ذرا بھی نہیں ہے۔ اوّل تو اس خیال کی تردید وزیر ہند و دوسرے معزز سرکاری اہلکاروں کی طرف سے کئی دفعہ کی گئی ہے یعنی ۱۸۵۶ء اور ۱۸۶۲ء و ۱۸۷۵ء میں دوسرے سرکاری کاموں کے لئے زمین کو خرید مول لینے کے جو قانون سرکار کو بنانے پڑتے ہیں ان سے صاف عیاں ہوتا ہے کہ سرکار اپنے آپ کو زمین کا مالک نہیں سمجھتی۔ اگر یہ مالک ہوتی تو زمین خالی کرانے کے لئے قانون نہ بناتی صرف نوٹس دینا کافی ہوتا۔ جیسا کہ کرایہ دار کو مکان سے نکالنے کے لئے مالک مکان کے لئے صرف کہنا یا نوٹس دینا کافی ہوتا ہے۔ تیسرے زمین بیچنے و رہن رکھنے کا اختیار سوائے مالک کے اور کسی کو نہیں ہوتا۔ کرایہ دار کرایہ پر لئے ہوئے مکان کو نہیں بیچ سکتا۔ اس لئے رعیت واڑی یا زمینداری رواج والوں کے ماتحت ہند کے زمیندار ہی مالک زمین ہیں۔ کیونکہ زمین بیچنے۔ رہن رکھنے یا وراثت میں دینے کا پورا پورا اختیار۔ ان کو حاصل ہے ٭

رواج چاہے زمینداری ہو چاہے رعیت واڑی سرکاری لگان یا ہمیشہ کے لئے مقرر رہتا ہے۔ یا تھوڑے سالوں کے لئے یعنی ہمیں یا بیس

سالوں کے لئے ۱۷۹۳ء میں بنگال کا بندوبست دوامی کیا گیا یعنی سرکاری
مالیہ ہمیشہ کے لئے مقرر کیا گیا ۱۷۹۵ء میں اور ۱۸۰۲ء میں ایسا ہی ضلع
بنارس اور صوبہ مدراس کے شمالی قصبوں میں کیا گیا۔ یعنی اس وقت
بنگال کے ۵/۶ حصہ میں و آسام کے ۱/۸ ممالک متحدہ کے ۱/۱۰ اور مدراس کے
۱/۴ حصہ میں کل انگریزی ہندوستان کے ۱/۵ حصے زمین کا لگان ہمیشہ کے
لئے مقرر ہے۔ جو کہ گھٹایا بڑھایا نہیں جا سکتا۔ ۱۷۹۳ء میں جب بنگال
میں لارڈ کارنوالس نے ایسا بندوبست کیا تو کل بنگال کے زمینداروں کی
آمدنی چار کروڑ روپیہ کے لگ بھگ تھی۔ جس میں سے تین کروڑ ساٹھ لاکھ
روپیہ سرکار نے اپنا حصہ مقرر کیا۔ جو کہ اس وقت بہت زیادہ اور سچ
پوچھو تو زمینداروں پر اتیاچار کے برابر تھا۔ لیکن ان کی خوش قسمتی سے
اور سرکار کی بدقسمتی سے اب یہ حالت ہے کہ بنگال کے زمینداروں
کی آمدن کا اندازہ اس وقت سولہ کروڑ روپیہ سالانہ سے کچھ زیادہ ہے جس
میں سے سرکار کا حصہ صرف تین کروڑ ساٹھ لاکھ ہے ۔

پکا بندوبست کرنے میں لارڈ کارنوالس کے من میں کئی ایک خیال
تھے۔ سب سے ضروری اور اہم وچار راج نیتی یا پولیٹیکل وچار تھا۔ کہ ایسا کرنے
سے وہ بنگال کے سارے زمینداروں کو اور امیر لوگوں کو اور بارسوخ
آدمیوں کو انگریزی راج کی طرف کھینچ لے گا۔ اس میں سرکار کو پوری
کامیابی ہوئی ہے۔ اور بنگالی زمیندار اس وقت سے لے کر آج تک
سرکار کے خیر خواہ ہیں۔ دوسرا وچار یہ تھا کہ کچے بندوبست کا کشٹ
و خرچ ہے وہ کم ہو جائے گا۔ اور لوگوں کے پاس کچھ روپیہ بچ رہیگا۔ جو
قحط میں ان کی سہائتا کرے گا۔ تیسرا وچار یہ تھا کہ زمیندار زمین کی

کی کاشت میں مشغول رہینگے - اور نئے نئے کاشت کے ڈھنگ نکالیں گے -
کیونکہ ایسا کرنے سے سارے کا سارا فائدہ اُن کو ہوگا - سرکار بھی اپنی طرف سے بے فکر ہوجائیگی - کیونکہ ایک مقررہ رقم ہر سال کے سال خزانہ میں آجائیگی ٭

آج کل سرکاری افسروں اور دوسرے اینگلو انڈین لوگوں کی طرف سے کہا جاتا ہے کہ پکا بندوبست کرنے میں لارڈ کارنوالس کے من میں جتنے بھی وچار تھے وہ سب رائگاں ہوئے ہیں - کیونکہ کسی بھی زمیندار نے روپیہ زمین کی کاشت میں نئے ڈھنگ سوچنے اور ترقی کرنے میں نہیں لگایا - وہ تو اپنی زمین کئی کئی سال تک بھول کر بھی نہیں دیکھتے - بلکہ کلکتہ وغیرہ مقاموں پر ٹھہر کر موج اُڑاتے ہیں - سرکار نے تو اپنا حصہ مقرر کر دیا ہے لیکن زمیندار کاشتکاروں سے زیادہ سے زیادہ روپیہ لینے کی خواہش میں لگے رہتے ہیں - کہ سرکار کو پکا بندوبست کرنے میں بہت گھاٹا رہا ہے - اور اگر سوراجیہ لوگوں کو مل جاوے تو یہ بندوبست جلدی ہی دور ہوجاوے کیونکہ باقی علاقوں میں اس وجہ سے لگان اور ٹیکس زیادہ لگانے پڑتے ہیں تاکہ سرکاری خزانے میں گھاٹا پورا کیا جاوے - اب ان باتوں پر اور وچار کیا جائے تو پتہ لگیگا کہ ان میں سچائی بہت تھوڑی ہے - بنگالی وودسر زمیندار آنند مناتے اور گاؤں سے غیر حاضر رہتے ہیں لیکن انگلینڈ میں بھی تو لارڈ ایسا ہی کرتے ہیں - اُن پر مالیہ کیوں نہیں بڑھا دیا جاتا - اور جہاں کچا بندوبست ہے کیا وہاں کے زمیندار دیوتا سروپ اور گاؤں نواسی ہیں - پکے بندوبست کی تردید میں اس سے بڑھ کر اور کوئی بودی اور بھدی دلیل نہیں ہوسکتی ٭

دوسرے کاشتکاروں سے زیادہ حصہ لینے کی طاقت بھی اب قانون لگان ۱۸۵۵ء کے ذریعے سے سرکار نے بہت حد تک زمینداروں سے چھین لی ہے۔ اگر اتنا سوراج ہو تو بجائے پکا بندوبست ہٹا دینے کے باقی صوبوں میں پکا بندوبست ہو جائے۔ ایسی ہمیں پوری امید ہے کیونکہ ہندوستان جیسے زراعتی ملک میں زمین پر اتنا بھاری لگان لگانا جیسا کہ آج کل ہے اور پھر اس لگان کو ہر بیس یا تیس سال کے بعد بڑھا دینا بہت ہی نقصان دہ ہے۔ سچی بات تو یہ ہے جو بات اس بنگال کے پکے بندوبست میں سرکاری افسروں کو بہت چبھتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ اگرچہ بنگال کی زمین کی آمدنی اس وقت چار کروڑ روپے سے سولہ کروڑ روپے تک بڑھ گئی ہے سرکار کا حصہ اتنا ہی ہے جتنا کہ ۱۷۹۳ء میں تھا۔ یعنی تین کروڑ ساٹھ لاکھ۔ ایک لالچی سرکار کے لئے اتنی بھاری رقم کو زمینداروں اور کاشتکاروں میں تقسیم ہوتے ہوئے دیکھنا ایک بھاری دکھ کا مقام ہے۔ اس لئے لالچ میں پڑ کر پکے بندوبست کو دور کرنے کے لئے جھوٹے بہانے ڈھونڈتے جاتے ہیں ؛

یہ بھی قابل یادداشت بات ہے کہ لارڈ کیننگ۔ لارنس۔ رپن وغیرہ نے تمام ہندوستان میں پکا بندوبست کرنے کے لئے بہت زور لگایا لیکن کامیابی نہ ہوئی ؛

پکا بندوبست تو کہاں کرنا تھا سرکار نے لمبا بندوبست بھی منظور نہیں کیا۔ بندوبست کا وقت تیس سے پچاس سال تک بڑھا دینے کے لئے کونسل میں فروری ۱۹۱۲ء میں بحث ہوئی۔ اور بندوبست کے کشٹ۔ دکھ اور خرچ اچھی طرح بتائے گئے لیکن سرکار کی طرف [illegible]

یہ جواب دیا گیا کہ بیس اور تیس سال کا بندوبست ملک میں ایک رواج ہو گیا ہے۔ اور کہ آج کل بندوبست کرنے میں وقت بھی تھوڑا لگتا ہے یعنی دو سے چار سال تک کہ پچھلے پچاس سالوں میں سرکاری آمدن زمین کے لگان سے بیس لاکھ روپے سالانہ کے حساب سے بڑھی ہے اور اس لیئے لمبا بندوبست کرنے سے سرکار کو بہت گھاٹا رہیگا ٭

اس بیان کو ختم کرنے سے پہلے ہم ایک اور بات پر بھی کچھ کہنا چاہتے ہیں سرکار کی طرف سے کہا جاتا ہے کہ چونکہ سرکار زمین کی مالک ہے اس لئے زمین کا لگان جو یہ لیتی ہے وہ صرف زمین کا کرایہ ہے۔ جو کہ ایک مالک مکان و مالک زمین اپنے کرایہ دار سے لینے کا حقدار ہے۔ دوسری طرف سے یہ جواب دیا جاتا ہے۔ جیسا کہ ہم پہلے بھی ثابت کر چکے ہیں۔ کہ سرکار کبھی بھی زمین کی مالک نہیں ہے۔ اس لیئے یہ لگان ایک ایسا ہی ٹیکس یا مالیہ ہے جیسا کہ دوسری چیزوں پر یا سالانہ آمدنی پر لگایا جاتا ہے۔ اگر یہ دوسرا خیال سچا ہو جیسا کہ یہ ہے تو اُس سے ایک دو نتیجے نکلتے ہیں۔ یعنی کہ انکم ٹیکس کی طرح زمین کے لگان میں بھی دو ہزار یا اس سے کچھ کم آمدنی پر کوئی ٹیکس نہیں لگنا چاہیئے یا اگر ٹیکس لگانا ہو تو جس زمیندار کے پاس تھوڑی زمین ہو جس سے اُس کا گزارہ بھی مشکل سے چلتا ہو اُس پر تھوڑی ہی لگان یا لگان کا نرخ تھوڑا ہونا چاہیئے۔ آج تک لگان زمین خالص آمدنی کا پچاس سے ساٹھ فیصدی ہے۔ اور یہ بات وچار نے کے قابل ہے کہ اتنا ٹیکس سنسار کے کسی ملک میں بھی کسی صنعت پر نہیں لگایا جاتا ٭

اسی طرح ہم یہ بھی مطالبہ کرتے ہیں حق بجانب ہیں۔ کہ جیسا

دنیا کے ہر مہذب ملک میں اور ہندوستان میں بھی دوسرے سارے ٹیکسوں کے بارے میں دستور ہے - کہ نیا ٹیکس لگانے یا پرانے ٹیکس کو بڑھانے میں قانونی کونسل کی اجازت لینی پڑتی ہے - وُہ دستور لگان زمین کے بارے میں بھی رائج ہونا چاہیئے - سب سے اچھی بات تو یہ ہے لگان زمین ہمیشہ کے لئے مقرر کیا جائے - اور یہ نہیں کہا جا سکتا تو مہتمم بندوبست اور اُس کے ماتحت محکمہ کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہہ دینا چاہیئے جب کبھی گورنمنٹ کی رائے میں لگان زمین بڑھانے کی وجوہات ہوں تو وُہ یہ معاملہ قانونی کونسل میں بحث کے ساتھ پیش کرے تاکہ پبلک کو اور زمینداروں کو ان پر پوری بحث کرنے اور مکمل حالات افشا کرنے کا موقع ملے -

پہلے ہم اپنے اس مطالبے کی حمایت میں پارلیمنٹ کی مشترکہ کمیٹی کی رپورٹ میں سے ایک اقتباس دیتے ہیں "کمیٹی ان اعتراضات کو بڑا وزن دار سمجھتی ہے - جو کچھ گواہوں نے اس بات کے متعلق کئے ہیں کہ کچھ ٹیکس گورنمنٹ بغیر کسی قانون کے پاس کرنے کے ہی لوگوں پر لگا سکتی ہے اور ان کو بغیر کسی حد کے بڑھا سکتی ہے - معاملہ زمین کے متعلق بنیادی قوانین مختلف صوبوں میں مختلف ہیں لیکن کچھ صوبوں کو معاملہ کی شرح کا گھٹانا بڑھانا بالکل گورنمنٹ کی مرضی پر منحصر ہے - جو لوگ یہ ٹیکس ادا کرتے ہیں - ان کو اس سارے سسٹم کی شکل دیتے ہیں کوئی پوچھتا نہیں ہے - جو قاعدے کہ اس کے متعلق بنائے گئے ہیں - وُہ کچھ صاف نہیں ہیں - اور وہ لوگ جو معاملہ زمین دیتے ہیں وُہ اُن اصولوں کو بالکل نہیں سمجھتے ہیں" +

اس نقص کو دور کرنے کے لئے کمیٹی نے ایک تجویز پیش کی ہے - اور وہ یہ ہے کہ معاملہ زمین کی شرح - بندوبست کی میعاد - زمین کی پیداوار کی قیمت

لگانے اور ایسے ہی دوسری باتوں کے متعلق سارے قواعد کو جلدی ہی ایک لیجسلیٹو ایکٹ کی شکل دے دی جائے تاکہ لوگوں کو معلوم ہو سکے کہ کن اصولوں پر سارہ ی کاروائی کی جاتی ہے ﴿

۲۲-۱۹۲۱ء میں کل رقم جو سرکار نے بطور لگان زمین کے وصول کی وُہ پونے چھتیس کروڑ روپیہ تھی - جوکہ سرکار ہند کی کل آمدنی کا تقریباً ۱۸ فیصدی تھی - باقی کسی بھی مد سے سرکار کو اتنی آمدنی نہیں جتنی لگان زمین سے - اور یہ کہا جاسکتا ہے کہ ہندوستان کا کسان اور زمیندار سرکاری محاصل کا دایاں ہاتھ ہیں - ان حالات میں کیا مطالبہ کرنا مناسب نہ ہوگا کہ سرکار کو ہر طرح سے زمیندار اور کسان کی بہبودی کا فکر کرنا چاہئے - اور ایسی ہر تجویز پر عمل کرنا چاہئے جس سے کہ وُہ فارغ البال ہوکر اپنے کام کو دلجمعی اور قناعت سے کرے -

ہم اس جگہ ایک اور رواج کا بھی ذکر کر دینا مناسب سمجھتے ہیں جس کے رائج کر دینے سے بہت سے زمیندار مستفید ہو سکتے ہیں اور جس سے سرکار کو بھی بچت اور منافع رہ سکتا ہے - اس دستور کو ولایت میں Free hold system کہتے ہیں یعنی زمین کا مالک بیس سال یا تیس سال کا لگان زمین یکمشت یا ایک دو قسطوں میں سرکار کو ادا کر دیتا ہے - اور بعد ازاں ہمیشہ کے لئے وُہ زمین لگان دینے سے آزاد ہو جاتی ہے - مثال کے طور پر اگر لگان زمین فی ایکڑ ۵ روپیہ سال ہو - اور شرح سود بازاری بھی ۵ یا ۶ روپیہ سینکڑہ سالانہ ہو تو اگر مالک زمین فی ایکڑ ۱۰۰ روپیہ ایک دو قسطوں میں سرکار کو ادا کر دے جوکہ بیس سال کے لگان زمین کے برابر ہو تو اس سے طرفین کو فائدہ

ہے۔ سرکار کو مقررہ لگان زمین بطور سو روپیہ کے سود کے آتا رہیگا۔ اور لگان جمع کرنے کا خرچ بچ رہیگا۔ مالک زمین کو بھی اس Redemption یعنی معافی لگان سے آئندہ کے لئے بیفکری ہو جائے گی۔ یہ دستور بنگال اور دوسرے اضلاع میں جہاں کہ بندوبست دوامی ہے بڑی آسانی سے جاری کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس کے لئے یہ ضروری ہوگا۔ کہ ایک خاص تعداد زمینداروں کی اس پر عمل کرنے کو تیار ہو۔ ہمارا خیال ہے کہ اگر اس دستور کے فوائد زمینداروں کو اچھی طرح ذہن نشین کرائے جائیں۔ تو وہ اس کو مان جاویں گے +

ٹریڈ یونین

شرح مزدوری کس طرح مانگ اور بہمرسانی کے موازنہ سے مقرر ہوتی ہے۔ اس پر بحث کی گئی ہے۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ آخری حد جہاں تک مزدوری بڑھ سکتی ہے یا بڑھائی جا سکتی ہے وُہ مزدور کی خود اپنی قابلیت اور کام پر منحصر ہے۔ لیکن یہ یقین کر لینا غلط ہوگا کہ عام طور پر مزدوروں کو جو تنخواہ ملتی ہے وُہ اُن کے کام کی قیمت کے ٹھیک مطابق ہے۔ مانگ اور بہمرسانی کے قانون مردہ قانون ہیں۔ وُہ خود بخود سب کام ٹھیک سرانجام نہیں دیتے۔ اُن کے پیچھے مالک اور مزدور جو زندہ ہستیاں ہیں اُن کی لیاقت مقابلہ طاقت اور تجربہ پر سب کچھ انحصار رکھتا ہے اور جب ہم مزدوری کا بغور مطالعہ کرتے ہیں تو اس واقعہ کی صداقت

میں کچھ شک نہیں رہتا۔ کہ عام طور پر ساری دنیا میں اور خاص طور پر
ہندوستان میں مزدور لوگوں کو اُن کے حق سے کم تنخواہ مل رہی ہے۔
اس کی وجہ یہ ہے کہ اکثر مزدور لاعلم ہوتا ہے۔ اس کو یہ پتہ ہی نہیں لگ
سکتا کہ کسی خاص وقت میں اس کی مزدوری کے لئے مانگ کی کیا حالت ہے
منڈی کا اس کو کچھ پتہ نہیں۔ اور جن چیزوں کے بنانے میں وہ حصہ لیتا
ہے اُن کی ساخت اور فروخت کی قیمت سے وُہ بہرہ ور نہیں ہوتا۔
اور ان سب باتوں پر طرّہ یہ کہ اُس کے پاس جمع کی ہوئی پونجی بھی بہت
تھوڑی ہوتی ہے۔ جس سے کہ وُہ چند دن نوکری نہ ملنے کی صورت میں
اپنا گزارہ چلالے۔ ان باتوں سے اور دوسری باتوں سے جن کا ذکر مزدوری
کے بیان میں ہو چکا ہے وُہ بسا اوقات مجبور ہو جاتا ہے کہ جتنی بھی تنخواہ
اس کو مالک کا رخانہ دینا چاہے منظور کرلے۔ مالک کے لئے یہ معمولی بات ہے
کہ وہ روشن کو نوکر رکھتا ہے یا جمعہ کو۔ لیکن جمعہ کے لئے یہ بات نہایت ضروری
ہے کہ وُہ اس نوکری کو حاصل کرلے۔ نہیں تو اُس کو بھوکا رہنا پڑیگا
اس لیے آپس میں مقابلہ کرکے وُہ اپنی مزدوری گھٹا لیتے ہیں۔ اور مالک
فائدہ میں رہتا ہے۔

یہ حالت اس وقت تک نہیں سدھر سکتی جب تک کہ مزدور لوگ
بھی آپس میں اتفاق کر کے متحد ہو کر ایک مقررہ تنخواہ کا مطالبہ نہیں
کرنے لگے۔ جس طرح مالک فیصلہ کرنے میں ایک ہی مرضی رکھتا ہے اسی طرح
مزدوروں کو بھی مزدوری کا مطالبہ کرتے ہوئے ایک شخص کی حیثیت سے
مطالبہ کرنا چاہئیے۔ علیحدہ علیحدہ نہیں۔ انگریزی میں ایسا کرنے کو
Collective Bargaining یا اکٹھے سودا کرنا کہتے ہیں۔

اس سسٹم کا رواج شروع میں ٹریڈ یونین کے بننے کے ساتھ پڑا۔ اور
در اصل ٹریڈ یونین بنانے کی بڑی غرض اور فائدہ بھی یہی ہے کہ شخصی سودے
کی جگہ مزدوری کے سودے "ٹریڈ یونین" کے ماہر اور تجربہ کار افسروں کی
طرف سے ہوں۔ آج کل انگلینڈ۔ امریکہ اور یورپ کے سارے ممالک میں
اس قسم کے جتھے بن گئے ہیں۔ اور شاید ہی کوئی پیشہ۔ تجارت ہنر و صنعت
ہو جہاں کہ مزدوروں نے اپنے مفاد کی حفاظت کے لئے ٹریڈ یونین نہ بنایا
ہو۔ وہاں یہ سسٹم اب اتنی ترقی پکڑ گیا ہے کہ ایک صنعت کی مختلف شاخوں
کی یونین علیحدہ ہیں۔ ساری شاخوں کی مشترکہ یونین علیحدہ اور اس
طرح ایک ہی قسم کی یا ملی جلی صنعتوں کی مشترکہ یونین علیحدہ اور ملک
کی سب صنعتوں کی مرکزی ٹریڈ یونین کانگرس علیحدہ ہے۔ ان یونین کے
پاس کروڑوں روپے چندہ کے جمع ہیں۔ اُن کی علیحدہ بیمہ کی کمپنیاں ہیں۔
اخبار ہیں۔ لائبریریاں اور ڈسپنسریاں قایم کی ہوئی ہیں۔ اور ملک کی
مجلسی و پولیٹیکل و اقتصادی زندگی میں وہ بڑا اثر رکھتی ہیں۔ اس بیان سے
یہ نہیں سمجھ لینا چاہئے کہ اُن کا یہ حال ہمیشہ سے چلا آتا ہے۔ ہر تحریک
کو آغاز میں سختی کے زمانے سے گزرنا پڑتا ہے۔ اور ٹریڈ یونین کا بھی شروع میں
یہی حال ہوا۔ ٹریڈ یونین کا جنم انگلینڈ میں اٹھارھویں صدی کے آخر میں
ہوا۔ لیکن سنہ ۱۸۷۱ء سے پہلے اُن کی قانونی ہستی کو ہی تسلیم نہ کیا گیا۔ سنہ ۱۷۹۹ء
اور سنہ ۱۸۰۰ء میں تو جتھے بنانے کے قانون Combination of Laws
پاس کئے گئے۔ جن کی رُو سے یونین اور اس کا ممبر بننا جرم قرار دیا گیا۔
ہزاروں مزدور اس جرم میں سزایاب ہوئے۔ لیکن ٹریڈ یونین کی تحریک بند
نہ ہوئی۔ پہلے پہل خفیہ سوسائٹیاں بننی شروع ہو گئیں لیکن جب سنہ ۱۸۲۴ء

ہیں وُہ قانون منسوخ کئے گئے تو پھر کھلم کھلا مزدور لوگوں نے یونینوں میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ اور تحریک کو بڑا فروغ حاصل ہُوا ہم نے ٹریڈ یونین کی مفصل تواریخ اور مختلف مرحلوں کا جن میں سے یہ گزری ہے یہاں ذکر نہیں کرنا۔ ان چند ایک سطور کے لکھنے سے ہمارا مطلب صرف یہ بتلانا تھا کہ تواریخ اپنے آپ کو دہرتی ہے۔ ہندوستان میں آج کل ٹریڈ یونین تحریک اپنے ایام طفلانیت میں ہے۔ اور گورنمنٹ اور سرمایہ داروں کی طرف سے اس کے ساتھ جو سلوک ہو رہا ہے وُہ کچھ حوصلہ افزا نہیں ہے۔ ساتھ ہی اس تحریک کے چلانے والوں کی طرف سے بھی پے در پے غلطیاں ہو رہی ہیں۔ جن سے یقین پڑتا ہے کہ ہندوستان میں بھی شاید اس تحریک کو چند اک مرحلوں میں سے گزرنا پڑے۔ اور قابلیت کا امتحان پاس کرنا پڑے۔ پیشتر اس کے کہ یہ تقویت پکڑے۔ لیکن دوسرے ممالک کی تواریخ اور خاص کر انگلینڈ کی تواریخ سے جہاں کہ اس کا جنم ہُوا تحریک کے لئے یہ لوں کو سبق سیکھنا چاہئے۔ اور پہلی ناکامیابیوں سے گھبرا نہیں جانا چاہئے ۔

یونین کو مضبوط بنانے اور پختہ بنیاد پر کھڑا کرنے کے لئے یہ اشد ضروری ہے کہ پہلے اس کی مالی حالت کو پکا کرنے کی طرف توجہ دی جائے۔ چندے کی باقاعدہ وصولی اور حساب کی طرف خاص توجہ دینی چاہئے تاکہ غبن اور اس کے شُبہ کی گنجائش بھی نہ رہے۔ مرکزی انتظام نہایت اعلیٰ ہونا چاہئے۔ "یُونین" کا انتظام ایسے آدمیوں کے ہاتھ میں ہو جو اس پیشہ سے کسی نہ کسی صورت میں بالواسطہ تعلق رکھتے ہوں جن کو اس پیشہ کے امور کا ذاتی علم اور تجربہ ہو۔ اور نئے آدمی اور کارکن تیار کرنے کا خاص انتظام ہونا چاہئے تاکہ اچھے لائق افسروں کا سلسلہ قائم رہے۔ اس کے لئے ضروری

جماعت میں سے ہی ہونہار آدمیوں کو چنا جاوے۔ اور اُن کو اس پیشہ
و علم اقتصادیات کی تعلیم دینی چاہئے۔ جہاں تک ہو سکے وکیلوں کے ہاتھ میں
ٹریڈ یونین کی باگ ڈور نہیں دینی چاہئے۔ ساری عمر دماغی کام کرنے سے
اور قانونی نکتوں کی تلاش کرنے سے زندگی کے امور واقعہ سے ان لوگوں
کا تعلق بسا اوقات ٹوٹ جاتا ہے۔ اور معاملہ کو نپٹانے کی بجائے وہ لمبا کر
دیتے ہیں۔ لیاقت اور سمجھ ہی تحریک کی رہنمائی کرنے کے لئے کافی
نہیں ہے۔ اور خاص کر ٹریڈ یونین کے لئے تو اُس پیشہ یا صنعت کا ذاتی
تجربہ ہونا جس کے لئے کہ یونین بنائی جاوے۔ نہایت ضروری صفت ہے
مزدوروں کو لیکچروں اور تصویروں کے ذریعے تعلیم دینے کا انتظام بھی
یونین کو کرنا چاہئے۔ اور سوشل زندگی کو بہتر بنانے کے لئے مزدوروں کی
لائبریریاں۔ رات کے سکول اور کھیل کے سامان مہیا کرنے چاہئیں۔ اس
قسم کی ڈسپنسریاں قائم کرنی چاہئیں۔ جہاں اُن کو میڈیکل مشورہ مفت
اور دوائی سستے داموں مل سکے۔ اور بوقت ضرورت اُن کے جمع شدہ
چندے کے نصف یا چوتھائی کے برابر ان کو قرضہ دینے یا کسی بینک
وغیرہ سے دلانے کا انتظام بھی ہونا چاہئے۔ اس بارے میں سب سے
اچھی بات تو یہ ہوگی کہ یونین کی طرف سے مزدوروں کے لئے کوآپریٹو
سوسائٹیاں کھولی جائیں۔ جن کے فنڈ یونین کے فنڈ سے علیحدہ ہوویں
مزدوروں کے لڑکے بالوں کو اُن کے باپ کے پیشہ میں داخل کرانے
کے لئے ہر طرح کی سہولیت یونین کو پیدا کرنی چاہئے یعنی شاگرد بٹھلانے
اور وظیفہ دینے میں مزدوروں کو اپنی زندگی بہتر کرانے کی ترغیب
دینی چاہئے۔ یہ تھوڑے اور مثبت کام کرنے کا پروگرام ہے جس پر عمل اگر

نہ کیا جاوے۔ اور صرف ماہواری چندہ لینے پر اصرار کیا جاوے تو ممبر جلدی چندہ کو جرمانہ سمجھنے لگ پڑیں گے۔ اور یونین سے برگشتہ ہو جائینگے۔ دوسری طرف یونین کے افسروں کا فرض ہونا چاہیے کہ وہ پریس اور پلیٹ فارم سے اور قانونی کونسلوں میں ایک زبردست ایجیٹیشن جاری رکھیں۔ اور گورنمنٹ پر دباؤ ڈالیں کہ وُہ مزدوروں کی حالت میں اصلاح کے لئے متعدد قانون پاس کرے۔ جیساکہ انگلینڈ اور جرمنی میں پاس کئے گئے ہیں۔ مثلاً کام کرتے ہوئے زخمی یا ناقابل مزدوری ہو جانے پر مالک کارخانہ سے معاوضہ دلانا۔ زندگی بیمہ کرانے میں سرکار اور مالک کی طرف سے بھی امداد کا ملنا کم از کم تنخواہ ہر ایک پیشہ کے لئے مقرر کرنا۔ وغیرہ

ہمارے ملک میں ٹریڈ یونین کی تحریک زور پکڑ رہی ہے۔ اور بہت سی صنعتوں میں یونین قائم بھی ہو چکے ہیں۔ لیکن یہ بات افسوس سے دیکھی جاتی ہے کہ ہندوستان میں اس تحریک کا پہلا اور آخری مقصد سٹرائیک یا ہڑتال کرانا ہی سمجھا گیا ہے۔ کئی ایک یونین تو ایسی ہیں کہ اُن کا جنم پیچھے ہُوا ہے اور ہڑتال پہلے۔ اور بہت سی ایسی ہیں جن کے افسروں نے اپنا رعب اور اثر دکھانے یا مزدوروں کو حیرت میں ڈالنے کے لیئے ہی ہڑتال کرانے پر اپنا سارا زور لگایا ہے۔ اور ناکامیابی ہونے پر غریب مزدوروں کو اُن کے اپنے حال پر چھوڑ کر آپ چپ چاپ علیحدہ ہو گئے ہیں۔

ہڑتال یا سٹرائیک کرنا اعلان جنگ کے برابر ہے۔ اس لئے ایسا کرنے سے پیشتر کئی بار جنگ کے نتائج پر اچھی طرح سے غور کر لینا چاہیئے جنگ... کا اعلان کرنے کے لئے صرف یہی بات کافی نہیں ہوتی کہ ایک پارٹی اپنے آپکو راستی پر سمجھتی ہو۔ اور انصاف اُس کی طرف ہے کیا کسی حریف نے صرف

اس لئے اپنی فوج کو دشمن کی فوج پر دھکیل دیا ہے۔ کہ وُہ سچا ہے اور دشمن جھوٹا ہے۔ بہادری کے ساتھ Strategy چال بھی کامیابی کے لئے لازمی چیز ہے۔ اس لئے ہڑتال کرانے سے پہلے یہ سوچ لینا چاہئے کہ کامیابی کا امکان کتنا ہے۔ اور کیا اقتصادی اور مجلسی حالات موافق ہیں۔ اگر ایسا نہ ہو تو دھمکی اور ڈپلومیسی سے کام لینا چاہئے۔ اور اعلان جنگ ہرگز نہیں کرنا چاہئے اگر نرمی سے یا سمجھوتہ کرنے سے کام چل جاوے تو وُہ سب سے بہتر ہے۔ زیادہ تنخواہ یا تھوڑے سے گھنٹے کام کا مطالبہ کرنا کوئی مذہب یا اصول کا سوال نہیں ہے۔ اس میں سمجھوتہ کرنا عار سمجھا جاوے ✦

ارتھ شاستر کے اصولوں کے مطابق اضافہ تنخواہ کے لئے لڑنے سے پیشتر یہ دیکھ لینا چاہئے کہ مندرجہ ذیل ایک دو باتیں اُس مزدوری پر عاید ہوتی ہیں یا نہیں۔ اُن کے عاید ہونے کی صورت میں کامیابی کا امکان ہو سکتا ہے ✦

Urgent and inelastic مزدوری کے لئے مانگ اشد ہو۔ ہو۔ اس میں کمی گوارہ نہ ہو سکے۔ اس مزدوری کی جگہ اور کوئی مزدوری بآسانی نہ لے سکے۔ جیسے اُس کی عدم موجودگی سے کام رُک جاوے۔ یا اُس میں بڑا حرج واقع ہو۔ یا اُس کے بدلے ملنے والی مزدوری بہت مہنگی پڑتی ہو ✦

سوشلزم

تقسیم دولت کے بیان کو ختم کر دینے سے پہلے ہم اس تحریک کا بھی مختصر ذکر کر دینا چاہتے ہیں جس کی بنیاد موجودہ صنعتی دور کے آغاز کے ساتھ ساتھ ہی پڑی۔ اور جو مختلف مرحلوں سے گزرتی ہوئی اس وقت امریکہ و یورپ کے سارے ممالک میں بڑی تقویت پکڑ گئی ہے۔ اس تحریک کو انگریزی میں سوشلزم کہتے ہیں۔ اور یہ کہنا مبالغہ نہ ہو گا کہ اس تحریک کا بالواسطہ یا بلاواسطہ اثر جو دنیا اور خاص کر یورپ و امریکہ کے خیالات اور جذبات پر پڑا ہے۔ اُس کا اندازہ لگانا بھی مشکل ہے۔ دماغی زندگی کا کوئی ہی ڈیپارٹمنٹ ہو گا جو اس کے اثر سے بچا رہا ہو۔ اس وقت جو مزدور جماعت کے لئے ہمدردی سوسائٹی میں پائی جاتی ہے وہ تو بالواسطہ طور پر سوشلسٹ لوگوں کے ایجیٹیشن کا نتیجہ ہے۔

سوشلزم ایک اقتصادی اور ملکی تحریک ہے اور سوشلسٹ لوگ سوسائٹی کی بنیاد ایک نئے طریقہ پر رکھنی چاہتے ہیں۔ وہ ایک نئے صنعتی دور کو جاری کرنا چاہتے ہیں جس میں سرمایہ داروں کی ضرورت ہی نہ رہے۔ اور سارا انتظام منافع وغیرہ مزدور پیشہ جماعت کے ہاتھ میں رہے۔ آغاز سے کوئی سوا سو سال تک یہ تحریک سرمایہ دار سوسائٹی کے مجلسی اقتصادی اور ملکی غلامی کے برخلاف ایک پروٹسٹ کے طور پر کام کرتی رہی ہے

لیکن انیسویں صدی کے اخیر حصہ میں کارل مارکس ہنری جارج وغیرہ سوشلسٹ لیڈروں کے زیر اثر یہ تحریک جنگی صورت اختیار کر گئی۔ اور اگرچہ یورپ کی گورنمنٹیں شروع ہی سے اس تحریک کے کچلنے اور بدنام کرنے کے درپے رہی ہیں۔ لیکن انیسویں صدی کے اخیر سے تو یہ تحریک گورنمنٹوں کے لیئے ایک باقاعدہ ملکی خطرہ بن گئی۔ روس کے موجودہ ملکی انقلاب سے سوشلسٹ لوگ یعنی بالشویک۔ وہاں کی حکومت سنبھالنے میں کامیاب ہوگئے ہیں اس نئے باتی سلطنت پرست لوگوں کی آنکھیں کھول دی ہیں اور وہ آج کل دن رات اس فکر میں ہیں کہ اس کے متعلق ہر طرح کی غلط بیانیاں دوسرے ملکوں میں پھیلائی جائیں تاکہ مزدور پیشہ اور غریب طبقہ آبادی کا دھوکے میں رہے۔ اور ان کی چاندی کھری ہوتی رہے۔ اس مطلب کے لئے کبھی مذہب۔ کبھی اخلاق اور کبھی تواریخ کا نام لے لے کر غلط اور بے بنیاد افواہیں اڑائی جاتی ہیں تاکہ لوگوں کی ہمدردی ان کے ساتھ نہ ہونے پائے۔ دراصل اس تحریک کے ساتھ حکمران اور سرمایہ دار جماعت کی طرف سے شروع ہی سے ایسا سلوک ہوتا چلا آیا ہے۔ اس لئے ان حالات کا جن میں یہ تحریک شروع ہوئی اس کی مختصر تاریخ اور مرحلے جن میں سے یہ گزری ہے اور تھوڑا سا حال بالشوزم کا یہاں بتانا ضروری سمجھتے ہیں ؎

موجودہ صنعتی سسٹم ہمیشہ سے نہیں چلا آیا۔ اور مزدور اور سرمایہ دار کا موجودہ تعلق بھی انیسویں صدی ہی کی پیدائش ہے تاریخ کے درمیانی زمانہ میں تمام صنعتی اشیاء کاریگر لوگ اپنے اپنے گھروں میں بناتے تھے۔ اور اس کام میں ان کا سارا کنبہ شامل ہوتا تھا۔ بچے

اور عورتیں بھی کسی نہ کسی طرح اپنے گھر کے مردوں کو کام میں ہاتھ بٹانے کا کام دیتی تھیں اور چیزوں کی فروخت کا کام بھی کاریگر کو ہی کرنا پڑتا تھا۔ جس کا نتیجہ یہ تھا کہ دلالی میں روپیہ نہیں چلا جاتا تھا۔ بلکہ سب کا سب کاریگر کو ملتا تھا۔ کاریگر ایک خودمختار معزز شہری کی حیثیت رکھتا تھا۔ ایک دو صدیوں کے دور میں اس سسٹم میں یہ تبدیلی آئی کہ فروخت کا کام ہر ایک پیشہ کی پنچایت کے ہاتھ آ گیا۔ ان پنچائتوں کو Guilds کہتے تھے۔ اور آہستہ آہستہ یہ گلڈ اتنے زبردست ہو گئے کہ ہر ایک پیشہ میں آدمیوں کی تعداد مقرر کرنا۔ اُن کی بنائی ہوئی اشیا کی قیمت کا تقرر۔ شاگرد بٹھانا اور چیز کی ساخت اور فروخت کے لئے قواعد بنانا یہ سب کام اُن کی طرف سے ہونے لگ پڑے۔ لیکن چونکہ گلڈ کاریگر پیشہ وروں پر ہی مشتمل تھا اس سے اُن کو چنداں حرج نہیں پہنچتا تھا۔ بلکہ کچھ فائدہ ہی رہتا تھا۔ اور اُن کی حیثیت میں بھی کوئی فرق واضح نہ ہُوا۔ تیرہویں اور اٹھارھویں صدی میں رواج کے کمزور ہو جانے آبادی کے بڑھ جانے اور شخصی اور مذہبی آزادی کے ہر دلعزیز ہو جانے سے گلڈ کمزور ہو گئے۔ اور آخر کار کاریگر اور ہاتھ سے کام کرنے والے مزدور بھی اپنی قسمت کے پورے مالک بن گئے۔ اور چیزوں کا بنانا پرانے ڈھنگ سے جاری رہا۔ ایک تبدیلی یہ ہوئی کہ جہاں وُہ پہلے اپنا خام مصالحہ اور اپنے اوزار لے کر چیز بنا کر بیچتے تھے۔ اب ایک دلال جماعت ایسی پیدا ہو گئی جس کا کام ہی یہ تھا کہ کاریگروں اور مزدوروں کو ہتھیار اور خام مصالحہ اُن کے گھروں میں پہنچاوے۔ اور مقررہ قیمت پر جو بازاری قیمت سے بہت کم ہوتی تھی اُن سے اشیاء خرید کر بازار میں خود بیچے۔

صنعتی انقلاب اور زراعتی انقلاب کے رونما ہونے سے یہ حالت بھی بدل گئی۔ اور چونکہ یہ تبدیلی ایسی تھی کہ پرانا سسٹم بالکل تباہ ہو گیا۔ اور اُس کے کھنڈرات پر سرمایہ داری کے موجودہ سسٹم کی بنیاد پڑی۔ اس لئے اس کو انقلاب کا نام دیتے ہیں۔

زراعت میں اس زمانہ میں زمیندار لوگوں نے دیہات کی شاملات زمینوں پر قبضہ جما کر ارد گرد حلقے بنا لئے جس سے عام کسانوں کے لئے چراگاہیں بند ہو گئیں۔ فن کاشتکاری میں جو نئے ڈھنگ سوچے گئے ان سے کامیابی حاصل کرنے کے لئے یہ ضروری تھا کہ چھوٹے چھوٹے کھیتوں کی بجائے بڑے بڑے کھیت ہوں۔ اس لئے زمیندار لوگوں نے غریب کسانوں (yeomen) سے زمینیں خریدنی اور چھیننی شروع کر دیں۔ ان باتوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ بیشمار کسان لوگ غریب اور مفلس ہو کر گاؤں چھوڑ کر شہروں میں آ بسے۔ یہ فوری نتیجہ تھا زراعتی انقلاب کا۔

صنعتی انقلاب نے صنعت و حرفت کے میدان میں ویسی ہی تبدیلی پیدا کر دی۔ اوزار کی جگہ مشین نے لے لی۔ اور مشین کو چلانے کے لئے (سٹیم) بھاپ اور پانی کی ضرورت تھی۔ اس لئے یہ لازمی ہو گیا کہ مشین کسی ایسی جگہ لگائی جائے جہاں پانی کی طاقت اور کوئلہ اور لوہا موجود ہو۔ گھریلو سسٹم اب کام نہیں دے سکتا تھا۔ جہاں مزدور پہلے اپنے گھر میں کام کر لیتا تھا۔ اب اس کے لئے ضروری تھا کہ کارخانہ میں کام کرے۔ گھر کی جگہ اب کارخانہ یا فیکٹری نے سنبھال لی۔ اور آہستہ آہستہ دیہات سے تباہ ہوئے برباد شدہ کسان لوگ اور شہری کاریگر اور مزدور بھی جن کو اب شہروں میں کام نہیں ملتا تھا کارخانوں میں نوکر ہونے شروع ہو گئے۔

یہ وُہ زمانہ تھا جس کو ہم صنعتی دَور میں سب سے تاریک زمانہ کہ سکتے ہیں۔ مزدوروں کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ چھوٹی چھوٹی عمر کے بچے اور عورتیں روزی کمانے کی خاطر کارخانوں میں کوڑیوں کے عوض بارہ چودہ گھنٹے روزانہ کام کرتی تھیں۔ تنگ اور سڑی ہوئی کوٹھڑیوں میں بیس بیس انسانوں کو گزارہ کرنا پڑتا تھا۔ اور عورتیں مرد ایک ہی کمرے میں رہنے پر مجبور ہوتے تھے۔ جس سے اُن میں شرم حیا کا مادہ ہی اُڑ جاتا تھا ۔

سرمایہ دار کارخانوں کے امیر مالک اس طرح اپنے ماتحت بے بس مزدوروں کی محنت سے لاکھوں روپیہ کمانے لگے۔ مزدوروں کی طرف اُن کے جذبات کا پتہ اس بات سے چلیگا کہ انگریزی میں اب تک مزدور کے لئے لفظ Hand یعنی ہاتھ موجود ہے۔ مالک کارخانہ کبھی یہ سمجھ ہی نہیں سکتا تھا کہ وُہ زندہ۔ پہلو میں دل رکھنے والے انسان ہیں۔ وُہ اُن کو صرف کام کرنے والے ہاتھ ہی سمجھتا تھا۔ جب مزدوروں نے اپنی بے بسی سے تنگ آکر آپس میں ایک ٹریڈ یونین کا نظام باندھنے کی کوشش کی تب کارخانوں کے مالکان کی طرف سے (جو کہ خود ہی حکمران جماعت تھے) Combination Laws یا اکٹھے ہونے کے قوانین انیسویں صدی کے شروع میں پاس کئے گئے جن کی رُو سے یُونین بنانا جرم قرار دیا گیا۔ اور اس جرم کے لئے سخت سے سخت سزا حتیٰ کہ پھانسی تک بھی مقرر کی گئی ۔

یہ زمانہ تھا اور یورپ اور خاص کر انگلینڈ کی مزدور پیشہ جماعت کی یہ حالت تھی۔ جب وہاں سوشلزم کی بنیاد پڑی۔ پڑھے لکھے درد دل رکھنے والے کئی ایک مرد ایسے صنعتی دور کی ہی سخت مخالفت

شروع کرنے لگ پڑے۔ جس میں مزدور کو انسان کا رتبہ نہیں دیا جاتا۔ اور جہاں سارے کا سارا منافع مالک کارخانہ کے جیب میں چلا جاتا ہے۔ اور چونکہ کسی زمانے کا صنعتی سسٹم اس زمانے کے مذہبی۔ مجلسی اور ملکی سسٹم کے ساتھ وابستہ ہوتا ہے۔ اس لئے آہستہ آہستہ سوشلیسٹ لوگ سوسائٹی کی ہر ایک انسٹی ٹیوشن کی مخالفت پر آمادہ ہو گئے۔ وہ اپنے خیالات کے مطابق نئی نئی سکیمیں سوچنے لگ پڑے۔ جن کے مطابق چلنے سے اس مزدور جماعت اور سوسائٹی کا اُن کے خیال میں بھلا ہو سکتا تھا۔ بعض کے خیال تو بہت ہی مضحکہ خیز تھے۔ کئی سکیمیں تو نہایت ہی لچر تھیں۔ اور باقی تقریباً تمام کی تمام ناممکن العمل تھیں۔ اس لئے پہلے شوشلسٹوں کو انگریزی میں utopian شوشلسٹ یعنی دقیانوسی شوشلسٹ کہتے ہیں۔ ان میں سے چند مشہور لیڈروں کے نام یہ تھے۔ رابرٹ اوون تھامس اور فوریر اور سینٹ سائمن۔ Saint Simon۔ پہلے دو انگریز تھے۔ اور پچھلے دو فرانس کے رہنے والے۔ اگرچہ انکی سکیمیں لچر اور ناممکن العمل تھیں اُن کی جائداد۔ میراث۔ منافع اور سرمایہ دار جماعت کے بارے میں جو خیالات تھے وہ بڑے وزن دار تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ انسان خصلتاً نیک پیدا ہوتے ہیں۔ لیکن اُن کی قدرتی نیکی سخی کی جائداد مذہب اور شادی کی رسم سے تباہ ہو جاتی ہے۔ اس لئے وہ چاہتے تھے یہ تینوں چیزیں سوسائٹی سے اُڑادی جائیں۔ سائمن کے خیال میں پرائیویٹ جائداد چوری ہے۔ اور چوری کرنے سے یا مزدوروں کے لوٹنے سے اس کی بنیاد پڑتی ہے۔ مثلاً اگر دس مزدور سرمایہ دار کو پانچ جوڑے بوٹوں کے بنا کر دیتے ہیں اور وہ بوٹوں کو تو پانچ روپیہ فی جوڑہ

کے حساب سے بیچ دیتا ہے۔ لیکن مزدوروں کو ایک روپیہ فی مزدور دیتا ہے تو اس کارخانہ دار نے فی مزدور چار روپیہ کی چوری کی ہے۔ اور اس طرح دن دہاڑے چوری اور ڈاکہ سے وہ بیج کی جائداد بنانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ زمین کی ملکیت سوسائٹی کی ہونی چاہیئے۔ اور سوسائٹی کو اس کی کاشت کا انتظام کرنا چاہیئے۔ جائداد کبھی اولاد کو ورثہ میں نہیں ملنی چاہیئے۔ اس سے نہ صرف اولاد خود کمانا نہ سیکھ کر کاہلوں اور نکموں کی تعداد میں اضافہ کرتی ہے۔ بلکہ قدرتی اشیا اور دولت کا سوسائٹی کو ٹھیک فائدہ نہیں پہنچتا۔ مثلاً اگر ایک شخص بڑی زرخیز زمین ورثہ میں لیتا ہے۔ اور خود اس کو کاشت کرنے یا کرانے کا شوق نہیں تو اس کی زمین کی پیداوار بہت کم ہو جائیگی۔ اور سوسائٹی کے لئے غلہ کی مقدار کم پیدا ہوگی۔ اور اگر ورثہ کا سسٹم نہ ہو اور زمین ملک کی طرف سے ایسے شخص کو دی جاوے جو نہایت اچھا کاشتکار ہو تو ملک کو بہت فائدہ رہیگا۔ ان خیالات کا بڑا پرچار ہوا۔ اور بڑے بڑے فلاسفر آگسٹ کومٹ بھی سینٹ سائمن کے خیالات سے اثر پذیر ہونے سے نہ بچ سکے لیکن شادی کے بارے میں اُن کے خیال اُن اُن کے زوال کے سبب ہو گئے۔

ان پہلے سوشلسٹوں کی بابت جو خاص بات کہی جا سکتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ تعلیمی اور عملی تحریکوں کے ذریعے سوسائٹی کی حالت کو سدھارنا چاہتے تھے۔ وہ انقلاب پسند نہ تھے۔ اور نہ ہی سرمایہ دار اور برسر حکومت جماعت کے برخلاف جہاد کا پرچار کرتے تھے۔ وہ بلکہ حکمران جماعت کی امداد اور ہمدردی سے مزدور پیشہ جماعت کی حالت

کو سدھارنے کے خواہشمند تھے۔ اون (Owen) تو خود آپ ایک کامیاب کارخانہ دار تھا۔

سنہ ۱۸۳۰ء سے ۱۸۴۸ء کے سال یورپ کی تاریخ میں انقلابی سال ہیں۔ جب کہ سارے یورپ میں خاصکر فرانس میں بےچینی اور انقلابی جذبہ زوروں پر تھی۔ انگلینڈ میں چارٹسٹ تحریک شروع تھی۔ اور فرانس میں تو ۱۸۳۰ء و ۱۸۴۸ء میں دو موقعوں پر بغاوت بھی واقع ہو گئی۔ یورپ میں کوئی ہی ملک ہوگا جہاں ان بغاوتوں کی گونج کی صدا نہ اٹھی ہو۔ ایسے زمانے میں وقیانوسی utopian یا خیالی سوشلزم کی جگہ ایسے سوشلزم کا پرچار ہوا جس کی فلاسفی اپیل صرف خیالات اور ناممکن العمل سکیموں کے سوچنے تک ہی محدود نہ تھی۔ بلکہ جو امور واقعہ پر مبنی تھی۔ اور جس کے لیڈر اصلیت کی طرف زیادہ دھیان دیتے تھے۔ اس کو Realistic socialists کہتے ہیں۔ لوئس بلینک Louis Blanc اور پرودھن Proudhon اس سکول کے مشہور بانیوں میں سے گنے جاتے ہیں۔

لوئس بلینک کے خیال میں سب انسان برابر اور آپس میں بھائی ہیں۔ اس بات پر زور دیتا ہوا وہ یہ بات ثابت کرتا ہے کہ سوسائٹی میں تنخواہ یا معاوضہ انسان کے کام کے مطابق نہیں بلکہ اس کی ضروریات کے مطابق ملنا چاہیئے۔ اور کام ہر ایک کو اپنی توفیق کے موافق کرنا چاہیئے ایسا کرنے سے ہر ایک کی ضروریات پوری ہو جائیگی۔ اور کسی کو شکایت نہ رہے گی۔

وہ اس قسم کے سوشل کارخانوں کے حق میں تھا۔ جس میں مزدور اپنے جسمانی اور ذہنی قابلیت کے موافق جتنا کام کر سکتے ہیں کریں۔

اور جن میں مزدوری اُن کو اپنی ضروریات کے مطابق ملے۔ یہ کارخانے گورنمنٹ کی طرف سے جاری ہونے چاہئیں۔ ۱۸۴۸ء کے انقلاب کے موقعہ پر پیرس میں تھوڑے عرصہ کے لئے اِس قسم کے کارخانے کھولنے میں لوئس بلینک کامیاب بھی ہوگیا۔ پرودھن ایک قسم کا انارکیسٹ تھا۔ زمیندار اور صاحب جائداد لوگ جو اپنی پرائیویٹ جائداد کے حق میں یہ دلیل دیتے ہیں کہ وُہ اپنی محنت مزدوری اور مشقت سے جائداد بناتے ہیں۔ ان کے برخلاف پرودھن کی دلیل تھی کہ اگر مزدوری سے جائداد رکھنے کا حق پیدا ہوتا ہو تو جب ایک مزدور ایک آدمی کے باغیچے میں کام کرتا ہے تو اس مزدور کا اس باغیچہ پر کیوں نہ قبضہ تصور کر لیا جاوے! پرودھن اس بات کے بھی برخلاف تھا کہ سکے بطور ذریعہ تبادلہ ملک میں رائج کئے جاویں۔ وُہ چاہتا تھا کہ تبادلہ کے بینک ملک میں جاری کئے جائیں۔ جہاں لوگ مزدوری کے نوٹ Labour note جن پر جتنے گھنٹے انہوں نے کام کیا ہو لکھا ہُوا ہو لے کر جاویں۔ اور اُن کے بدلے اُن کو ضروریات زندگی مہیا کی جاویں +

سوشلزم کی یہ حالت بھی قائم نہ رہ سکی۔ اور انیسویں صدی کے اخیر سالوں میں کارل مارکس نے جو کہ ایک جرمنی کے رہنے والا یہودی تھا اس جنگجو سوشلزم کی بنیاد رکھی جس کو اُس کے پیرو فخر سے "سائنٹیفک سوشلزم" کا نام دیتے ہیں۔ انجیل Engel لاسیل Lassalle اور امریکہ کا ہینری جارج۔ سب نے مارکس کے خیالات کا پرچار کرنے میں زبردست حصہ لیا ہے۔ مارکس کے سوشلزم میں یہ خوبی ہے کہ اس میں موجودہ صنعتی سسٹم کے برخلاف کوئی گالی گلوچ بلکہ لفظ چینی

بھی نہیں - سرمایہ دار کی تعریف کی گئی ہے کہ اُس نے تواریخ کے ایک زمانہ میں ضروری خدمات ادا کی ہیں - ارتھ شاستر کے اصولوں کو بھی دھتکارا نہیں گیا - بلکہ کارل مارکس نے اپنے خیالات کے لئے ریکارڈو کی جو کہ ارتھ شاستر کے بانیوں میں سے ہُوا ہے تھیوریوں کا سہارا لیا ہے لیکن باوجود موجودہ صنعتی سسٹم کو بُرا نہ کہنے کے وُہ موجودہ سرمایہ داری کو سب سے زیادہ بدنام کرنے میں کامیاب ہُوا ہے - کیونکہ بڑے ٹھنڈے دماغ سے - دلیل - تواریخ اور واقعات سے جن کی سچائی میں کسی کو انکار نہیں ہو سکتا اُس نے سرمایہ داری کا اس طرح خاکہ کھینچا ہے - اور تقسیم اجزا کی ہے کہ سرمایہ دار خود ہی پڑھنے والے کی آنکھوں کے سامنے ایک خون آشام چمگادڑ کی طرح نظر آنے لگ جاتا ہے - جس کا کہ خاتمہ جلدی ہونے والا ہے +

کارل مارکس کے سوشلزم کی ایک اور خوبی یہ ہے اور دراصل یہی اُس کے سوشلزم کی خاص نشانی ہے - کہ اُس میں سوائے مزدور پیشہ اور اور غریب طبقہ لوگوں کے اور کسی کی گنجائش نہیں ہے - کارل مارکس کا سوشلزم غریب لوگوں کا سوشلزم - Proletarian Socia-lism ہے - کارل مارکس سے پہلے سوشلسٹ لوگ موجودہ تقسیم دولت کے برخلاف جنگ کرتے تھے - وُہ انصاف چاہتے تھے - کارل مارکس نے مزدور اور سرمایہ دار امیر اور غریب کے درمیان جنگ کا اعلان کیا ہے - وُہ امیر اور غریب جماعتوں میں خانہ جنگی کا پرچار کرتا ہے - اس کا نعرہ جماعتوں کا جنگ (Class war) ہے - اور یہی مسئلہ ہے جس سے کارل مارکس کے خیالات دنیا کے تمام ممالک کے مزدوروں

میں ہر دلعزیز ہو گئے ہیں۔ اور جو اُن کو سوسائٹی کے امن و امان کے لئے نہایت خطرناک بناتے ہیں +

تیسرا وصف کارل مارکس کے سوشلزم کا یہ ہے کہ اس کا مدعا دنیا بھر کے مزدوروں اور غریبوں کو ایک جھنڈے کے نیچے جمع کرنا ہے۔ وُہ ملکوں کی تفریق کو مٹا دینا چاہتا ہے۔ وُہ اشخاص میں انگریز۔ روسی اور جرمن کا امتیاز نہیں دیکھنا چاہتا۔ بلکہ امیر اور غریب کا۔ سرمایہ دار اور مزدور کا۔ انگریز مزدور اور غریب آدمی کو۔ روسی مزدور اور غریب آدمی کے ساتھ کوئی ضد و دشمنی نہیں ہونی چاہئے۔ دونوں غریب ہیں اور سرمایہ دار کے ہاتھوں نالاں ہیں۔ اس لئے ان کو آپس میں اتفاق کر کے مشترکہ دشمن کے ساتھ مقابلہ کرنا چاہئے۔

کارل مارکس نے سوشلزم کی ان خاص باتوں کا ذکر کر کے اب ہم اُسکے سرمایہ داری کے سسٹم کے خاتمہ کے متعلق جو خیالات ہیں اُن کا تذکرہ کرنا چاہتے ہیں۔ کارل مارکس صنعتی تواریخ پر نظر ڈالتا ہُوا لکھتا ہے کہ پہلے وقتوں میں گھریلو طریقہ دستکاری جب رائج تھا۔ تو ملکیت بہت سے آدمیوں میں تقسیم تھی۔ ہر ایک گھر صنعت و حرفت کا ایک چھوٹے سے پیمانے پر مرکز تھا۔ مزدور مالک ایک ہی شخص ہوتا تھا۔ لیکن صنعتی انقلاب نے گھر کی جگہ کارخانہ قائم کر دیا۔ اور کاریگر لوگ وہاں کام کرنے لگ پڑے۔ جہاں پہلے لاکھوں آدمی چھوٹے چھوٹے پیمانہ پر سرمایہ داری کا کام کرتے تھے یعنی خود مختارانہ ملکیت رکھتے ہوئے صنعتوں میں مشغول تھے۔ اب اُن کی جگہ چند ہزار بڑے سرمایہ داروں نے لے لی۔ لیکن موجودہ سرمایہ داری میں مقابلہ بہت سخت ہے۔ اور اس سخت مقابلہ سے تمام چھوٹے چھوٹے کارخانہ دار تباہ ہو رہے ہیں۔ اور اُن کی جگہ بڑے بڑے کارخانے لے رہے ہیں۔

صنعت وحرفت اور کارخانہ چلانے کی باگ ڈور بھی آہستہ آہستہ چند آدمیوں (ڈائرکٹر وغیرہ) کے ہاتھ آرہی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ نکل رہا ہے کہ تمام ملک میں ایسے کیمپ قائم ہو رہے ہیں جن میں جہاں ایک طرف لاکھوں مزدور اکٹھے رہ کر کام کرتے ہیں۔ اور دوسری طرف ایک یا دو ڈائرکٹر یا الک اس کی نگرانی میں مشغول ہیں۔ اس لئے جب مزدور لوگ تنگ آکر انقلاب کرنے پر آمادہ ہوں گے۔ تو ان کے لئے کام بڑا سہل ہوگا۔ صرف ایک دو آدمیوں کو ہی برطرف کرنا ہوگا اور سارا کارخانہ اُن کے ہاتھ آجائیگا۔ اور وہ مالک بن جائینگے۔ اس طرح موجودہ سرمایہ داری کا خاتمہ بڑے امن امان سے خود بخود چند سالوں میں ہو جائے گا۔

سرمایہ داری کو تباہ کرنے والا مصالحہ سرمایہ داری کے سسٹم کے اندر خود موجود ہے کسی بیرونی دشمن کی ضرورت نہیں۔

کارل مارکس کا تواریخ کے متعلق وچار ہے۔ کہ اس کی بنیاد اقتصادی ضروریات پر مبنی ہے یعنی تمام مذہبی مجلسی اور ملکی انسٹیٹیوشن کسی نہ کسی اقتصادی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے جاری ہوئے ہیں اس طرح سے وہ روحانیت اور انسانی جذبات کو علیحدہ درجہ دینے کے لئے طیار نہیں ہے۔

روس میں سوشلسٹ لوگوں نے انقلاب کرکے حکومت سنبھال لی ہے۔ اور جن کو بولشویک کہتے ہیں۔ وہ دراصل کارل مارکس کے جوشیلے پیرو ہیں۔ بالشویک کے لفظی معنی بہت با کثرت ہیں۔ انقلاب شروع ہونے سے پہلے روس میں سوشلسٹ لوگوں کی دو پارٹیاں تھیں۔ ایک

وہ جو تھوڑی سی اصلاحات سے خوش ہو جانے کو تیار تھے۔ ان کا اصلاح کا پروگرام minimum Reforms یا کم سے کم اصلاح کے حق میں تھا۔ اُن کو روسی زبان میں مینشویک menshaviks کہتے تھے۔ ان کے مقابلہ میں جو زیادہ سے زیادہ تبدیلیوں کے حق میں تھی ان کو Maximulist اور بعد ازاں بالشویک کہنے لگ پڑے۔ جب روسی فوج میں بغاوت ہوئی تو مینشویک لوگوں نے عنان حکومت سنبھال لی لیکن چونکہ اتحادیوں کے زیر اثر ہونے کے سبب سے وہ جنگ کو جاری رکھنا چاہتے تھے۔ حالانکہ تمام روسی فوج اور روسی کسان جنگ سے تنگ آئے ہوئے تھے۔ اور اسی لئے فوج نے بغاوت کی تھی۔ اس لئے فوج بالشویکوں کی طرف ہو گئی۔ اور وہ حکومت سنبھالنے میں کامیاب ہو گئے۔ اتحادیوں کی بیشمار کوششوں کے باوجود وہ روس میں اپنا اقتدار قائم رکھے ہوئے ہیں۔ خیر ہم نے پولیٹیکل تواریخ کا یہاں تذکرہ نہیں کرنا۔ یہاں صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ بولشوزم کوئی نئی چیز یا فلاسفی نہیں ہے۔ کارل مارکس کے سوشلزم کو عملی صورت میں لانے کی یہ کوشش ہے اور یہ ماننا پڑیگا کہ سوشلزم کے بہت سے اصولوں کو عملی زندگی میں کامیاب دکھانے میں بالشویک لوگ روس میں بہت حد تک کامیاب ہوئے ہیں۔ روس کی ساری زمین گورنمنٹ کی ملکیت قرار دی گئی ہے۔ اور کاشت کرنے والے کسانوں کے درمیان کاشت کے لئے بانٹ دی گئی ہے۔ کارخانوں کے مالک عیش و عشرت میں رہنے والے ایک دو امیر روسی نہیں ہیں۔ بلکہ اس کارخانے میں کام کرنے والے مزدور اب منافع کے حصہ دار ہیں۔ اور کہ ملک میں کسی شخص کے نوکر کی حیثیت سے کام نہیں کرتے ہیں۔

امیر اور درمیانی طبقہ جو اب تک حکومت کرتا رہا ہے۔ اب غریب اور مزدور جماعت کی خدمت کر رہا ہے یا ملک چھوڑ کر بھاگ گیا ہے۔ کارل مارکس کے class war جماعتوں کی جنگ پر پورا عمل درآمد کیا گیا ہے۔ اور روسیوں کا جنگی نعرہ Proletarmate of all lands unite تمام ملکوں کے غریب لوگو! متحد یا اکٹھے ہو جاؤ۔ جہاں بھی بولا جاتا ہے سرمایہ دار جماعت کے نقطہ خیال سے ایک خطرناک اثر پیدا کر دیتا ہے بولشویکوں کا دعوےٰ ہے کہ اگر مزدور اور سپاہی اُن کی تعلیم سے بہرہ ور کئے جاویں تو وُہ کبھی بھی سرمایہ داروں کے اوزار بن کر دوسرے ملک میں رہنے والے اپنے مزدور اور سپاہی بھائیوں کا گلہ کاٹنے کے لئے طیار نہ ہوں کیونکہ اُن کا آپس میں کوئی جنگ نہیں ہے۔ جنگ دراصل ایک ملک کے سرمایہ دار کا دوسرے ملک کے سرمایہ دار کے ساتھ ہے۔ اور اُن دونوں کی ہوس ملک گیری اس جنگ کی تہ میں ہے۔ اس لئے جب تک سرمایہ داری کا موجودہ طریقہ سوسائٹی میں رائج رہیگا۔ جنگ بند نہیں ہو سکتے۔ وُہ موجودہ یورپین جنگ کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور کہتے ہیں دیکھو سرمایہ دار اور امیر جماعتوں نے ایک دوسرے کے برخلاف اعلان جنگ کیا "ملک خطرے میں ہے۔ قوم تمہاری قربانی چاہتی ہے" وغیرہ جنگی اور جوش دلانے والے نعرے لگائے گئے۔ اور غریب جاہل بے قصور کسانوں اور مزدوروں کو اُن کے گھروں سے نکال کر فوج میں بھرتی کر کے ذبح خانہ میں بھیجا گیا۔ تاکہ وُہ توپوں کے لئے چارہ کا کام دیں۔ وہاں انہوں نے ایک دوسرے کے گلے کاٹے اور کٹوائے۔ لاکھوں چھوٹے چھوٹے بال بچوں کو یتیم اور عورتوں کو لاوارث اور بیوہ کر کے مر گئے۔ لاکھوں اپنے اعضاء تڑوا کر بیکار

گھر بیٹھے ہوئے ہیں۔ ہزاروں قید کی مشقتوں میں سہے۔ اور نتیجہ کیا نکلا ؟ یہی کہ ایک ملک کے سرمایہ دار دوسرے ملک کے سرمایہ داروں سے تیل کے چشمے۔ آبادیاں اور تاوان لینے میں کامیاب ہو گئے۔ اور غریب ویسے کے ویسے غریب ہی رہے۔ بلکہ الٹا سرمایہ داروں کا طوق غلامی اپنے اوپر اور مضبوط کر لیا۔ کیا دریائے رائن کے رہنے والے غریب شمال کسان کی لورپول کے رہنے والے غریب تھامس مزدور کے ساتھ کوئی دشمنی تھی کہ اولذکر نے دوسرے کو گولی مار کر اس کے بچوں کو یتیم کر دیا۔ اور اس کی عورت کو بیوہ اور اُس کے بوڑھے ماں باپ کو زندہ درگور ؟ یہ ہے بالشوزم کی تعلیم دنیا کے ہر ایک حصہ میں رہنے والے مزدوروں کے لئے اور اِس کے اثر کا اندازہ وہی لوگ لگا سکتے ہیں۔ جن کے لئے غریبوں کے لئے ہمدردی ہے یا جن کو غریبوں کی مصیبتوں کا کچھ علم ہے ۔

بالشوزم میں مذہب کے بر خلاف کوئی اصولی تعلیم نہیں ہے لیکن چونکہ دنیا کی تواریخ میں سرمایہ دار اور امیر جماعت نے مذہب کا نام لے کر غریبوں کو طوق غلامی میں رکھنے کی لگاتار کوشش کی ہے۔ اس لئے بالشویک لوگ مذہب کو شبہ کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ گرجوں پر قبضہ کرنا اور سرمایہ دار جماعت کے مددگار اور در اصل اُن کے ساتھ رشتہ میں منسلک پادریوں کو وہاں سے نکالنے کا کام اس لئے بالشویک لوگوں نے فوراً با اختیار ہوتے ہی کرنا ضروری سمجھا۔

مذہب کی آڑ کس طرح سرمایہ داروں نے لی۔ اس کی تشریح بالشویک لوگ یوں کرتے ہیں۔ کہ جب سرمایہ داروں نے دیکھا کہ اُن کے پاس دولت ہے زمین ہے اور وُہ تعداد میں بہت تھوڑے ہیں۔ اور اس

طرح اپنے مفاد کی حفاظت نہیں کر سکتے تو جہاں انہوں قانون اپنی جائداد کی حفاظت کے لئے بنائے اور مجرموں کو سخت سزائیں دیکر قابو میں رکھنا شروع کیا وہاں انہوں نے مذہب کا آسرا لینا بھی ضروری سمجھا کیونکہ قانوں کی اطاعت قانون سے ڈر کر دیرپا نہیں ہوسکتی سوسائٹی میں اگر کثیر حصۂ آبادی امن پسند اور قانون شکن نہیں تو اس کی وجہ یہ نہیں کہ وُہ سزا کے خوف کے مارے امن پسند ہیں۔ اُن کی امن پسندی کی ذمہ وار اُن کی اخلاقی تعلیم اور مذہبی و روحانی جذبات ہیں۔ اس لئے سرمایہ داران نے جو قانون اپنی حفاظت کے لئے بنائے اُن کی تائید مزید کرانے کے لئے خدا کا ایک ڈھونگ رچا گیا اور اُس کی طرف سے بھی وہی باتیں کہلائی گئیں "چوری کرنی گناہ ہے" "دوسرے کا مال چھینا معیوب ہے" غریبوں نے ایک دوسرے سے تو مال چھینا ہی نہیں ہے۔ اُن کے پاس رکھا ہی کیا ہے۔ اس لئے ان نصیحتوں کا سوائے اس کے اور کوئی مطلب نہیں ہوسکتا کہ امیر آدمیوں اور سرمایہ داروں کو مت لوٹو۔ بھوکے بے شک مرجاؤ۔ غریبوں کی مزید تسلی کے لئے اُن کو یہ بتایا گیا کہ امیر غریب کی روح ایک ہے۔ سب برابر ہیں۔ اور آسمان کی بادشاہت غریبوں کی ہے۔ غریب مزدور جو سارا دن کام کرکے بھی رات کو رنیا اور اپنے ننھے بچوں کا پیٹ نہیں بھر سکتا۔ اور اپنے سامنے آسمان سے باتیں کرتے ہوئے عالیشان محل کے عالیشان کمروں میں دعوتیں اُڑتی ہوئی دیکھتا ہے۔ دل میں ایک لمحہ کے لئے رنج وغصہ پیدا کرتا ہے۔ لیکن اپدیش کو یاد کرکے خاموش ہو رہتا ہے۔ وُہ بسا اوقات ایسی تسلی سے خوش ہو جاتا ہے کہ اگلے جنم میں وہ سوچیں اڑائیگا

اور امیر آدمی بہشت میں داخل ہی نہیں ہوسکیگا۔

غریب مزدوروں کے خیالات کو اپنی طرف سے ہٹانے اور ایک طرف لگائے رکھنے کے لئے ہی امیر طبقہ نے گرجوں اور پادریوں کا ایک جال سا ملک میں پھیلا رکھا ہے۔

پادری دراصل اس طبقہ کے تنخواہدار ایجنٹ ہیں۔ جن کا دن رات کا یہ کام ہے کہ غریبوں کی توجہ کو خدا اور اُس کے فرضی اپدیشوں کی کی طرف لگائے رکھیں۔ تاکہ سرمایہ دار جماعت اپنی توجہ کو دولت جوڑنے اور ہر ممکن طریقہ سے اُن کا خون نچوڑنے کی طرف بیفکری سے لگا سکے ✣

یہ ہیں بالشویک لوگوں کے خیالات مذہب کی طرف۔ اِن کو پڑھکر حیرانی نہیں ہونی چاہئے۔ جب سوسائٹی ایک طوق غلامی کو پرے پھینک دیتی ہے تو قدرتاً نئی حاصل کی ہوئی آزادی کے جوش میں اُس سوسائٹی میں ہر قسم کی بند ستوں کو دور کرنے کی خواہش پیدا ہو جاتی ہے۔ جب فرانس کے اندر ۱۷۸۹ء میں انقلاب ہُوا تھا تب بھی اس قسم کے خیالات ظہور میں آئے تھے ✣

سوشلزم کے بیان کو ختم کر دینے سے پہلے ہم یورپ میں جاری شدہ ایک اور تحریک کا بھی یہاں ذکر کر دینا چاہتے ہیں۔ جن کو کئی لوگ غلطی سے سوشلزم کی شاخ سمجھ لیتے ہیں۔ ہمارا مطلب انارکزم کی تحریک سے ہے انارکسٹ سکول کے مشہور بانی شہزادہ کروپٹکن و بیکونین ہوئے ہیں (Kroptkin and Bakumin) ولایت کا مشہور فلاسفر ہربرٹ سپینسر بھی انارکسٹ خیالات رکھتا تھا ✣

سوشلزم اور انارکزم میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ سوشلسٹ

لوگ تو یہ چاہتے ہیں کہ سوسائٹی کی اصلاح کے لئے موجودہ انفرادی کوششیں چھوڑ کر ملک کی گورنمنٹ کو سب کچھ کرنا چاہیئے۔ ملکیت شخصی نہیں بلکہ سوسائٹی کی مشترکہ ہونی چاہیئے۔ وغیرہ لیکن انارکسٹ شخصی آزادی کے لئے سب کچھ قربان کر دینا چاہتے ہیں۔ ہر ایک شخص آزاد ہونا چاہیئے۔ فوج۔ پولیس اور گورنمنٹ کا ہر ملک میں خاتمہ ہو جانا چاہیئے۔ کیونکہ کسی کا حق نہیں کہ دوسرے کو کوئی کام کرنے پر مجبور کرے۔ ایک انارکسٹ کا مقولہ ہے کہ سب سے بڑی اصلاح جو ایک گورنمنٹ کر سکتی ہے وہ یہ ہے کہ اپنا خاتمہ کرے۔ فوج پولیس اور گورنمنٹ کی مشین کی ضرورت سوسائٹی میں اس لئے پڑتی ہے کہ مجرموں کو سزا دی جائے۔ اور برائی کو دور کیا جائے لیکن تجربہ بتلاتا ہے کہ جتنا گورنمنٹ کا عمل ایک ملک میں بڑھتا ہے اتنی ہی جرائم میں زیادتی ہوتی ہے۔ برائی کو دور کرنے کی نسبت بُرائی کا پیدا ہی نہ ہونے دینا بہتر ہے۔ اور اس کا واحد طریقہ یہ ہے کہ پہلے تو اُس بڑی برائی کو دور کو کیا جاوے جو ملک میں گورنمنٹ کی شکل میں موجود ہے۔ اور دوسرے ہر محلہ اور ہر گلی میں آزادانہ پنچائتیں اور کمیٹیاں بنائی جائیں جو مشترکہ بہبودی کا سارا کام اپنے محلہ اور گلی کے لئے کریں۔ مرکزی کمیٹی یا گورنمنٹ نہیں ہونی چاہیئے۔

انارکزم کی اس تعلیم کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ یورپ میں ایک گروہ اس تنظیم کا پیدا ہو گیا ہے جو سرکاری افسروں پولیس اور فوج کے آدمیوں کو ہر ممکن طریقہ سے قتل کر دینا ایک متبرک فرض سمجھتا ہے کسی ذاتی یا ملکی ضد سے نہیں بلکہ صرف دنیا سے برائی دور کرنے کے لئے۔ انارکسٹ جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے ہر ایک شخص کو جس کا گورنمنٹ کے ساتھ

تعلق ہے برائی کا نمایندہ Representative سمجھتا ہے
سب کو قتل کر دینے سے وُہ برائی کو کچھ درجہ کم کر کے اپنا فرض پورا کر
لیتا ہے +

ٹولسٹائی مشہور روسی مہاتما بھی اپنے خیالات میں انارکسٹ تھا لیکن
دوسرے انارکسٹ لوگوں سے اُس کا یہ اختلاف تھا کہ وُہ تشدد
(Violence) کے سخت برخلاف تھا۔ وُہ اپنا مدعا پرامن
جنگ سے کرنا چاہتا تھا سوشلزم کا ذکر کرتے ہوئے ولایت کی فیبین
Fabian سوسائٹی اور جرمنی کے state socialist
ملکی سوشلسٹ کا ذکر نہیں کیا گیا۔ ان کو سوشلسٹ لوگوں میں ماڈریٹ
سوشلسٹ سمجھنا چاہیئے جو آہستہ آہستہ بتدریج اصلاح کے حق میں ہیں
اوپر دیئے ہوئے سوشلزم کے بیان سے یہ ہرگز نہیں سمجھ لینا چاہیئے کہ اُن
کی سب دلیلیں وزن دار اور بیان سچائی پر مبنی ہیں۔ مزدوری کو ہی
دولت پیدا کرنے کا ایک سادھن سمجھ لینا پرلے درجے کی بھول ہے۔ اور
اور ایسی بھول میں پڑ کر کارل مارکس نے سرمایہ داری کی بھدی تصویر
کھینچی ہے۔ لیکن یہ موقعہ سوشلزم کی تردید میں یا تائید میں لکھنے کا نہیں
اس مضمون پر ایک علیحدہ دلچسپ کتاب لکھی جا سکتی ہے۔ ہم نے یہاں سوشلزم
کی تشریح اُن کی اپنی ہی زبانی بیان کی ہے۔ اور نہ کہ اُن کے دشمنوں
کی زبان سے جیسا کہ عام طور پر کیا جاتا ہے اقتصادی طور پر اس تحریک
کی تہ میں کتنی سچائی ہے اور کتنی غلط بیانی۔ یہ اس کتاب کے پہلے اوراق
کے پڑھنے سے خود بخود ناظرین پر روشن ہو جائیگا +

حصۂ چہارم

ملکی محاصل

PUBLIC FINANCE

Public Finance

مُلکی محاصل

ہرایک سنستھا کے لئے روپیہ کی ضرورت ہے۔ گورنمنٹ بھی ایک سنستھا ہے۔ اور اس کے چلانے کے لئے بھی روپیہ کی ضرورت ہے۔ ویسے بھی گورنمنٹ سوسائٹی کے مختلف طبقوں کے لئے مختلف طریقوں سے روپیہ کا کمانا ممکن بناتی ہے۔ اور اس لحاظ سے سوسائٹی کے کمائے ہوئے روپیہ میں سے وہ بھی حقدار ہے۔ اگر گورنمنٹ نہ ہو تو سوسائٹی کی مشین کے مختلف پرزے چلنے سے رہ جائیں۔ اس لئے سوسائٹی کے کاموں کو چلانے کے لئے گورنمنٹ کا چلانا بھی ضروری ہے۔ ایک دوسرے نقطۂ نگاہ سے بھی گورنمنٹ کو روپے کی ضرورت اور سوسائٹی کے مختلف افراد کو اس روپیہ کے ادا کرنے کی واجبیت دیکھی جا سکتی ہے۔ سوسائٹی کے کام ایسے ہیں جن کو انفرادی حیثیت سے نہیں کیا جا سکتا ہے۔ راستوں کا صاف رکھنا۔ پلوں کا بنانا عوام الناس کے لئے مختلف دیگر آسانیاں بہم پہنچانا ایسے کام ہیں جو اگر لوگوں کی مرضی پر چھوڑ دئے جائیں تو اوّل تو پورے ہی نہ ہوں یا بہت ہی بری طرح کئے جائیں۔ اس لئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ سوسائٹی اپنے نمائندہ گورنمنٹ کے ذریعے ایسے کام کرلے۔ اور ان کا خرچ مختلف طریقوں سے وصول کرے۔

گورنمنٹ یہ خرچ مختلف طریقوں سے پورا کر سکتی ہے۔ سرکاری جائداد کی آمدنی سرکاری تجارتی محکموں کی خالص آمدنی۔ دئے ہوئے قرضوں کا سود

قرضہ۔ اِدھر اُدھر سے معمولی رقموں کی بچت اور ٹیکس یہ مختلف ذریعے ہیں۔ جن سے کہ ایک گورنمنٹ اپنا خرچ پورا سکتی ہے۔ قرضہ ایک ایسا ذریعہ ہے جو کہ گورنمنٹ کبھی کبھی ہی اختیار کرتی ہے۔ اس کو چھوڑ کر باقی ذرایع کو ہم دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں ٹیکس اور دیگر ذرائع ان دونوں کی تفریق کا سمجھنا ضروری ہے +

ٹیکس گورنمنٹ کا وُہ مطالبہ ہیں جو یہ مختلف لوگوں یا جماعتوں سے لازمی طور پر اپنی عام خدمات کے عوض وصول کرتی ہے۔ یا یوں سمجھئے کہ یہ وُہ رقوم ہیں جو ہمیں بلا لحاظ اس کے کہ ہم گورنمنٹ کی مختلف آسامیوں سے کوئی خاص فائدہ اُٹھاتے ہیں یا نہیں۔ اُس سوسائٹی کے ممبر رہنے کی حیثیت سے ہی دینی پڑتی ہیں۔ مثلاً دیکھئے ریل کے ٹکٹ کی قیمت اُس خدمت پر منحصر ہے جو کہ ہم ریلوں سے لیں گے۔ اور اگر ہم ریل کا سفر نہ کریں تو گورنمنٹ خواہ مخواہ ہم سے پیسے وصول نہیں کرے گی۔ لیکن گورنمنٹ نے ایسا انتظام کر رکھا ہے کہ ہم کچھ نہ کچھ ہر حالت میں اس کی نذر کرنے پر مجبور ہیں۔ اگر ہم زمیندار ہیں تو یہ ہم سے مالیہ وصول کرلے گی۔ اگر ہم اچھے خوش حال سوداگر یا پیشہ ور ہیں تو ہمیں انکم ٹیکس کی شکل میں کچھ نہ کچھ گورنمنٹ کی نذر کرنا پڑیگا۔ اگر ہم معمولی دیہات کے رہنے والے ہیں تو ہمیں چوکی دارہ ہی دینا پڑتا ہے۔ شہر میں ہیں تو کمیٹی کچھ مطالبہ لاکھڑا کرے گی۔ اور نہ سہی جب ہم نمک دال میں ڈالتے ہیں تو گورنمنٹ اس میں سے اپنا محصول نکال لیتی ہے۔ کیونکہ نمک بازار میں آتا ہی محصول دے کر ہے۔ باہر سے آئی ہوئی چیزیں خریدتے وقت بھی ہم اس کی جیب میں کچھ پیسے ڈال رہے ہوتے ہیں۔ کیونکہ اُن چیزوں کو ہندوستان میں داخل ہونے کی اجازت

ہی سرکاری محصول ادا کرنے پر ہوئی تھی اور وہ محصول ہماری قیمت خرید میں شامل ہے۔ غرضیکہ کسی نہ کسی شکل میں ہمیں گورنمنٹ کو ٹیکس دینے پڑتے ہیں۔ یہ تقسیم مندرجہ ذیل نقشہ سے سمجھ میں آجائیگی ؎

سرکاری آمدنی کے ذرائع

- معمولی
  - دیگر ذرائع
    - قرضہ جات کا سود
    - تجارتی مدّوں سے آمدنی ریلوے ڈاکخانجات وغیرہ
    - سرکاری جائداد سے آمدنی محکمہ جنگلات۔ کانوں پر ٹیکس
    - متفرقات دیسی راجوں سے خزانہ اور نذرانہ
  - ٹیکس
    - بلاواسطہ (معاملہ زمین انکم ٹیکس وغیرہ) (Direct)
    - بالواسطہ (محصول نمک۔ محاصل آبکاری محصول درآمد و برآمد وغیرہ) (Indirect)
- غیرمعمولی قرضہ جات وغیرہ
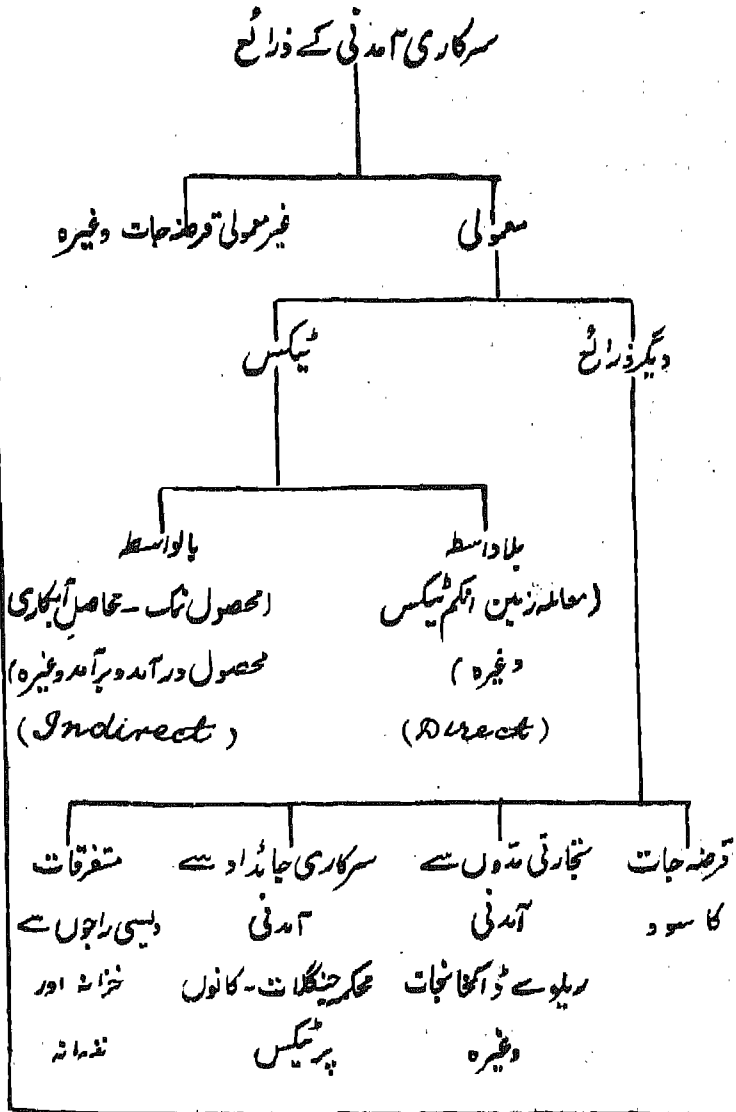
اس نقشے میں ٹیکسوں کے دو حصے کئے گئے ہیں۔ بلا واسطہ اور بالواسطہ۔ بلا واسطہ ٹیکس تو وُہ ہیں جو سرکار اُن لوگوں سے ہی وصول کرتی ہے۔ جن پر کہ آخرکار اُن کا بوجھ پڑتا ہے۔ یا یوں کہئے کہ جن کے ادا کرنے والا اُن کو آگے دوسرے لوگوں سے وصول نہیں کرسکتا ہے۔ مثلاً انکم ٹیکس یا معاملہ زمین۔ اور بالواسطہ ٹیکس وُہ ہیں جو وصول تو کئے جاتے ہیں کسی سے اور آخرکار اُن کا بوجھ پڑتا ہے کسی اور پر۔ مثلاً محصول آبکاری محصول تو شراب اور دیگر مسکرات کے ٹھیکہ داروں سے کیا جاتا ہے۔ لیکن لگتا ہے وُہ آخر اُن کو استعمال کرنے والوں کی جیبوں سے محصول درآمد و برآمد بھی اسی ذیل میں ہے۔

ہندوستان میں ٹیکس

ہر وقت ہی گورنمنٹ کو روپے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لئے مختلف ملکوں کے ٹیکس سسٹم ایک طرف تو ٹیکس کے متعلق موجودہ خیالات کا نتیجہ ہیں دوسری طرف اُن کی پرانی تاریخی وراثت ہیں۔ ہندوستان میں ہندؤں کے زمانے کے متعلق ٹیکسوں کا حال منوسمرتی یا ارتھ شاسنتر سے معلوم ہو جاتا ہے۔ اس میں معاملہ زمین محصول چنگی آمدنی پر ٹیکس ذاتی خدمات سب شامل تھیں۔ مسلمانوں نے بھی آکر اس ہی سسٹم کو معمولی تغیر و تبدیل کے بعد اختیار کرلیا۔ اور انگریزوں نے بھی پہلے پہل اس کو چلایا۔ یہی وجہ تھی کہ شروع زمانہ انگریزی عملداری میں معاملہ زمین سرکار کی ساری آمدنی کا تقریباً آدھا حصہ تھا۔ مسلمانوں اور ہندؤں کے عہد میں (مسلمانوں کے زمانے کی بابت تو معلومات پوری ہیں۔

اس لئے ان کی بابت یقینی طور پر کہا جا سکتا ہے) معاملہ زمین آمدنی کا سب سے بڑا ذریعہ تھا۔ اور قدرتاً وہ بہت سالوں تک ویسا ہی چلا آیا۔ اس وقت بھی معاملہ زمین کے ذریعے سے خالص آمدنی کا آدھا حصہ لے لینا بھی پرانے زمانے کی ایک یادگار ہے۔

موجودہ حالت

ہندوستان میں اس وقت ٹیکس لگانے کا اختیار تین جماعتوں کو ہے۔ گورنمنٹ ہند۔ صوبے کی گورنمنٹ اور مقامی جماعتیں صوبہ کی گورنمنٹو کو یہ اختیار نئی اصلاحات کے ذریعے سے حاصل ہوئے ہیں۔ اس سے پہلے گورنمنٹ ہند اور مقامی جماعتیں (میونسپل کمیٹیاں اور ڈسٹرکٹ بورڈوں) کو ہی یہ اختیار حاصل تھا۔ اس لئے ٹیکس سسٹم کا مطالعہ کرتے وقت ان تینوں کے لگائے ہوئے ٹیکسوں کا مطالعہ کرنا پڑیگا +

سرو بھاریہ ٹیکس

اس ضمن میں ٹیکس افیون۔ نمک پر ٹیکس۔ محصول درآمد برآمد محصول چونگی (گورنمنٹ ہند کا لگایا ہوا) انکم ٹیکس۔ سپر ٹیکس۔ ٹیکسوں کی قسمیں آتے ہیں۔ اور دیگر ذرائع کی مدیں۔ ریلوں سے آمدنی۔ جنگلوں سے آمدنی۔ محکمہ ڈاکخانجات اور ٹیلیفون سے آمدنی۔ سود۔ ٹیکسال سے آمدنی وغیرہ شامل ہیں۔ ان سب پر ایک نظر ڈالنے سے پہلے ایک اچھے ٹیکس کی ضروری صفات جاننا بھی ضروری ہے۔ اور وہ یہ ہیں +

(۱) ٹیکس سے آمدنی ہو۔ بات تو معمولی معلوم دیتی ہے لیکن اس کو کئی

دفعہ نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ ۱۸۱۵ء میں انگلستان میں ہی کئی ایسے ٹیکس تھے جن کی آمدنی ۵ یا ۱۰ پونڈ سے زیادہ نہیں تھی +

یاد رکھنے کے قابل بات یہ ہے کہ ٹیکس کی آمدنی اُس کے وصول کرنے کے خرچ سے کافی زیادہ ہونی چاہئے۔ اس لحاظ سے میونسپل کمیٹیوں کا لگایا ہُوا محصول چنگی سب سے زیادہ قصوروار ہے۔ کئی دفعہ تو اُس کو وصول کرنے کا خرچ وصولیات سے آدھا ہوتا ہے +

(۲) ہر ٹیکس اس قسم کا ہونا چاہئے کہ ہر ایک آدمی بلا کسی قسم کی تکلیف یہ معلوم کر سکے۔ کہ اس نے کیوں ٹیکس ادا کرنا ہے۔ کتنا ادا کرنا ہے۔ اور کس وقت ادا کرنا ہے۔ یہاں کے ٹیکسوں میں سے انکم ٹیکس غالباً اس بارے میں سب سے زیادہ قصوروار ہے۔ بہت کم لوگ اس کے مطالبات ٹھیک ٹھیک سمجھ سکتے ہیں +

(۳) ٹیکس اس قسم کا نہیں ہونا چاہئے جس سے کہ لوگ روپیہ جمع کرنا چھوڑ دیں۔ اور ملک کو گھاٹا رہے +

(۴) سارے ٹیکس مجموعی طور پر دیسے ہونے چاہئیں کہ کسی آدمی پر بھی اُس کی بساط سے زیادہ بوجھ نہ پڑے +

(۵) ٹیکس ایسا ہونا چاہئے کہ ضرورت پڑنے پر اس سے زیادہ یا کم آمدنی وصول کی جا سکے۔ ہندوستان میں محصول درآمد و برآمد اس کی ایک مثال ہے

(۶) جن چیزوں پر محصول لگائی جائے اور جن اوقات میں ٹیکسوں کی وصولی ہو وہ ایسے ہونے چاہئیں جن سے لوگوں کو بہت کم دقت ہو۔ اور ٹیکس سسٹم مجموعی طور پر لوگوں کی عادات اور روایات کا خیال رکھ کر بنایا گیا ہو

(۷) آمدنی ملک کے اخراجات کے لئے کافی ہو۔ لیکن اس کے لئے جو کم

سے کم مطالبہ کیا جا سکتا ہے وہ ہو۔ ہندوستان کے بجیٹوں کی طرح پانچ پانچ چھ چھ کروڑ کی بچت صریحاً اس اصول کے برخلاف ہے۔ ان اصولوں کو سمجھنے کے بعد ہمیں ہندوستان کی آمدنی کے مختلف ذریعوں کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔

۱۔ افیون۔ سب سے پہلے افیون کی آمدنی ہے۔ پوست کی کاشت سرکار سے لائیسنس لے کر ہی کی جا سکتی ہے۔ اور جتنی افیون نکلتی ہے۔ اس کو ایک مقررہ قیمت پر سرکار کے حوالے کرنا پڑتا ہے۔ سرکار اس میں سے کچھ تو باہر کی گورنمنٹوں کی ضروریات کے لیئے اُن کے معاہدوں کے مطابق انہیں بھیج دیتی ہے۔ اور کچھ ہندوستان میں کھپت کے لئے محکمہ آبکاری کے ذریعے نیلام کی جاتی ہے۔ کچھ حصہ چین کو بھیجا جاتا ہے۔ چین کے ساتھ تجارت کئی جھگڑوں کی جڑ ہے۔ گورنمنٹ ہند کی موجودہ پالیسی یہ ہے کہ جب تک چین کو افیون کی ضرورت ہے اس وقت تک چین کو ہندوستان کی افیون خریدنے پر مجبور کرنا چاہیئے۔ اس بارے میں یہ خیال رکھنا چاہیئے کہ گو اس وقت افیون کی آمدنی تین کروڑ روپیہ ہے۔ یہ آہستہ آہستہ کم ہو رہی ہے سنہ ۱۹۱۱ء اور اس سے پہلے تین سالوں میں اوسط آمدنی ۶ ۳/۴ کروڑ تھی۔ آمدنی کا یہ ذریعہ ضرور ہی ایک دن جاتا رہیگا۔ اور جتنی جلدی یہ جائے اتنا ہی اچھا ہے۔

۲۔ نمک سے آمدنی سنہ ۲۲-۱۹۲۱ء میں نمک سے آمدنی ۶ کروڑ ۲۰ لاکھ کے قریب تھی۔ گو بجٹ میں سات کروڑ روپیہ کا اندازہ لگایا گیا تھا۔ جنگ یورپ سے پہلے سنہ ۱۴-۱۹۱۳ء میں یہ آمدنی ۵۷۵۹۷۶۱۵ روپیہ تھی۔ نمک ٹیکس ایک تو باہر سے آئے ہوئے نمک پر محصول درآمد کی شکل میں لیا جاتا ہے اور دوسرے ہندوستان میں بنائے گئے نمک پر یہاں ہی لے لیا جاتا ہے۔ اس وقت شرح محصول ۱ ۱/۴ روپیہ فی من ہے۔ اس سال تجویز

کی گئی تھی کہ اس کو ۱/۲ ۲ روپیہ فی من کر دیا جائے۔ لیکن یہ تجویز امپیریل لیجسلیٹو اسمبلی میں نامنظور ہو گئی۔ نمک پر محصول ایک طرح آبادی کے غریب سے غریب حصہ پر بھی ٹیکس ہے۔ اور چونکہ یہ ضروریات زندگی کی ایک اہم اشیاء کو مہنگا بناتا ہے۔ اس لئے ہمیشہ سے ہندوستانی مدبروں کا نکتہ خیال یہ ہی رہا کہ اسے ایک نہایت قلیل رقم پر رکھا جائے۔ ہم اتنے غریب ہیں کہ اگر نمک پر ٹیکس بڑھا دیا جائے۔ تو بہت سارے ہندوستانی ایسے ہیں جو نمک کے بغیر یا کم نمک کھا کر گزارہ کریں گے۔ یہ وجہ ہے کہ جب کبھی نمک پر محصول کم ہوا ہے اس کی کھپت نسبتاً زیادہ بڑھی ہے۔ مسٹر گوکھلے نے ۱۹۰۶ء میں بجٹ پر تقریر کرتے ہوئے ایسی چیزوں پر محصول کے متعلق ایک اصول بیان کیا تھا کہ ضروریات زندگی کی چیزوں سے شرح محصول کو کم کر کے اور قدرتاً کھپت کو بڑھا کر محصول وصول کرنا چاہئے۔ یہی درست اصول معلوم دیتا ہے۔

۳۔ انکم ٹیکس۔ اس مد سے ۲۲-۱۹۲۱ء میں ۱۷ کروڑ ۶۰ لاکھ روپے کی آمدنی ہوئی۔ یہ ٹیکس دو ہزار روپیہ سالانہ سے اوپر کی تمام آمدنیوں پر (سوائے زراعتی آمدنی کے) لگایا جاتا ہے۔ شرح دو ہزار روپیہ سے ۴۹۹۹ روپیہ تک پانچ پائی فی روپیہ ہے۔ اس کے بعد جیسے آمدنی بڑھتی جاتی ہے ویسے ہی شرح انکم ٹیکس بھی بڑھتی جاتی ہے حتیٰ کہ دو لاکھ روپیہ پر ۱۶ پائی فی روپیہ ہے۔ اس ٹیکس کی تاریخ بھی عجیب ہے۔ شروع شروع میں ایک نیا ٹیکس ہونے کی وجہ سے اس کی بڑی مخالفت ہوئی۔ جب لائسنس ٹیکس کی شکل میں پہلے پہل تجویز کیا گیا تو یورپین لوگوں نے اس کی خوب مخالفت کی اور گورنمنٹ کو اپنی تجویز

واپس لینی پڑی۔ خیر جب لگ ہی گیا تو بس ایک ہی شرح پر ۲۰۰۰ روپیہ اور اوپر یک ہزار روپیہ کی آمدنی سے لے کر دس لاکھ یا اس سے بھی زیادہ کی آمدنی پر ایک ہی شرح سے لگایا گیا سنہ ۱۹۱۶ء میں جنگ کی ضروریات نے گورنمنٹ کو اس شرح کو بتدریج بڑھانے پر مجبور کیا۔ اور موجودہ شرح جنگ یورپ کی پیدا کردہ دقتوں کا ہی نتیجہ ہے۔

انکم ٹیکس ایک طرح سے ملک کی آمدنی کا نقشہ ہے۔ دولتمند ملکوں میں یہ ہی ملک کی آمدنی کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ لڑائی سے پہلے ہندوستان میں اس کے ذریعے سے صرف تین کروڑ کی آمدنی تھی اور ۷۵۰۰ آدمیوں میں سے صرف ایک آدمی انکم ٹیکس ادا کرتا تھا جس کے معنی یہ ہیں کہ آبادی کے ۱/۷۵۰۰ حصہ کی آمدنی ۱۰۰۰ روپے سے اوپر تھی۔ اس وقت گو آمدنی بہت بڑھ گئی ہے لیکن اس کی ذمہ دار بڑھی ہوئی شرح ہے۔

اصلاحات کی ضرورت

ہندوستان میں کمائے ہوئے روپیہ پر خواہ وہ انگلستان میں خرچ کیا جائے۔ یا میسوپٹومیا میں ہر حالت میں انکم ٹیکس واجب الادا ہونا چاہیئے غیر ملکوں میں قایم شدہ کمپنیوں سے جن کی شاخیں ہندوستان میں ہیں۔ یہاں کی کمائی پر انکم ٹیکس لگنا چاہیئے۔ ولایت میں ادا ہونے والی تنخواہ اور پنشنوں پر بھی یہ لگایا جانا چاہیئے۔

محصول درآمد برآمد

اس کے ذریعے سے سنہ ۱۹۲۱-۲۲ء میں ۳۴ کروڑ روپیہ کی آمدنی ہوئی۔

۱۹۱۴ء میں اس کے ذریعے سے ۱۱۳۳۷۳۳۰۰ آمدنی ہوئی تھی۔
محصول درآمد برآمد کے سوال پر ہم ہندوستان کی مالی پالیسی کے ضمن میں
بحث کر چکے ہیں۔ اس وقت ان محاصل کا مدعا صرف گورنمنٹ کے لئے
روپیہ حاصل کرنا رہا ہے۔ لیکن ان کی تاریخ عجیب ہے۔ سب سے بڑی
اہم شے جس پر محصول لگتا ہے کپڑا ہے۔ ہندوستان کپڑے کی بہت بڑی مقدار
لنکاشائر (انگلستان) سے منگواتا ہے۔ چونکہ محصول درآمد ایک طرح سے
چیزوں کی کھپت پر محصول ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ محصول درآمد کے لگنے
سے چیزوں کی قیمت بڑھ جاتی ہے۔ اور قدرتاً اُن کی بکری میں کمی ہو جاتی
ہے۔ اس لئے لنکاشائر ہمیشہ وزیر ہند پر یا گورنمنٹ برطانیہ پر زور دے کر
اپنے کپڑے کی درآمد کے لئے مختلف مراعات حاصل کرتا رہا ہے۔ بغاوت
سپاہیان کے بعد گھاٹے کو پورا کرنے کے لئے محصولات بڑھانے پڑے تھے
اس کے بعد ۱۸۷۵ء میں موقع ملا کہ یہ کم ہو سکیں۔ اس وقت روئی کے کپڑے
پر 5 ٪ محصول رکھا گیا۔ لیکن لنکاشائر والے اسے بھی نہ سہہ سکے۔
وزیر ہند پر زور ڈلوا کر ہندوستان میں آنے والی اعلیٰ روئی پر 5 ٪ محصول
لگوا لیا۔ تاکہ ہندوستان کے کارخانے بھی تقریباً اتنی ہی زیادہ قیمت دینے
پر مجبور ہوں +

اس کے چار سال بعد ہی لارڈ لٹن نے جو کہ کئی باتوں میں ولایت
سے خاص احکام لے کر آئے تھے کچھ خاص قسم کے کپڑوں پر سے محصول
کم کر دیا۔ لیکن لنکاشائر والے اس پر راضی نہ ہوئے اور زور دینے
لگے کہ سارا محصول معاف کر دیا جائے۔ لارڈ لٹن کے پیشرو لارڈ نارتھ
بروک نے اس بات پر استعفا دیدیا تھا۔ لیکن لارڈ لٹن اس سانچے

کے آدمی نہیں تھے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ اس کی اپنی انتظامیہ کونسل اس محصول کو معاف کرنے کے برخلاف تھی۔ لیکن نہیں۔ آپ نے اپنے خاص اختیارات کو استعمال کرکے اس تجویز کو یہاں پاس کیا۔ اس کے بعد جب یہ تجویز ولایت پہنچی تو وہاں وزیر ہند کی کونسل نے بھی اسے منظور کرنے سے انکار کر دیا۔ اور وزیر ہند کو اپنا آخری ووٹ اس تجویز کے پاس کرانے کے لئے استعمال کرنا پڑا۔ لنکاشائر نے دارالعوام میں زور ڈلوا کر ایک ریزولیوشن اس مطلب کا پاس کروا لیا تھا کہ جو یہ 5 % محصول ہے یہ ایک طرح سے ہندوستان کی صنعت کو فائدہ پہنچاتا ہے۔ اور جب کبھی ہندوستان کا بجٹ اجازت دے تو اسے دور کر دینا چاہئے۔ لیکن لارڈ لٹن نے جب یہ محصول معاف کیا تب ہندوستان میں قحط پڑا ہوا تھا۔ جنگ افغانستان جاری تھا۔ اور بجٹ میں گھاٹا تھا۔ لیکن لنکاشائر والوں کو منوانا ہی پڑا۔ ۱۸۸۲ء میں سارے محصول درآمد سوائے نمک و شراب کے اڑا دیئے گئے۔

۱۸۹۴ء میں جب روپیہ کی قیمت گھٹ جانے کی وجہ سے بجٹ میں بڑا بھاری گھاٹا آگیا۔ تو ڈرتے ڈرتے دسمبر سال ہذا میں کپڑے پر 5 % محصول درآمد لگایا گیا۔ اور لنکاشائر کو خوش کرنے کے لئے اتنی شرح پر ہندوستان میں بننے والے اس قسم کے کپڑے پر جو کہ لنکاشائر سے مقابلہ کر سکتا تھا۔ ۱۸۹۶ء میں ہندوستان کے فوائد کو پھر لنکاشائر کے ایجیٹیشن کے مقابلہ میں قربان کر دیا گیا۔ محصول درآمد تو 5 % سے ۳½ کر دیا گیا لیکن ہندوستان میں مشین سے بنے ہوئے ہر قسم کے کپڑے پر اب کے دو محصول کر دیا گیا۔ خواہ وہ لنکاشائر سے مقابلہ کر سکتا تھا یا نہیں۔ ۱۹۱۶ء میں جنگ یورپ نے گورنمنٹ ہند کو اپنی آمدنی

بڑھانے پر مجبور کیا۔ اس لئے محصول درآمد کی عام شرح ۵ سے ۷½ فیصدی کردی گئی۔ اور کپڑے کو بھی اس ضمن میں شامل کر لیا گیا۔ اب کے دفعہ ہندوستان میں بنے ہوئے کپڑے پر محصول نہیں بڑھایا گیا۔ اور یہ ۳½ فیصدی ہی رہ گیا۔ ۱۹۲۱ء میں یہ محصول ۱۱ فیصدی کر دیا گیا۔ اور ہندوستان میں بنے ہوئے کپڑے پر پھر وہی محصول رہا۔ ۱۹۲۲ء میں گورنمنٹ نے تجویز پیش کی ہندوستان میں بنے ہوئے اور باہر سے آنے والے دونوں قسم کے کپڑوں پر محصول یکساں بڑھا دیا جائے۔ محصول درآمد تو ۱۵ فیصدی ہو جائے اور ہندوستان کے بنے ہوئے کپڑے پر ۷½ فیصدی تجویز پیش کرتے وقت تو گورنمنٹ نے اس بات کا خوب اعلان کیا۔ کہ یہ صرف گھاٹے کو پورا کرنے کے لئے ہے۔ لیکن اسمبلی نے ہندوستان میں بنے ہوئے کپڑے پر محصول بڑھانے سے انکار کر دیا۔ اس پر گورنمنٹ نے کپڑے پر محصول درآمد بھی ۱۱ فیصدی پر ہی رہنے دیا۔ گو عام شرح ۱۵٪ کر دی گئی ہے ؛

محصول درآمد و برآمد ہندوستان میں ایک ایسا ٹیکس ہے جس کو حسب منشا گھٹا بڑھا کر بجٹ کی ضروریات پوری کی جاسکتی ہیں۔ جوں جوں ہمارے اخراجات بڑھتے جائینگے۔ ہمیں زیادہ ٹیکسوں کی ضرورت ہوگی اور اس لئے اس مد سے کافی آمدنی ہوسکتی ہے۔ لیکن اس کے برخلاف کہا جاتا ہے کہ یہ چیزوں کو مہنگا کر دیتا ہے۔ یہ تو درست ہے لیکن جب لوگوں نے ٹیکس دینا ہی ہے تو اُس کے لئے بہتر ہے کہ وہ اسے اس محصول درآمد کی شکل میں دیں۔ گورنمنٹ کے اخراجات تو ہر حالت میں ہی ٹیکسوں کے ذریعے سے ہی نکلینگے ؛

محصول برآمد اس وقت چھوٹ اور چمڑے پر ہے ؛

۵۔ ریلوے

تقریباً ۵۰ کروڑ روپے کے گھاٹے کے بعد ہندوستان کی ریلیں ۱۸۹۶ء کے بعد سے فائدہ مند ہوئی تھیں۔ اس کے بعد ۰۸-۱۹۰۷ء میں گھاٹا پڑ گیا۔ اور اب پھر ۲۲-۱۹۲۱ء میں ۹½ کروڑ روپے کا گھاٹا پڑ گیا۔ اسی سال کے بجٹ میں مسافروں کا کرایہ اور اسباب کا کرایہ بڑھا کر امید کی جاتی ہے کہ ریلوے سے ۳۴½ کروڑ روپیہ کے قریب آمدنی ہو گی۔

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے ہندوستان میں ریلوں کے بنانے میں بہت جلدی سے کام لیا جاتا رہا ہے۔ ۱۸۵۰ء سے ۱۸۷۰ء تک ریلوں کے بنانے کا یہ طریقہ رہا۔ کہ انگلستان کی مشترکہ سرمایہ کی کمپنیاں گورنمنٹ ہند سے ٹھیکہ کر لیتی تھیں۔ وہ خود ریلوں کو بناتی تھیں اور خود ہی اُن کو چلاتی تھیں۔ لیکن گورنمنٹ اس کل سرمائے پر ۵% سود کی ذمہ داری لیتی تھی۔ اگر چلانے سے اتنا فائدہ نہ ہُوا تو گورنمنٹ اپنے روپے میں سے یہ سود کمپنیوں کو دیدیتی تھی۔ اور اگر بچت اس سے زیادہ ہو جائے تو اس سے اوپر جتنا فائدہ ہوتا تھا وہ کمپنیوں اور سرکار کے درمیان آدھا آدھا تقسیم کر لیا جاتا تھا۔ نیز ۲۵ سال کے بعد کمپنیوں کو ریلوے سرکار کے حوالے کرنی تھی۔ جیسا کہ پہلا کہا جا چکا ہے۔ اس طریقہ کے ماتحت نہ تو ریلوں میں فائدہ ہُوا۔ اور دوسرے ان کے بنانے میں بہت زیادہ روپیہ خرچ ہو گیا۔ اس لئے ۱۸۷۰ء میں سرکار نے خود قرضہ لے کر ریلیں بنانی شروع کر دیں۔ اب ریلیں اتنی جلدی نہیں بن سکتی تھیں۔ جتنی جلدی کہ ولایت کے کارخانہ دار اور سرمایہ دار

چاہتے تھے کہ وُہ بنیں۔ اس لئے ۱۸۸۰ء سے پھر گارنٹی سلسلہ شروع کیا گیا۔

لڑائی کے دنوں میں ولایت سے ریلوے کے لئے مختلف سامان نہیں آسکتا تھا۔ اس لئے اُن دنوں ریلوے پر بہت کم خرچ ہُوا۔ ۲۰-۱۹۱۹ء میں اس کسر کو پورا کرنے کی کوشش کی گئی۔ لیکن پھر بھی جتنا روپیہ بجٹ کیا گیا تھا اتنا خرچ نہ ہُوا۔ ۲۱-۱۹۲۰ء میں ۲۲½ کروڑ روپیہ کے لئے بجٹ کیا گیا۔ ۱۹۲۱ء میں ریلوے کمیٹی کی رپورٹ شائع کی گئی۔ جس نے پانچ سال کے لئے ۳۰ کروڑ روپیہ سالانہ کے خرچ کی سفارش کی لیجسلیٹو اسمبلی نے اس بات کو مان لیا۔ اور ۳۰ کروڑ روپیہ منظور ہو گیا۔ لیکن اسمبلی نے ساتھ ہی یہ شرط لگا دی کہ اس روپے کا زیادہ سے زیادہ حصّہ ہندوستان میں خرچ کیا جائے لڑائی کے چار سالہ آرام کے بعد ریلوے پر اس قدر خرچ کی ضرورت تو معلوم ہوتی ہے۔ لیکن اس کا فائدہ تب ہی ہے جب اس سے ہندوستان کی صنعتوں کو بھی فائدہ پہنچایا جائے +

ساری ریلوے کے سرکار کے ماتحت انتظام کرنے کے سوال کے متعلق ہندوستان کی عام رائے اس بات کے حق میں اور اس بات پر زور دے رہی ہے کہ ریلوے کمپنیوں سے لے کر سرکار کے ماتحت چلائی جائیں۔ ریلوے کمیٹی نے ریلوے کے انتظام کے متعلق چند سفارشات کی ہیں۔ اس سوال پر پریذیڈنٹ اور آدھے ممبر حق میں تھے اور آدھے برخلاف۔ اس بات کو یاد رکھنا چاہیئے کہ اگر ساری ریلوے سرکار کے ماتحت کام کرنا شروع کر دیں تو اس بات کی کوشش ہونی چاہیئے کہ وہ پورے نفع پر کام کریں۔ اور اپنی تجارتی شکل کو نہ کھو بیٹھیں +

ریلوے کے متعلق ایک اور سوال ہے۔ اور وُہ ریلوے کی آمدنی

کے خرچ کرنے کا ہے۔ جیسا کہ پہلا کہا جا چکا ہے ۲/۱ ۵۲ کروڑ روپیہ کے قریب ہندوستان کے ٹیکس دہندگان ریلوے کو چلاؤ بنانے کے لیئے دے چکے ہیں۔ اور یہ بالکل بجا معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہ اب اس بات کا مطالبہ کریں کہ ریلوے سے جو فائدہ ہو وہ ان کے حصے آئے۔ ریلوے کمیٹی نے اس بات کی سفارش کی تھی کہ ریلوے کا عام بجٹ سے کوئی تعلق نہ رکھا جائے۔ اور جو فائدہ اِن سے ہو وہ ان کو بہتر بنانے کے لیئے خرچ کیا جائے +

جب لیجسلیٹو اسمبلی کی ایک کمیٹی نے اس بات پر غور کیا۔ تو اُس نے فی الحال موجودہ انتظام کو ہی برقرار رکھنے کی رائے دی۔ یہ معاملہ اس وجہ سے زیادہ پیچیدہ بن جاتا ہے کہ لیجسلیٹو اسمبلی کو سارے بجٹ پر اختیار نہیں ہے۔ فوجی بجٹ بالکل گورنمنٹ ہند کی مرضی پر منحصر ہے۔ اس وجہ اسمبلی کے ہندوستانی ممبروں کی یہ رائے ہو رہی ہے کہ اگر ریلوے بجٹ کو عام بجٹ سے علیحدہ کر دیا جائے تو لازمی طور پر محاصل میں کمی ہوگی جس کے لیئے نئے ٹیکس لگانے پڑیں گے۔ یا خرچ کم کرنا ہوگا۔ چونکہ نئے ٹیکس لگانا ذرا زیادہ دقت طلب معاملہ ہے اس لیئے ضروری طور پر خرچ میں تخفیف ہوگی۔ اور وہ اس بات کے لیئے زور لگا رہے ہیں۔ اس لئے کچھ رائے اب ریلوے کے بجٹ کو عام بجٹ سے علیحدہ کرنے کے حق میں ہو رہی ہے۔ لیکن جب اسمبلی کو پورے بجٹ پر اختیار ہو جائیگا۔ تو خرچ کم کرنے کے اس طریقہ کو اختیار کرنے سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ اور صورت معاملہ بدل جائیگی۔ اس وقت سوال یہ ہوگا کہ آیا لوگوں سے کسی اور طریقہ سے ٹیکس لیا جائے یا ریلوے پر فائدہ نکال کر۔ اگر تو ریلوے کے فائدہ

کو عام مسافروں کی دقتوں کو دور کرنے یا کرایہ کم کرنے یا صنعت وحرفت وترقی دینے کے لئے لگایا جائے۔ تو یہ تو اتنا قابلِ اعتراض نہیں ہوگا۔

اس بارے میں یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ سوال ابھی حل طلب ہے کہ آیا ہندوستان کی ریلیں منافع پر کام کررہی ہیں یا نہیں۔ بجٹ میں ان سے فائدہ دیکھنے میں آرہا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اگر ریلوے مسافروں کو وہی سہولتیں بہم پہنچائے جن کا یہ اقرار کرتی ہے (مثلاً ہر ایک کلاس کے ایک کمپارٹمنٹ میں اتنے ہی آدمی بیٹھیں جتنوں کی اجازت ہے۔ اور زیادہ کے لئے ریلوے اور گاڑیاں مہیا کردیا کرے) و کیا یہ پھر بھی نفع پر کام کرے گی۔ ہماری رائے میں یہ بہتر ہوگا کہ ریلوے ان سہولتوں کے بہم پہنچانے کا خیال کرے جن کا یہ اقرار کرتی ہے۔

محکمہ تار و ڈاک خانجات

اس محکمہ سے گورنمنٹ ہند کو ۱۴-۱۹۱۳ء میں ۵۲۹۷۷۷۸۵ کی آمدنی تھی۔ اور ۴۹۳۴۴۷۶۰ روپیہ خرچ تھا۔ گویا کہ اس سے ۵۰۲۳۵۸۳ روپیہ کا فائدہ تھا۔ ۲۲-۱۹۲۱ء میں اس ڈیپارٹمنٹ کو ۵۰ لاکھ روپیہ کا گھاٹا تھا۔ اور نئے سال کے بجٹ میں دو پیسہ کا کارڈ اور ایک آنہ کا لفافہ کرکے اسی لاکھ روپیہ کی بچت بجٹ کی گئی ہے۔

یہ ہیں گورنمنٹ ہند کی آمدنی کے بڑے بڑے ذرائع ۲۲-۱۹۲۱ء کی ساری آمدنی ایک عرب ۸ کروڑ روپیہ تھی ۱۴-۱۹۱۳ء میں سالانہ آمدنی ۲۰۷۶۱۸۲۷۱ تھی۔ اس کمی کی وجہ یہ ہے کہ اب معاملہ زمین، نہروں کی آمدنی۔ محکمہ آبکاری کی آمدنی اسٹاموں کی آمدنی یہ ساری کی ساری

اب صوبوں کی گورنمنٹ کی تحویل میں ہیں ۔

صوبوں کی آمدنی کے ذرایع

۱۔ نہریں ۲۱-۱۹۲۰ء آخری سال تھا جب کہ نہروں کی آمدنی گورنمنٹ ہند کے ماتحت تھی ۔ اُس سال اس سے ۸۴۱۷۸۰۰۰ روپیہ تھی ۔ اور خرچ ۶۵۲۱۰۰۰ روپیہ ۔ گویا کہ ۲۳۴۵۷۰۰۰ روپیہ کا خالص فائدہ تھا ۔ گورنمنٹ کے تجارتی کاموں میں سے یہ سب سے زیادہ فائدہ مند ہیں ۲۰-۱۹۱۹ء میں نہروں میں لگائے ہوئے روپیہ کا سود کاٹ کر اصل پر ۸ فیصدی سے زیادہ خالص منافع ہوا ۔ اس نفع میں وہ معاملہ زمین بھی شامل ہے جو نہروں کی وجہ سے آتا ہے ۔

۲۔ **محکمہ آبکاری** ۲۱-۱۹۲۰ء میں اس مد سے ۲۰۳۱۰۹۰۰۰ روپیہ کی آمدنی تھی ۔ اس مد کی آمدنی شراب ۔ بھنگ ۔ چرس ۔ افیون وغیرہ نشیلی چیزوں کے لائسنس اور ٹھیکے کے ذریعے ہوتی ہے یہ آمدنی بہت تیزی سے بڑھ رہی ہے ۔ اور قدرتاً ہندوستانی جذبہ اس بڑھاؤ کے برخلاف ہے ۔ بڑھتی ہوئی آمدنی کے معنی یہ ہیں کہ لوگ ان چیزوں کو زیادہ استعمال کرنے لگ پڑے ہیں ۔ جو کسی طرح سے بھی اطمینان کا باعث نہیں ہوسکتا ہے ۔ اب یہ محکمہ نہ صرف صوبوں کی گورنمنٹ کے ماتحت آگیا ہے ۔ بلکہ یہ وزرا کے ماتحت ہے جو کہ کونسل اور عام رائے کے سامنے جواب دہ ہیں ۔ ہر جگہ ہی لوگوں نے اب اس محکمہ میں تبدیلی کا مطالبہ کیا ہے ۔ اور مختلف صوبوں میں کونسل کی کمیٹیوں نے اس سوال پر غور کیا ہے جس کا نتیجہ ہوا ہے کہ نشیلی چیزیں خاص کر شراب کی کھپت کو کم کرنے کے لیے مختلف

ذرائع سوچے جارہے ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ قطعی ممانعت کے معنی اس قدر آمدنی کو قربان کرنا ہوگا۔ لیکن آدمی روپیہ سے زیادہ قیمتی چیز ہیں۔ اگر قطعی ممانعت کے ذریعے سے لوگوں کو شراب سے بچایا جاسکے تو یہ قربانی رائگاں نہیں جائیگی۔ کہا جاتا ہے کہ شراب کی فروخت کے بند کرنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ لوگ ناجائز طور سے شراب کشید کرنی شروع کردیں گے۔ ہمارا خیال ہے کہ اگر گورنمنٹ کوشش کرے تو اس ناجائز کشید کو بند کرنا مشکل نہ ہوگا۔

۳۔ اسٹاموں کی آمد۔ اسٹاموں کی آمدنی بھی اب صوبوں کی گورنمنٹ کے ماتحت ہے ۲۱-۱۹۲۰ء میں اس سے ۱۱۲۶۱۲۵۰۰ روپیہ کی آمدنی سارے ہندوستان بھر کے لیے تھی۔ یہ آمدنی ان اسٹاموں سے ہوتی ہے جو کہ مختلف عدالتوں میں دعوے دائر کرنے یا دوسری عدالتی خرچا سرانجام وغیرہ کے لیے لگانے پڑتے ہیں۔ ساتھ ہی مختلف تجارتی سودوں پر لگے ہوئے اسٹاموں کی آمدنی بھی اس میں شامل ہے۔

۴۔ معاملہ زمین۔ یہ بھی اب صوبوں کی گورنمنٹ کے ماتحت ہے۔ سب ٹیکسوں سے یہ ٹیکس نرالا ہے کیونکہ اس کے لگانے کے لئے مجلس واضع قوانین کی منظوری لینے کی کوئی ضرورت نہیں پڑتی ہے۔ اور سب کچھ انتظامیہ افسروں کی مرضی پر منحصر ہے۔ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۱۹ء پر جو مشترکہ کمیٹی ہاؤس آف لارڈز اور ہاؤس آف کامنز کی بیٹھی تھی اس نے اس بات کی سفارش کی تھی کہ معاملہ زمین بھی باقاعدہ بجٹ کیا جائے اور جب کبھی یہ بڑھایا جائے تو مجلس واضع قوانین کی منظوری لی جائے۔ لیکن ابھی تک اس بارے میں کچھ نہیں ہوا ہے۔

۱۔ فوجی اخراجات

سنہ ۲۲-۱۹۲۱ء میں ۱۰۸ کروڑ روپیہ کی آمدنی میں سے اور ۱۴۲ کروڑ روپیہ کے خرچ میں سے فوجی اخراجات ۶۵ کروڑ تھے۔ گویا کہ وہ آمدنی کا ۶۲ ٪ اور اخراجات کا ۴۶ ٪ ہے۔ سنہ ۱۴-۱۹۱۳ء میں یہ خرچ ۳۲ کروڑ روپیہ کے قریب تھا۔ اور کل آمدنی کا ۲۵ ٪ کے قریب تھا۔ فوجی اخراجات کی بیشی ہندوستان کے بجٹ کا اب ایک باقاعدہ عنصر بن گئی ہے۔ نہرولسن کے بننے سے پہلے ہندوستان کا بجٹ مینہ کا جوا a Gamble in rain تھا۔ شرح تبادلہ کے جھگڑے کے دنوں میں یہ روپیہ کی قیمت کا جوا تھا A Gamble in Exchange اور اب دو تین سالوں سے یہ سرحد کے علاقوں کے اخراجات کا جوا بن رہا ہے۔ A Gamble in Waziristan لطف کی بات یہ ہے کہ نئی کونسلوں کو ملٹری بجٹ پر آنکھ اٹھا کر دیکھنے کا اختیار نہیں ہے جیسا کہ کہا جا چکا ہے۔ ہندوستان کے قرضہ کا ایک بڑا حصہ ان لڑائیوں کی وجہ سے پیدا ہوا تھا جن کے شروع کرنے یا ختم کرنے میں ہندوستان کے لوگوں کا کوئی فائدہ نہ تھا۔ اگر ہندوستان نے ایک خوش حال ملک کی طرح سے زندگی بسر کرنی ہے تو یہ لازمی ہے کہ اس بڑھتے ہوئے

ملٹری بجٹ کو کم کیا جاوے - اور لوگوں کے نمائندوں کو اس پر پورا اختیار دیا جائے - اس بارے میں مندرجہ ذیل اصلاحات کی جاسکتی ہیں -

۱- خلیج فارس اور دوسری ہندوستان سے باہر کی جگہوں کا خرچ ہندوستان کے سر سے ہٹا لیا جائے ۔

۲- ہندوستان کی فوج کی تعداد کو کم کیا جائے - اور یہ تعداد ہندوستان کی ضروریات کا خیال کرکے مقرر کی جائے - نہ کہ سلطنت برطانیہ کی ضروریات کا ۔

۳- گورے سپاہیوں کی جگہ ہندوستانی سپاہی اور گورے افسروں کی جگہ ہندوستانی افسروں کو تعینات کرنے کی پالیسی شروع کی جائے - ایک گورہ سپاہی ایک ہندوستانی سپاہی کی نسبت چار گنا مہنگا پڑتا ہے -

۴- محکمہ فوجی تعمیرات اور محکمہ رسد رسانی کو پھر باقاعدہ طور پر ترتیب دی جائے - سر سوامی آئر نے اس طور سے ۵ کروڑ کی بچت کا اندازہ لگایا تھا ۔

۵- جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے برطانیہ کا محکمہ جنگ ہندوستان سے سپاہیوں کے بھرتی کرنے کا خرچ لے لیتا ہے - لیکن جب یہ سپاہی ہندوستان میں تربیت پا کر ولایت میں بڑے قابل ریزرو سپاہی بن جاتے ہیں - تو اس کے لئے برطانیہ ایک پائی تک نہیں دیتا - یہی نہیں بلکہ ان کا سارا خرچ ہندوستان کے سر پڑتا ہے - سر جارج وائٹ کمانڈر انچیف ہندوستان نے خود اس بات کا اقرار کیا تھا کہ ہندوستان بہت سے ایسے اخراجات برداشت کرتا ہے جو کہ دراصل انگلستان کے مفاد کے لئے ہیں - ضروری ہے کہ انگلستان اور ہندوستان کے درمیان

اخراجات کا تصفیہ کیا جائے - تاکہ ہندوستان کو خواہ مخواہ برطانیہ کے لئے
خرچ کرنا نہ پڑے۔

۳- فوجی محکمہ کے مرکزی دفتر ایک جگہ کردیئے جائیں - کہا جاتا ہے
کہ اگر یہ دفتر ہمیشہ کے لئے دہلی رہا کریں تو اس سے موجودہ بجٹ میں
۲ کروڑ روپے کی بچت ہوگی

قرضہ کا سود

۱- قرضہ کی تفصیل ہندوستان کے قومی قرضہ کی مد کے تحت میں دی
جائیگی - یہاں یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ۱۹۱۳-۱۴ء میں اس مد میں ۲ کروڑ
کے قریب خرچ تھا - ۱۹۲۰-۲۱ء میں ہی خرچ ۱۲ کروڑ کے قریب پہنچ گیا
تھا۔

۳- بجٹ کی باقی مدات کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں ہے -
محکمہ تار و ڈاکخانہ جات اور محکمہ نہر کے اخراجات کی بابت آگے لکھا
جا چکا ہے - باقی خرچ مختلف سول کے محکمہ کا ہے - اور کچھ ٹیکسوں کے
جمع کرنے کا خرچ ہے۔

۱۹۲۱-۲۲ء میں کل اخراجات ایک ارب ۴۲ کروڑ کے قریب
تھے۔

ٹیکسوں کا بوجھ

ٹیکسوں کے متعلق ہندوستانیوں کو سمجھانے کے لئے عام طور پر کہہ دیا جاتا ہے کہ
ہندوستان میں ٹیکسوں کا بوجھ ساری دنیا سے کم ہے - بات

بڑی آسان ہے ہمارے ٹیکسوں کو آبادی پر تقسیم کر دیا۔ اور حاصل قسمت کو اوسط ٹیکس بنا لیا۔ لیکن ایسے کرتے وقت اول تو ہندسوں میں کچھ غلطیاں کر دی جاتی ہیں۔ بہت سے انگریز مصنف اس گنتی میں معاملہ زمین کو ٹیکسوں میں شمار نہیں کرتے۔ اور اس طرح سے یہ اوسط کم نکلتی ہے دوسرے یہ اوسط تو کچھ معنی نہیں رکھتی ہے۔ اگر ایک غریب آدمی جس کی آمدنی دس روپے ماہوار ہے کسی کو ایک روپیہ دے۔ اور ایک امیر آدمی جس کی آمدنی سو روپیہ ماہوار پانچ روپے دے تو اس ایک اور پانچ کے ہندسوں کو لے کر یہ نتیجہ نکال لینا کہ امیر آدمی بڑا فیاض ہے بے معنی ہے جس چیز کے جاننے کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ یہ فیاضی یا یہ ٹیکس کل آمدنی سے کیا نسبت رکھتے ہیں۔ اور کل آمدنی کیا ہے۔ اس طرح پر دیکھنے سے ہی ان ہندسوں کا ٹھیک مطلب نکل سکتا ہے۔ جب ہم اس طرح سے ان ہندسوں کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ہماری ٹیکسوں کو ہماری آمدنی سے وہی تعلق ہے جو ولایت کے ٹیکسوں کو ولایت کی ساری آمدنی سے ہے۔

ہمارے اخراجات

لیکن ٹیکسوں کا کم یا زیادہ ہونا بذات خود کوئی اچھی یا بری بات نہیں ہے۔ سوال تو ان ٹیکسوں کے خرچ کا ہے۔ اگر انہی ٹیکسوں کو زیادہ کر دیا جائے اور تعلیم۔ حفظان صحت۔ یا دوسرے ایسے مفید عام کاموں پر روپیہ خرچ کیا جائے تو کسی آدمی کو اعتراض نہیں ہوگا۔ ہندوستان میں ہمیں یا خاص اعتراض کیا جاتا ہے۔ وہ

ایک تو یہاں کے خرچ کی شرح ہے۔ دوسرے آمدنی اور خرچ کا لوگوں کے نمائندوں کے ماتحت نہ ہونا ہے۔ پچھلے چار سالوں سے گورنمنٹ کو گھاٹا پڑ رہا ہے۔ اور چار سالوں کا گھاٹا ۹۰ کروڑ روپیہ کے قریب ہے اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ یہاں ہر قسم کے اخراجات کو کم کرنے کی پوری کوشش کی جائے۔ اس بارے میں ہم کچھ تجاویز فوجی اخراجات کی مدمیں بتا چکے ہیں۔ اور کچھ سالانہ نکاسی کے بارے میں اُن کے ساتھ ہی مندرجہ ذیل باتیں قابلِ غور ہیں +

۱۔ حسابات کی پڑتال کے لئے ایک اکونٹنٹ جنرل ہو۔ جو سیدھا لیجسلیٹو اسمبلی کو اپنی رپورٹ پیش کرے۔ یہ ایسا آدمی ہونا چاہئے جس کا کہ گورنمنٹ سے کسی شکل میں کوئی تعلق نہ ہو +

۲۔ ہندوستان کے مختلف محکموں میں اعلیٰ درجے کے افسروں کی تنخواہیں بہت زیادہ ہیں۔ وزیر اعظم کی تنخواہ وائسرائے ہند کی تنخواہ کے ⅓ حصّہ سے بھی کم ہے۔ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ ان عہدوں پر انگریز عہدہ دار رکھنے کے لئے زیادہ تنخواہ دینی چاہیئے تو بھی موجودہ تنخواہیں بہت زیادہ ہیں۔ لیکن اب تو مختلف عہدوں کی تنخواہیں اُن اعداد پر مقرر کرنی چاہیئں کہ جس سے کہ قابل ہندوستانی اُن عہدوں کے لئے مل سکیں۔ اُس تنخواہ پر انگریز عہدہ داروں کو موجودہ کی طرح سمندر پار ہونے کا الاؤنس مل سکتا ہے +

۳۔ نگرانی کے عملہ کی مقدار بھی یہاں بہت زیادہ ہے۔ اصلاحات کی وجہ سے اُن صوبوں میں جہاں ایک گورنر اور تین ممبر حکومت کرتے تھے اب ایک گورنر اور چھ ممبر تک لگا دئے گئے ہیں۔ اور بھی کئی نئے عہدے

نکلتے رہتے ہیں۔ مدراس کے صوبہ میں کمشنر نہیں ہیں۔ لیکن وہاں کسی قسم کا جھگڑا نہیں پڑا ہے۔ جب ایک صوبہ میں اُن کے بغیر گزارہ ہوسکتا ہے تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ باقی صوبوں میں اُن کے بغیر گزارہ نہ ہو۔ اسی طرح سے ہر محکمہ میں ایسے عہدے چنے جا سکتے ہیں جو کہ صرف نگرانی کے لئے مقرر ہیں۔ اُن میں بہت سارے ایسے ہیں جن کی ضرورت نہیں ہے۔

۳۔ خرچ کو کم کرنے کا سب سے اچھا اور سب سے آسان طریقہ ہندوستانی افسروں کا زیادہ تعداد میں اُن عہدوں پر مقرر ہونا ہے جو اس وقت تک یورپین لوگوں کے لئے مخصوص رہے ہیں +

۴۔ شان و شوکت پر کئی خرچ جو مغل گورنمنٹ کی نقل پر کئے جاتے ہیں کم کئے جا سکتے ہیں۔ گورنمنٹ ہند کے محکمہ جات کے بے انتہا اردلی اور دوسرے ایسے آدمی جو صرف شان کے لئے رکھے گئے۔ بڑی آسانی سے کم کئے جا سکتے ہیں

۱۔ آدمی حیران ہوتا ہے جب یہ دیکھا جاتا ہے کہ گو بہت سارے کام جو آگے گورنمنٹ ہند کیا کرتی تھی اب صوبوں کی گورنمنٹ کے ماتحت ہیں۔ لیکن پھر بھی گورنمنٹ ہند کے انتظامیہ کونسل کے ممبروں کی تعداد کم ہونے میں نہیں آئی +

محکمہ تعلیم وزیروں کے ماتحت ہے۔ لیکن ابھی تک ممبر تعلیم موجود ہے۔ محکمہ معاملہ زمین اور محکمہ تعمیرات اب دونوں صوبوں کی گورنمنٹوں کے ماتحت ہیں لیکن پھر بھی نہ صرف ممبر موجود ہیں بلکہ اس کے ماتحت سٹاف کا سارا کارخانہ چل رہا ہے

۵۔ جس طرح کہ پچھلے دو تین سالوں کے امپیریل سروسز کے ممبروں کو ترقی پر ترقی مل رہی ہے اور جس طرح سے اُن سے وزیر ہند آج تک سلوک کرتا رہا ہے وہ اس بات کو ضروری بتاتا ہے کہ آگے کے لئے اُن کو لیجسلیٹو اسمبلی کے ماتحت کر دیا جائے تاکہ اِن کو اگر کوئی مراعات ملنی ہوں تو پبلک کے نمائندوں کی اظہار رائے کے بعد ملیں ✦

۶۔ ہندوستان کے بجٹ میں موسم گرما کے "کوچ" کو بند کرکے کافی روپیہ بچایا جاسکتا ہے۔ جب ہائی کورٹوں کے جج اور دوسرے افسر موسم گرما میدانوں میں گزار سکتے ہیں۔ تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ سول یا فوجی افسر اور اُن کے عملے اس موسم کو میدانوں میں نہ گزار سکیں۔ اگر اس تجویز پر عمل کیا جائے تو کئی کروڑ کی بچت ہوسکتی ہے ✦

۷۔ دوسری طرف مالیانہ بڑھانے کے لئے محصول درآمد اور برآمد کو استعمال کیا جاتا ہے۔ اب وقت ہے کہ ہم مانچسٹر کے کارخانہ داروں کو ناراض کرنے کے ڈر کو چھوڑ دیں۔ اور ہندوستان کے مفاد کا خیال کرکے ان محاصل سے پورا فائدہ اُٹھائیں۔

۸۔ باقی ملکوں کی طرح یہاں جائیدادوں کی وراثت پر ٹیکس لگایا جاسکتا ہے۔ انکم ٹیکس کی شرح بتدریج بڑھنی چاہیئے ✦

صوبوں کی آمدنی

اصلاحات سے پہلے ہندوستان کی ساری آمدنی گورنمنٹ ہند کے ماتحت تھی۔ اور اُس کے بجٹ میں کل اخراجات دکھلائے جاتے تھے۔ اس کے معنے یہ نہیں ہیں کہ سارے اخراجات صرف گورنمنٹ ہند

کے ماتحت تھے۔ بلکہ یہ کہ وُہ اُن کے لئے ذمہ وار تھی۔ اب صوبوں کی گورنمنٹیں معاملہ زمین۔ اسٹامپ۔ نہریں۔ محکمہ آبکاری کی ساری آمدنی اپنے پاس رکھتی ہیں۔ ان کو صوبوں کی گورنمنٹ کے حوالے کرکے گورنمنٹ ہند کو جو گھاٹا رہا ہے وُہ مختلف صوبوں کی گورنمنٹ سے حصّہ وار وصول کیا جاتا ہے۔ اس وصولی کی تہ میں کوئی اصول نہیں ہے۔ اس لئے ہر صوبہ یہ محسوس کر رہا ہے کہ اس سے زیادہ روپیہ لیا جاتا ہے۔ ضرورت ہے کہ گورنمنٹ ہند اپنے اخراجات اور آمدنی کو اس طرح سے ترتیب دے کہ وُہ اپنے پاؤں پر کھڑی ہو سکے ٭

ہندوستان کی تجارت

مختصر تاریخ

ہندوستان اپنی تجارت کے لئے زمانہ قدیم میں بہت مشہور تھا۔ "یونان کی تاریخ میں ہندوستانی سوداگروں کا ذکر ملتا ہے۔ سلطنت روم کے شروع شروع کے سالوں میں ہندوستان اٹلی اور مصر کے سوداگروں کے لئے ایک بڑا بھاری تجارتی مرکز تھا۔ جیسا کہ اس سے پہلے یہ سارے ایشیا کی مختلف قوموں کے لئے (چین سے شروع کرکے ایشیائی روم) مرکز رہا۔ ہندوستان کے ملائم کپڑے۔ اس کے عجیب وغریب رنگ۔ اس کے چینی اور مٹی کے برتن۔ دانتوں اور ہاتھی دانت کا کام۔ مصالحہ اور قیمتی پتھر۔ بیش بہا خوشبوئیں۔ اور عطر نہ صرف یورپ کو مقبوب اور خوش کرتے رہے ہیں بلکہ وہاں کے آرٹ کو دوبارہ زندگی دینے میں بڑے مددگار ثابت ہو چکے ہیں"۔ بہ شروع تاریخ سے ہندوستان اپنی تجارت کے لئے مختلف قوموں میں مشہور رہا ہے۔ اور جیسا کہ ایک انگریز مصنف نے لکھا ہے "ابھی جب

India as known in the ancient world
G. Gauranganath Banerji
Published by the Oxford
University Press
Page 72.

لندن کا نام بھی تاریخ کے صفحے پر نہیں آیا تھا۔ ہندوستان دنیا کی سب سے دولتمند تجارتی منڈی تھا۔ پندرھویں صدی میں ہندوستان کی تجارت کی کشش سے یورپین لوگوں نے اس طرف کا رخ کیا۔ یہ تجارت صرف گرم مصالحوں ہی میں نہیں تھی بلکہ ہندوستان کے روئی کے کپڑے چھینٹ شال اور دوسرا تیار شدہ مال بھی کثیر تعداد میں لے جایا جاتا تھا۔ اٹھارہویں صدی کے شروع میں انگلستان میں وہاں کی صنعتوں کی حفاظت کا خیال شروع ہوا۔ اس پر جو کچھ ہوا وہ مشہور تاریخ دان ولسن کے الفاظ میں بتلایا جا سکتا ہے:

"اس وقت تک ہندوستان کے ریشمی اور سوتی کپڑے ولایت میں ۵۰ یا ۶۰ فیصدی کم قیمت پر بیچے جا سکتے تھے۔ اس لئے ان کو بند کرنے کے لئے ۷۰ یا ۸۰ % محصول لگایا گیا۔ یا ان کی درآمد بالکل ہی بند کر دی گئی۔ اگر ایسا نہ کیا جاتا تو مانچسٹر اور پیلسی کے کپڑے کے کارخانے شروع میں ہی بند ہو جاتے۔ اور خواہ پھر سٹیم بھی ان کی مدد کرتی۔ اس کو انگلستان میں فروغ دینا ناممکن ہوتا۔ یہ کارخانے ہندوستانی صنعت وحرفت کو بلی دان دے کر چلائے گئے۔ اگر ہندوستان آزاد ہوتا تو وہ انگلستان کے مال پر بدلے میں محصول لگاتا۔ اور اس جنگ میں اپنی صنعت وحرفت کو محفوظ رکھنے میں کامیاب ہو جاتا۔ لیکن یہ تو غیروں کے رحم پر تھا۔ ولایت کا مال یہاں بلا محصول کے ٹھونسا گیا۔ اور ولایت کے کارخانہ والوں نے پولیٹکل بے انصافی کے زیر سایہ اپنے ایک ایسے رقیب کا گلا گھونٹا جس کا کہ وہ مقابلہ نہیں کر سکتے تھے * "

* Wilson's Edition of Mill's History of India Vol. I. Note Page No. 538, 539

یہ ٹھیک ہے کہ اس طرح سے لڑائی جیتنے کے بعد اور اسباب بھی آموجود ہوئے۔ جنہوں نے ہندوستان کو مانچسٹر کے کارخانوں کے مقابلہ میں کمزور بنا دیا۔ اور ولایت میں جب بھاپ کے کارخانوں اور مشینوں نے زور پکڑا تو قدرتاً وہ سستا مال تیار کر سکے۔ ادھر اس مال کو ہندوستان کے گاؤں گاؤں میں پہنچانے کے لئے ریلیں بنی شروع ہو گئیں۔ اور انہوں نے ہندوستان کی رہی سہی امید بھی گنوا دی۔ اس پر طرہ یہ کہ اب جب انگلستان کی تجارت جم گئی تو وہاں آزاد تجارت کا غل مچا دیا گیا۔ اور جتنے ملک کہ اس کے ساتھ بندھے ہوئے تھے سب کو اسی رو میں بہنا پڑا۔ آئرلینڈ اور ہندوستان سب کے ساتھ ہی اب ایک سا سلوک ہونے لگا۔ اور یہاں گورنمنٹ چپکے بیٹھ کر ہندوستان کی صنعتوں کی تباہی دیکھتی رہی۔ ریلیں بناتے وقت تو علم اقتصادیات کے سارے اصول ہی بھاڑ میں جھونکے اور خود ریلوں کے بنانے میں مدد دی۔ حالانکہ آزاد تجارت کے اصول کے مطابق کسی بھی صنعت کے ساتھ گورنمنٹ کا تعلق اچھا نہیں گنا جا سکتا۔ لیکن ہندوستان کی صنعت و حرفت کے بارے میں آزاد روی کا بھوت سر پر سوار رہا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان کے لوگ صنعت و حرفت کو چھوڑ کر زراعت کی طرف متوجہ ہوئے۔ سنہ ۱۹۰۱ء اور سنہ ۱۹۱۱ء کی مردم شماری کے پیشوں کے ہندسوں کو دیکھ کر آدمی حیران رہ جاتا ہے۔ ہر ایک صوبہ میں زراعت پر انحصار رکھنے والے لوگوں کی تعداد بڑھ رہی ہے۔ اور ان لوگوں کی جو صنعت و حرفت پر گزارہ کرتے ہیں کم ہو رہی ہے۔ سنہ ۱۹۲۱ء کی مردم شماری کی کہانی ابھی تک باقی ہے۔

ہندوستان کی صنعتی کمزوری کے اور بھی کئی اسباب ہیں۔ موجودہ زمانے میں مشینوں کی وجہ سے دیسی پیشہ ور لوگوں کو ہاتھ کی بنی ہوئی چیزوں سے ولایتی مال کا مقابلہ کرنا مشکل ہے۔ دوسری ہندوستانی کاریگری کے سرپرست زیادہ ہندوستانی دربار ہوا کرتے تھے۔ انگریزی عملداری کی وجہ سے کئی دربار تو جاتے ہی رہے۔ اور جو بچے رہے ان پر مغربی فیشن کا بھوت سوار ہو گیا۔ ریلوے کی تعمیر نے بھی دیسی صنعتوں کے مارنے میں کافی حصّہ لیا ہے۔ ریلوں کے بنانے میں جو اصول کام کرتا تھا وہ ولایت کی منڈیوں کے مال کو ملک کے گوشہ گوشہ میں پہنچانے اور یہاں سے کچا مصالحہ سمیٹنے کا تھا۔ ریلیں بنانے وقت ہندوستان کی صنعتوں کے مفاد کا کوئی خیال نہیں رکھا گیا۔ اور جب یہ بن گئی تو شرح کرایہ مرتب کرتے وقت بھی اس بات کا خیال رہا کہ ہندوستان ولایت کے مال سے بھر جائے اور اپنا کچا مصالحہ سارا باہر کے ملکوں کے حوالے کر دے۔ ہندوستان کی بنی ہوئی چیزوں کو ملک کے ایک حصّہ سے دوسرے حصّہ میں لے جانے کے لیئے مراعات ملنی تو کیا برابری کا بھی سلوک نہیں ہوا* ساتھ ہی موجودہ صنعتی حالات بھی اس بات کے خواہاں ہیں کہ چیزیں بڑے پیمانہ

* صنعتی کمیشن کے سامنے شہادت دیتے ہوئے سیالکوٹ کے مشہور کارخانے اوپرا ئے کے مالک سردار گنڈا سنگھ نے بتلایا تھا کہ کلکتہ کے لیئے مال بھیجنے میں سیالکوٹ سے کلکتہ تک جو کرایہ ہے اس سے کم کرایہ لندن سے کلکتہ تک کا ہے۔ اس لیئے وہ کلکتہ کو مال اپنے لندن کے اسٹاک سے بھجواتا ہے ÷

پر طیار کی جائیں۔ اس کے لئے مشترکہ سرمائے کی کمپنیوں کی ضرورت ہے ہندوستان میں ابھی اس کا رواج کم ہوا ہے۔ گو یہ اب بڑھ رہا ہے۔ گورنمنٹ کے سلوک کے متعلق ہم آگے ہی کہ چکے ہیں کہ ہندوستان میں گورنمنٹ نے بہت سرد مہری کا سلوک کیا ہے۔ چائے اور نیل کے لئے تو ہر قسم کی مراعات دی گئیں لیکن اور کسی بھی صنعت اور حرفت کے لئے کچھ نہ کیا گیا ✣

بعض دفعہ یہ بھلا دیا جاتا ہے کہ ہماری ہندوستان کی تجارت کے متعلق شکایت کیا ہے۔ یہ بالکل ٹھیک ہے کہ اس وقت ہندوستان کی تجارت پچھلے وقتوں سے بہت زیادہ ہے۔ لیکن بات یہ ہے کہ جہاں ہندوستان پہلے یہاں کی بنی ہوئی چیزیں باہر بھیجا کرتا تھا وہاں اب یہاں سے کچا مصالحہ زیادہ باہر جاتا ہے۔ دوسرے یہ کہ تجارتی دنیا میں اُس وقت ہندوستان کا جو درجہ تھا اور جس درجے پر یہ اپنی بے شمار پیداوار کے لحاظ سے اب بھی پہنچ سکتا ہے۔ وُہ درجہ اب اس سے چھینا جا چکا ہے۔ اس کے لئے ہم دوسرے ملکوں کی گراوٹ نہیں چاہتے۔ بلکہ اپنے ملک کی تجارتی ترقی کے خواہاں ہیں ✣

سنہ ۱۹۱۹ء میں ہندوستان کی تجارت درآمد و برآمد کی قیمت ۵ ارب ۴۵ کروڑ روپیہ تھی۔ اس میں تجارت درآمد ۳ ارب ۸ کروڑ اور برآمد ۲ ارب ۲۷ کروڑ روپیہ کی تھی۔ سنہ ۱۹۱۴ء میں تجارت درآمد ۱ ارب ۸۵ کروڑ تھی۔ اور برآمد ۲ ارب ۴۵ کروڑ۔ لیکن ان دونوں سالوں کی قیمتوں میں بڑا فرق ہے۔ اگر ہم قیمتوں کو خیال میں رکھ کر مقابلہ کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ جنگ یورپ سے پہلے کی نسبت ہماری تجارت درآمد

میں ۴۵ فیصدی کی کمی ہوگئی ہے۔ اور ہماری تجارت برآمد میں ۱۹ فی صدی کی ✣

تجارت درآمد

تجارت درآمد میں سب سے پہلا درجہ سوتی کپڑوں کا ہے۔ یہ امر موجب تسلی ہے کہ سوتی کپڑوں میں ہماری درآمد ۱۹۱۴-۱۳ء سے کم ہے۔ لڑائی سے پہلے ہم ۶ کروڑ ساٹھ لاکھ پونڈ کی قیمت کے کپڑے منگوایا کرتے تھے۔ ۱۹۲۰-۱۹۱۹ء میں باوجودیکہ کپڑوں کی قیمت بڑھ گئی تھی ان کی درآمد کی قیمت کل ۵ کروڑ ۹۰ لاکھ پونڈ یعنی ۵۹ کروڑ روپے تھی۔ لڑائی سے پہلے سوتی کپڑے ہماری کل تجارت درآمد کا ۳۶ % تھے۔ وہاں ۲۰-۱۹۱۹ء میں ان کی مقدار کل ۲۸ % رہ گئی ہے ✣

ہندوستان میں بنے ہوئے کپڑے کی مقدار ۱۹۱۴-۱۳ء کی نسبت ۲۰-۱۹۱۹ء میں ۱۴ فیصدی زیادہ ہوگئی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کے کپڑے کے کارخانوں نے لڑائی کے دوران میں ہندوستان کی منڈیوں پر قبضہ کرنا شروع کر دیا ہے۔ موجودہ کھدر تحریک اور سودیشی امید ہے۔ کہ ہندوستانی کارخانہ واروں کو ایک طرح کی نئی حفاظت ہوگی۔ اور امید کی جاتی ہے کہ وہ اس سے فائدہ اٹھا کر ہندوستان کو اس معاملہ میں بہت درجہ تک آزاد بنا دیں گے ٭ ✣

٭ کپڑے کے کارخانے ہندوستان میں نہایت ہی فائدہ مند ہیں۔ ٹاٹا کے ایمپرس ملز کے ایک حصہ کی قیمت جو ۱۸۷۶ء میں ۵۰۰ روپیہ تھی۔ اب ۱۶۰۰ روپیہ ہے اور ہر ایک حصہ پر اس وقت تک ۲۰۰۰ روپیہ نفع دیا جا چکا ہے۔ ٹاٹا کی تشویش

اس زمین میں کھڈی کا ذکر کرنا بے محل نہ ہوگا۔ دوسرے ملکوں کی مثالیں دے کر یہ کہا جاتا ہے کہ ہاتھ مشین کا مقابلہ کرنے کے قابل نہیں ہوں گے لیکن جو لوگ یہ کہتے ہیں وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ ہندوستان میں کھڈیوں نے مشینوں کا بڑی دیر تک مقابلہ کیا ہے۔ اور بیسویں صدی کے آغاز سے کھڈی کے کپڑے میں ترقی ہو رہی ہے۔ کمی نہیں۔ بات یہ ہے کہ جو کپڑا ہاتھ سے بُنا جاتا ہے۔ وہ مشین پر بُننا مشکل ہے۔ (نہ ہی دریائی اور نہ ہی کھدر مشینوں پر بن سکتے ہیں) اس طرح سے کھدر کے لئے بڑی گنجائش ہے۔ دوسری ایک مددگار پیشہ کے لحاظ سے کھڈی بڑی مفید چیز ہے۔ ہندوستان میں ایک کثیر تعداد ایسے لوگوں کی ہے جن کے لئے کھڈی کے دو آنے روزانہ ایک بڑی مدد ثابت ہو سکتے ہیں۔ سرونٹ آف انڈیا سوسائٹی کے بمبئی کے تجربے اور سر پھول چند رائے کے کھلنا کے قحط کے تجربے اس بات کے ثبوت میں پیش کئے جا سکتے ہیں ۔

دوسرا درجہ کھانڈ کا ہے ۱۹۱۸-۱۹ء میں کھانڈ کی درآمد کل تجارت درآمد کا ۹ ۵/۰ تھی۔ اور ۱۹۲۰-۲۱ء میں ۱۱ ۵/۰ اور اس کی قیمت ۲۳ کروڑ روپیہ کے قریب تھی۔ اس طرح سے گو قیمت میں بیشی ہو گئی تھی۔ لیکن مقدار میں ۱۹ ۵/۰ کی کمی تھی۔ اس میں ۵ ۸ فیصدی سے زیادہ جاوا کی کھانڈ ہوتی ہے۔ ہندوستان

بقیہ نوٹ صفحہ ۲۴۹

مل میں ۱۹۲۰ء میں ۱۰۲ فیصدی منافع تقسیم کیا گیا تھا۔ اسی طرح سے سر فضل بھائی کریم بھائی کے مختلف کارخانوں میں ۱۰۰ فیصدی منافع معمولی بات ہے ! ان حالات میں ضروری ہے کہ ہمارے سرمایہ دار اس طرف خود متوجہ ہوں۔ اور کپڑے کی قیمت میں بھی کچھ کمی کریں۔ نہیں تو لوگوں کی حب الوطنی پر تجارت کرنے کا الزام بجا طور پر اُن پر عاید ہوگا ۔

کی اپنی کھانڈ کی صنعت کافی ترقی کر رہی ہے۔ اور ۱۹۱۹-۲۰ء میں ہی پچھلے سالوں کی نسبت ۲۱ فیصد زیادہ تیار ہوئی تھی۔ ۱۹۱۹-۲۰ء میں ہندوستان میں ۸ کروڑ من کھانڈ تیار ہوئی تھی۔ کھانڈ بنانے کی صنعت کی ترقی کے لئے ابھی ہندوستان میں بہت گنجائش ہے۔ موجودہ طریقہ سے گڑ یا شکر بنانے میں بہت سارا حصہ اس کا ضائع ہو جاتا ہے۔ اوّل تو گنے سے رس ہی پورا نہیں نکلتا۔ پھر گڑا ہوا کونٹا گرم کرنے سے اس کے ضائع ہونے کا امکان ہے۔ اور پھر صاف کرنے کے طریقے ناقص ہیں۔ ضرورت ہے کہ گاؤں میں کواپریشن کی امداد سے بہتر سامان منگوایا جائے۔ جہاں سارے گاؤں والے باری باری سے گڑ یا شکر بناتے رہیں ــ گنے کی فصل ویسی بھی بڑی قیمتی فصل ہے۔ اگر اس کی کاشت بڑھا دی جائے تو امید ہے کہ ہم بہت جلد باہر کی کھانڈ کی محتاجی سے آزاد ہو جائینگے۔

تیسرا درجہ لوہے کے سامان اور مشینوں کا ہے۔ ۱۹۱۱-۲۰ء میں ان کی درآمد کی قیمت کل درآمد کا ۳ فیصد تھی۔ اور ۱۹۱۸-۱۹ء میں ۱۰ فیصدی ۱۹۱۹-۲۰ء میں اس کی قیمت ۲۷ کروڑ روپیہ تھی۔ اس زیادتی کی وجہ ریلوں وغیرہ کے لئے بڑی مقدار میں انجن وغیرہ دوسری چیزوں کا آنا ہے۔ ہندوستان کی اپنی لوہے کی صنعت بھی اب ٹاٹا صاحب کی ہمت کی وجہ سے کافی ترقی کر رہی ہے اُن کا جمشید پور کا کارخانہ اب دنیا کے پانچ دس بڑے کارخانوں میں شمار ہونے لگ پڑا ہے۔ لوہا ہندوستان میں مختلف جگہ مل سکتا ہے۔ لیکن تکلیف کوئلہ کے ملنے اور لوہا کے ساتھ کی دوسری چیزوں کے استعمال کرنے کی تھی۔ جنگ یورپ نے باہر سے لوہے کا آنا نسبتاً بند کر کے ہندوستان کے لوہے کے کارخانوں کو کام کرنے کا موقعہ دیا۔ اور جس کی وجہ سے

یہ صنعت کافی ترقی کر گئی ہے۔

اس کے بعد مٹی کے تیل کا درجہ ہے سنہ ۱۹۱۹-۲۰ء میں اس کی درآمد کی قیمت ۸ کروڑ روپیہ تھی۔ ہندوستان میں مٹی کا تیل بیشتر برما سے ہی نکلا کرتا تھا لیکن اب اٹک آئل کمپنی نے پنجاب میں بھی نکالنا شروع کر دیا ہے۔

باقی چھوٹی چھوٹی مقدار کی مختلف چیزیں رہ جاتی ہیں۔ جن کے متعلق جدا لکھنے کی کوئی ضرورت معلوم نہیں دیتی ہے۔ اب اگر تجارت برآمد کے ہندسوں کو دیکھا جاوے تو جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے۔ تجارت برآمد کی کل قیمت ۳ ارب ۹ کروڑ تھی۔ اس میں بھی سب سے پہلا درجہ روئی کو ہے۔ اس کی برآمد سنہ ۱۹۱۹-۲۰ء ۸۹ کروڑ روپیہ کی تھی جس میں سے ۴۹ کروڑ کی تو خالص روئی تھی ۲۷ کروڑ روپیہ کا کپڑا دھاگا اور سوت۔ ان میں سے حوصلہ افزا بات سوتی کپڑے کی برآمد کی ترقی اور دھاگے اور سوت کی برآمد کی کمی ہے۔ سنہ ۱۹۱۳-۱۴ء میں ہندوستان سے صرف ۹ کروڑ ۵۹ لاکھ گز کپڑا باہر گیا تھا۔ وہاں سنہ ۱۹۱۹-۲۰ء میں ۱۹ کروڑ ۶۰ لاکھ گز۔ اگر ان ہندسوں کو تجارت درآمد کے ہندسوں کے ساتھ مقابلہ کر کے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ ہماری روئی کی کاشت ہماری ضرورت سے زیادہ ہے۔ ہندوستان میں کپڑا آیا تو ۱۵۹ کروڑ روپیہ کا اور روئی اور روئی کی چیزیں گئیں ۸۹ کروڑ روپیہ کی اس میں سے باہر جانے والی روئی کی قیمت ہی ۵۹ کروڑ روپیہ تھی۔ یہ ہندسے بہت کچھ حوصلہ افزا ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہندوستان میں اعلیٰ درجے کے سوتی کپڑوں کے بننے کا انتظام کیا جائے۔

دوسرا نمبر جوٹ کا ہے۔ کچا جوٹ ۲۵ کروڑ روپیہ کا اور جوٹ کے بنے ہوئے تھیلے وغیرہ ۵۰ کروڑ روپیہ کے باہر گئے۔ جوٹ کی پیداوار میں ہندوستان

سب سے آگے ہے اور اس وقت جوٹ سے بنی ہوئی چیزوں میں بھی اس کا درجہ سب سے آگے ہے۔

تیسرے درجہ پر چمڑا اور کھالیں ہیں۔ سنہ ۲۰-۱۹۱۹ء میں ان کی برآمد کی قیمت ۳۶ کروڑ روپیہ تھی۔ اس میں یہ بات یاد رکھنے کے لائق ہے کہ اب درست شدہ کھالیں اور چمڑا باہر جانے لگ گیا ہے۔ ضرورت ہے کہ اس طرف زیادہ توجہ دی جائے۔

اس کے بعد ۲۶ کروڑ روپیہ کے بیج اور ۲۰ کروڑ روپیہ کی چائے کا درجہ ہے۔ جس کے بعد غلہ کا درجہ آتا ہے۔ سنہ ۲۰-۱۹۱۹ء میں غلہ بہت کم مقدار میں باہر بھیجا گیا تھا۔ جس کی وجہ سے اس کا درجہ دیر میں آیا۔ سنہ ۱۹۰۸ء سے ۱۹۱۸ء تک کے دس سالوں میں ہندوستان سے ۴۰ کروڑ من غلہ باہر گیا۔ جب کہ انہی دس سالوں کی پیداوار ۲ ارب ۳۰ کروڑ من کے قریب تھی۔ اس طرح سے اوسط برآمد چار کروڑ من فی سال کے قریب ہے۔ اور کل پیداوار کا شکل سے ۲ % حصہ ہوتا ہے۔ ہندوستان کے متواتر خشک سالیوں کے ذریعہ میں اتنی مقدار بھی باہر جاتی ہوئی بُری معلوم دیتی ہے۔ اور ضروری ہے کہ اس پر پہلے ہندوستانیوں کے حق کا خیال کیا جائے۔ یہ کرنا تو ناممکن ہے کہ ہندوستان سے برآمد بالکل بند کر دی جائے۔ کیونکہ اچھی فصلوں کے دنوں میں زمیندار لوگ اپنی فصل کو کم قیمت پر بیچنے پر مجبور ہوں گے۔ اور ان کے لئے اچھے اور بُرے سال ایک جیسے ہی ہو جائیں گے۔ قابلِ عمل یہ تجویز ہے کہ گیہوں کی برآمد پر محصول لگا دیا جائے۔ جس کی شرح اس طرح سے رکھی جائے کہ جیسے جیسے ہندوستان میں قیمت زیادہ ہو۔ ویسے ہی شرح محصول بھی بڑھ جاوے۔ اور تنگ سالی کی قیمتوں پر آ کر اتنا محصول ہو کہ

باہر جانا بالکل فائدہ مند نہ ہو۔ یہ محصول خود بخود ہی بازار کی قیمتوں کے گھٹنے بڑھنے کے ساتھ ہی ساتھ برآمد کو زیادہ اور کم کرتا جائے گا۔ اور پھر اس کی تجارت میں کسی قسم کا دخل دینے کی ضرورت نہ رہیگی +

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے ہندوستان کی تجارت برآمد میں قابل افسوس بات اُس کچے مصالحے کا باہر جانا ہے جس سے کہ چیزیں ہندوستان میں بھی بنائی جا سکتی ہیں ہے۔ ۹۵ کروڑ روپیہ کی روئی کا باہر جانا ۲۷ کروڑ روپیہ کے جوٹ کا باہر جانا اس طرح سے مختلف قسم کے بیجوں کا باہر جانا وغیرہ وغیرہ گنا جا سکتا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اس کچے مصالحہ کو ہندوستان میں ہی مختلف چیزوں کی شکلوں میں تبدیل کر دیں۔ اور جہاں ہم کوئی چیز اپنی ضرورت سے زیادہ پیدا کرتے ہیں۔ اس کو باہر بھیجدیں۔ اس کے متعلق سرکار کئی طرح سے ہماری مدد کر سکتی ہے۔

ا۔ جیسے کہ ہم مالی پالیسی کے بیان میں تبلائیں گے۔ باہر کی درآمد پر حفاظتی محصول لگا کر ہندوستان کی صنعتوں کو ترقی کرنے کا موقعہ دیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس بات کا خیال رکھنا چاہیئے کہ صرف ان صنعتوں کے لیئے حفاظت کا انتظام ہو۔ جن کے یہاں کامیاب ہونے کی امید ہے +

۲۔ کئی صنعتیں ایسی ہیں جن میں گورنمنٹ مالی امداد دے سکتی ہے۔ ایسی صنعتوں کے لیئے جو ملک کے لیئے نہایت ضروری ہوں سرکار ہی مالی امداد قرضہ وغیرہ کا انتظام کر سکتی ہے۔ لیکن یہاں رشوت خوری کے برخلاف انتظام کرنا ہوگا۔

۳۔ اعلیٰ صنعتی تعلیم کے لیئے یہاں انتظام کر کے سرکار کئی صنعتوں کو یہاں ممکن بنا سکتی ہے۔ اس وقت تک ہیں صنعتوں کی ترقی کے لیئے کوشش

اور حوصلہ تو بہت ہے لیکن اُن لوگوں کے لئے جو صنعت کا کام کرنا چاہیں ضروری تعلیم کا کوئی انتظام نہیں ہے۔ لیجسلیٹو اسمبلی نے اپنے پچھلے اجلاس میں اس مطلب کا ریزولیوشن پاس کیا تھا کہ گورنمنٹ ہند اور مختلف صوبوں کی گورنمنٹیں اس بارے میں کام کرنا شروع کریں۔ صنعتی کمشن نے بھی اس بارے میں سفارش کی تھی۔ ایک تو مختلف یونیورسٹیوں کے ساتھ ریسرچ کا انتظام ہونا چاہئے۔ تاکہ ہندوستان کے کیمیادان اپنے علم کو ہندوستان کی خدمت میں صرف کرسکیں۔ ابھی سر پی سی رائے کے ماتحت رنگوں کی صنعت پر ریسرچ ہوتی رہی تھی۔ اور اب انہوں نے اعلان کیا ہے کہ اُن کے طالبعلموں نے ہندوستان کی چیزوں سے نباتاتی رنگ بنانے کی نئی اور آسان ترکیب نکال لی ہے اسی طرح سے مختلف جگہ پر سرکار اس قسم کی ریسرچ کے لئے انتظام کرسکتی ہے۔ اور کچھ صنعتوں میں تعلیم کا بندوبست بھی کیا جاسکتا ہے۔ اس بارے میں جمشید پور کے معدنیات کے کالج کی قائمی باعث اطمینان ہے۔

۴۔ سرکار نمونے کے کارخانے کھولنے کا انتظام کرسکتی ہے۔ ہندوستان کی پیداوار انتہا ہے۔ لڑائی کے دنوں میں جب گورنمنٹ کو ضرورت پڑی تو اس نے مختلف صنعتوں میں ہاتھ ڈالا اور کئی صنعتیں جن کا ہندوستان میں کامیاب ہونا پہلے ناممکن خیال کیا جاتا تھا کامیاب ہوئیں اسی طرح سرکار مختلف صنعتوں کا ابتدائی کام پہلے کرا کے انکو پھر عام لوگوں کے ہاتھ بیچ سکتی ہے۔

۵۔ ہندوستان میں مختلف کارخانوں اور صنعتوں کیلئے مختلف ماہروں کے مشورے کا انتظام کیا جاسکتا ہے۔ موجودہ صنعتی ڈیپارٹمنٹ کے مختلف افسر اپنی مختلف صنعتوں سے واقفیت کی وجہ سے لئے جاسکتے ہیں۔ اور پھر اُن کے مشورے سے مختلف کارخانوں کو مستفید کیا جاسکتا ہے۔

گورنمنٹ جو کچھ کرسکتی ہے یا کرے گی اس کو چھوڑ کر ہندوستان

کی صنعتی ترقی کے لئے اور بھی کچھ کیا جاسکتا ہے۔ موٹی موٹی تجویزیں نیچے دی جاتی ہیں۔

۱۔ روپیہ سب سے ضروری چیز ہے۔ ہندوستان کی صنعتی ترقی کے لئے صنعتی بینکوں کی ضرورت ہے۔ ٹاٹا انڈسٹریل بینک اور ایک دو اور بینک اس قسم کے نکل چکے ہیں۔ لیکن اس بارے میں ابھی بہت ترقی کی گنجائش ہے۔ ضرورت ہے کہ صنعتی بینکوں کی شاخیں ہر ایک بڑے بڑے شہروں میں ہوں۔ تاکہ کوئی کام صرف روپیہ کے نہ ملنے کی وجہ سے نہ رہ جائے۔

۲۔ مشترکہ سرمایہ کی کمپنیوں کے طریقہ کا بھی ہندوستان میں زیادہ رواج ہونے کی ضرورت ہے۔ لیکن یہ ضروری ہے کہ یہ اُن لوگوں کے ہاتھ میں ہوں جو اس کام کو جانتے ہوں۔ یونہی لوگوں کو بٹورنے کے لئے "قومی" اور "گاندھی" یا انٹرنیشنل نام کے ساتھ لگا کر پیسے اکٹھا کرنے کا سودا نہ ہوں۔

۳۔ عام بینکوں کا بھی ملک میں پھیلنا ضروری ہے۔ عام بینک معمولی لوگوں سے روپیہ لے کر اس روپیہ کو تجارتی کاموں کے لئے دستیاب کرسکتے ہیں۔ اور پھر اُن لوگوں کا روپیہ جو آگے تجارت میں حصہ لیتے ہیں صنعت میں لگ سکتا ہے۔ ہندوستان کی صنعتی ترقی میں بینک بڑی لازمی شے ہیں۔

۴۔ دستکاری کے کاموں کو Cooperative اصول پر لانے کی ضرورت ہے۔ اس طرح سے ہندوستانی کاریگر اپنے مال کو اچھی طرح سے بیچ سکتے ہیں۔ اور اپنے لئے کچا مصالحہ اچھے داموں خرید سکتے ہیں۔ اور ساہوکاروں کی سود کی غلامی سے نجات پا سکتے ہیں۔
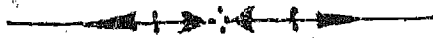
ہندوستان کا سرکاری قرضہ

سنہ ۱۹۲۰ء کے آخر میں ہندوستان کا سرکاری قرضہ ۲۷ کروڑ ۸۰ لاکھ پونڈ تھا۔ اس قرضے کی کہانی بھی عجیب ہے۔ پنجاب کے ویران علاقے کو سرسبز بنانے والی نہروں کے خرچ سے لے کر ابی سینیا کی مہم کا خرچ اس میں شامل ہے۔ ہندوستان جو روپیہ ولایت کو ہر سال بھیجتا ہے۔ اس کا بڑا حصہ اس قرضہ کا سود ہے۔ جو وقتاً فوقتاً ہندوستان کی گورنمنٹ لندن کے ساہوکاروں سے لیتی رہی ہے۔ اس اخراج کے مسئلہ کو سمجھنے کے لئے اس قرضے کی تاریخ کا جاننا بھی ضروری ہے۔

سنہ ۱۷۹۲ء میں ہندوستان کا قرضہ کل ۷۰ لاکھ پونڈ تھا۔ اس کے بعد ٹیپو کے ساتھ جھگڑا ہوا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سنہ ۱۷۹۹ء میں یہ قرضہ ایک کروڑ تک پہنچ گیا۔

لارڈ ولزلی کی شاندار فتوحات نے سنہ ۱۸۰۵ء میں اس قرضے کو ۳ کروڑ ۱۰ لاکھ پونڈ تک پہنچا دیا۔ اور سنہ ۱۸۰۷ء میں اس کی مقدار ۳ کروڑ ۷۰ لاکھ ہو گئی۔ کئی سال تک اس میں کوئی زیادتی نہ ہوئی۔ اور سنہ ۱۸۲۹ء میں اس کی مقدار تین کروڑ تھی۔ اب لارڈ بنٹنگ نے اخراجات کو گھٹانے کی کوشش کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سنہ ۱۸۳۶ء میں اس قرضہ کی مقدار ۳ کروڑ ۲۹ لاکھ ۷۴ ہزار ۴ سو چونتیس تھی۔ اور اگر اس میں ولایت کا ایسٹ انڈیا کمپنی کا قرضہ بھی شامل کر لیا جائے تو یہ ۳۰،۲۲،۷۸،۳۲۷ پونڈ بنتا ہے۔ لیکن لارڈ آکلینڈ کے تشریف لاتے ہی یہ کمی سب پوری کر دی گئی۔ حکومت برطانیہ کے احکام کے مطابق جنگ افغانستان شروع ہوئی۔ اس بنا پر ایسٹ انڈیا کمپنی

نے اس جنگ کے اخراجات کو اپنے سر لینے سے انکار کردیا۔ پارلیمنٹ میں مشہور پالی ٹیشن برائٹ نے کمپنی کے حق میں آواز اٹھائی۔ لیکن سنتا کون تھا۔ اس لڑائی کا خرچ ۱ کروڑ ۵۰ لاکھ پونڈ ہوا تھا۔ اور یہ سارے کا سارا کمپنی کے قرضہ میں شامل کردیا گیا۔ اور اب قرضہ ۴۳۵۰۲۷۵۰ پونڈ ہوگیا۔ ان دنوں ہندوستان کو فتح کرنے کی پالیسی زوروں پر تھی۔ سندھ امیروں سے چھینا گیا۔ پنجاب میں سکھوں سے لڑائیاں ہوئیں۔ اور ۱۸۵۰ء میں قرضہ کی رقم ۵۵۵۹۹۳۱۵ پونڈ تک جا پہنچی۔ اب کچھ گھبراہٹ شروع ہوئی۔ اور قرضہ کو کم کرنے کا کچھ فکر کیا گیا۔ لیکن لارڈ ڈلہوزی کے عہد حکومت نے رہی سہی کسر پوری کردی ۱۸۵۶-۵۷ء میں ۶۶۹۱۷۴۹۵ پونڈ ہوگیا۔ ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے ایک سال کے خرچ نے ۱ کروڑ پونڈ کا اس میں اور اضافہ کردیا۔

سپاہیوں کی بغاوت کی بابت دو باتیں یاد رکھنے کے لائق ہیں۔ ایک تو یہ کہ اس کا باعث انگلستان کے محکمہ جنگ کی غلطی تھی۔ دوسرے یہ کہ اس سے پہلے جب کبھی ہندوستان کی فوجوں کو ہندوستان سے باہر بلایا گیا تھا تو اُن کا خرچ ہندوستان کے خزانہ سے دیا جاتا رہا تھا۔ اس لئے اب جب انگریزی فوجیں یہاں آ رہی تھیں تو اُن کا خرچ انگلستان کو دینا چاہئے تھا۔ ان دونوں باتوں کو نظر انداز کرکے ۱۸۵۷ء کی بغاوت کا سارا خرچ ہندوستان کے سر پڑا لگیا۔ نہ صرف یہ بلکہ خرچ کا اندازہ لگانے کا طریقہ بھی عجیب تھا۔ ہندوستان کو آنے والے سپاہیوں کا سارا خرچ اُن کے انگلستان سے روانہ ہونے سے چھ ماہ پیشتر سے ہی ہندوستان کے سر پر ڈالا گیا۔ اور انگلستان نے بغاوت سپاہیاں میں بھی روپیہ کمایا!

ہندوستان کی حکومت گورنمنٹ انگلستان کے ماتحت آنے سے پہلے کمپنی کا قرضہ اس طرح سے ۷ کروڑ تک پہنچ چکا تھا۔ ۱۲ لاکھ پونڈ ایسٹ انڈیا کمپنی کے حصہ داروں کو دیئے گئے۔ اور وُہ بھی ہندوستان کے سر پر ڈالے گئے۔ یہ سلوک ہندوستان کے ساتھ ہی کیا گیا۔ اس کے بعد جب نیاگرا کمپنی سے حکومت انگلستان نے نیاگرا لیا تو کمپنی کو جو روپیہ دیا گیا وُہ حکومت انگلستان نے خود دیا۔ جنوبی افریقہ کی بغاوت کے فرو کرنے کے خرچ کا بہت تھوڑا حصہ جنوبی افریقہ نے دیا۔ غرضیکہ یہ ۷ کروڑ پونڈ کا قرضہ خواہ مخواہ ہندوستان کے سر منڈھا گیا۔

وزیر ہند کے ماتحت آتے ہی قرضہ کی رفتار تیز ہوگئی۔ اور ۱۱ سالوں میں یہ دگنا ہو گیا۔ جہاں کمپنی کے ماتحت ۷ کروڑ ایک صدی میں ہوئے تھے۔ وہاں اب یہ رقم ۱۹ سالوں میں پوری ہو گئی۔ اور ۱۸۷۷ء میں قرضہ ۱۳۸۹۳۵۰۲۵ پونڈ تک پہنچ گیا۔ ہر ایک سکیم کے لئے خواہ وُہ فائدہ مند تھی یا فضول وزیر ہند کو روپیہ دینے کے لئے مجبور کیا گیا۔ کئی وائسرائے اور کئی وزیر ہند چلاتے رہے لیکن اُن کی سنی ہی نہ گئی۔ بلکہ خلاف قانون اخراجات بھی ہندوستان کے سر ہی تھوپے گئے۔ ریلیں تو ان دنوں خوب بنیں۔ لیکن جہاں گورنمنٹ ہند نے ۱۰۰۰۰ پونڈ ۳ فیصدی شرح سے قرض لے کر ایک میل کو بنایا۔ وہاں پہلی ولائتی کمپنیوں نے حکومت انگلستان کے سایہ عاطفت میں بیٹھ کر ایک میل پر ۱۷۰۰۰ پونڈ خرچ کئے۔ اور حکومت ہند

نوٹ۔ اس بات کو رامیش چندر نے بڑی خوبی سے بیان کیا ہے۔ کہ برطانیہ نے ہندوستان ایسٹ انڈیا کمپنی سے خریدا۔ لیکن بجائے اس کے کہ خریدار قیمت ادا کرے جیسا کہ عام دنیا کا دستور ہے قیمت بھی ہندوستان کو دینی پڑی ہے

سے ۵ فیصدی کی شرح سے سود وصول کیا۔ یہ ٹھیک ہے کہ گورنمنٹ ہند کی آمدنی بھی ان ۱۹ سالوں میں ایک کروڑ ۸۰ لاکھ پونڈ بڑھ گئی۔ لیکن اس ابزادی میں زیادہ حصہ غریب ہندوستانیوں پر لگائے ہوئے ٹیکسوں کا تھا۔ یورپین لوگ تو (جیسا کہ لارڈ لارنس نے لکھا ہے) فوراً شور مچا دیتے تھے۔ اور جھٹ وزیر ہند سے حکم جاری کروا لیتے تھے۔

سنہ ۱۸۷۷ء کے بعد تو قرضہ آناً فاناً بڑھنا شروع ہوا۔ اور سنہ ۱۹۰۱ء میں یہ ۱۰۵ ۳۳ ۶۳ ۲۲ پونڈ تک پہنچ گیا۔ اس زیادتی میں نہ صرف ایسی مدوں کا ہی خرچ شامل ہے جن سے لوگوں کو فائدہ اور حکومت ہند کو آمدنی ہے۔ بلکہ جنگ افغانستان جنگ برما اور تبت کی مہم جیسی فضول خرچیوں کی قیمت بھی شامل ہے۔ ریلوں کی بابت بھی یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ گو اب ریلوں سے گورنمنٹ کو منافع ہے لیکن یہ منافع بیسویں صدی کے آغاز سے شروع ہوا ہے۔ اور کہ انیسویں صدی کے خاتمہ تک پچاس کروڑ روپیہ لوگوں سے ٹیکس لگا کر ریلوے کے گھاٹے کو پورا کرنے کے لئے خرچ کیا جا چکا تھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ ریلیں ہندوستان میں ہی ہیں اور ان سے ہندوستان کو مالی اور اقتصادی دونوں طرح کا فائدہ ہے۔ لیکن بات یہ ہے کہ جس قیمت پر یہ فائدہ خریدا گیا وہ بہت زیادہ تھی۔

بیسویں صدی میں سنہ ۱۹۱۴ء تک اس قرضہ کی مقدار ۲۷ کروڑ ۴۳ لاکھ پونڈ تک پہنچ گئی۔ لیکن اس میں سے ۹ کروڑ روپیہ ریلوے اور شہروں کے لئے قرض لیا گیا تھا یعنی اس عرصہ میں کوئی بے معنی اور فضول زیادتی نہیں ہوئی۔ جنگ یورپ کے شروع ہونے پر گورنمنٹ ہند نے ۱۰ کروڑ پونڈ گورنمنٹ انگلستان کی نذر کئے جن کو شامل کر کے سنہ ۱۹۲۰ء کے اخیر میں قرضہ

کی مقدار ۲۳ کروڑ ۸۰ لاکھ ہو گئی ہے۔

لیکن اب اگر موجودہ قرضے کے ہندسوں کو دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس دس کروڑ پونڈ کے نذرانہ کو چھوڑ کر حکومت ہند کا قرضہ ایسی مدّوں میں ہی خرچ ہُوا ہے۔ جن سے کہ آمدنی کی صورت ہے۔ یا جو کافی آمدنی دے رہی ہیں۔ اس قرضہ کا بڑا حصّہ ریلوں اور نہروں پر خرچ ہُوا معلوم دیتا ہے۔ اور دونوں صیغے ہی اس وقت نہ صرف اپنا خرچ مع سود نکال رہے ہیں۔ بلکہ کچھ اس سے بھی زیادہ۔ لیکن یہ ہندسے گمراہ کرنے والے ہیں۔ اور گورنمنٹ کی حساب کی کتابوں میں اگر اس وقت ایسٹ انڈیا کمپنی کے قرضے۔ ہندوستان سے باہر کی مہموں کے خرچ کا نام و نشان نہیں پایا جاتا ہے۔ تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ یہ خرچ ہی کبھی نہیں ہوئے یا گورنمنٹ برطانیہ نے اب ان رقموں کو اپنے خزانہ سے ادا کر دیا ہے بلکہ یہ کہ حکومت ہند ہر سال ہندوستانیوں پر ٹیکس لگا کر اپنی ضروریات سے زیادہ روپیہ وصول کرتی رہی۔ اور بچت کو ان قرضوں کے بیباق کرنے میں لگاتی رہی ہے۔ جن دنوں یہ کہا جاتا تھا کہ تعلیم کی ترقی یا حفظان صحت کی سکیموں پر خرچ کرنے کے لئے روپیہ نہیں ہے۔ ان دنوں ہی اس اپنے قرضے کو (جو کہ آخر کار کوئی بہت زیادہ بوجھ نہیں تھا۔ حساب کی کتابوں سے اڑانے کے لئے کروڑوں روپے خرچ کئے جاتے رہے نتیجہ یہ ہے کہ اگر کوئی اس وقت گورنمنٹ ہند کے حساب کو دیکھے تو اُسے کبھی اس بات کا پتہ ہی نہ چلے کہ ہندوستان کے قرضے میں کبھی مذکورہ بالا قسمیں بھی شامل تھیں۔

قرضے کی رقم اس وقت ۱۱ کروڑ ۸۰ لاکھ پونڈ کے قریب ہے۔ [illegible]

باقی ملکوں کے مقابلہ میں بہت تھوڑا ہے۔ لیکن انگلستان فرانس یا جاپان
کے قومی قرضے ان ملکوں کی لڑائیوں پر خرچ کا نتیجہ ہیں۔ ہندوستان میں
یہ عنصر غیر حاضر ہیں۔ اور گورنمنٹ ہند پچھلے قرضوں کو ٹیکسوں کے ذریعہ
بیباق کرتی رہی ہے۔ اس لئے یہ کمی کچھ تعجب خیز نہیں ہے۔ مسٹر
گوکھلے ہمیشہ اس بات پر زور دیتے رہے کہ گورنمنٹ کو تعلیم حفظان صحت
طبی امداد وغیرہ ایسے رفاہ عام کے صیغوں پر خرچ کرنے لئے روپیہ لگانا چاہئے۔
اور قرضہ کو کم کرنے کی کوشش نہیں کرنی چاہئے۔ وہ ہمیشہ اس کوشش
میں ناکامیاب رہے۔ لیکن اب روپیہ کی کمی نے کئی صوبوں کی حکومتوں
کو اس نیک صلاح کے اختیار کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔ اور کئی حکومتیں مقامی
قرضے لے کر تعلیم وغیرہ پر روپیہ خرچ کر رہی ہے۔

ہندوستان کے قرضے کے متعلق پانچ چار سال پہلے جو سب سے
بڑی شکایت تھی وہ یہ تھی کہ یہ سارے کا سارا ولایت میں لیا جاتا تھا اور
اس کا سود ایک طرح سے ہندوستان کا خراج بن جاتا تھا۔ لڑائی کے دنوں
میں جب گورنمنٹ نے دس کروڑ پونڈ کا عطیہ دینا چاہا تو ولایت میں
روپیہ کی کمی کی وجہ سے آخرکار اس قرضے کے لئے ہندوستان میں ہی
بندوبست کرنا پڑا جس کا نتیجہ نہایت کامیاب ہوا۔ ہندوستان سے جہاں
سرمایہ کی کمی بتلائی جاتی تھی دو سالوں میں کوئی ۸ کروڑ پونڈ کے قریب
قرضہ مل گیا۔ اس کامیاب تجربے نے آگے کے لئے یہ اصول توڑ دیا کہ
جب کبھی گورنمنٹ کو ضرورت پڑے تو ولایت سے ہی قرضہ لیا جائے
اس کے بعد جتنے قرضے لئے جاتے رہے وہ ہندوستان اور انگلستان دونوں
جگہ سے ہی لئے جاتے رہے ہیں۔

لندن کے ساہوکاروں کا منتر سنہ ۱۹۲۰ء میں پھر ایک دفعہ چل گیا۔ اور وزیر ہند نے لندن میں ۷ فیصدی شرح پر اجبکہ بازاری نرخ اس سے کم تھا ایک قرضہ لیا۔ اس قرضہ میں حصہ لینے کے لیے ہندوستانیوں کو کوئی موقعہ نہ دیا گیا۔ گورنمنٹ ہند تک سے تو مشورہ نہ لیا گیا جس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ ہندوستانی سرمایہ داروں نے اس کے برخلاف خوب اعتراض اٹھائے لیجیسلیٹو اسمبلی نے وزیر ہند کے اس رویہ کے برخلاف ریزولیوشن پاس کیا اور گورنمنٹ ہند کو اقرار کرنا پڑا کہ وہ آگے کو اس طرح سے ولائتی ساہوکاروں کو فائدہ اٹھانے نہ دے گی۔ امید ہے کہ لیجیسلیٹو اسمبلی کی نکتہ چینی کی زیر نگرانی وزیر ہند پھر ایسا کرنے کی جرأت نہیں کریگا۔

سالانہ نکاس

Drain

اگر بجٹ کے ہندسوں پر نگاہ ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ ہندوستان کے ٹیکس ہندوستان میں ہی خرچ نہیں ہوتے۔ بلکہ ان کا ایک اچھا خاصہ حصہ ولایت میں وزیر ہند کے خرچ کرنے کے لئے بھیجا پڑتا ہے سنہ ۲۳-۱۹۲۲ء کے بجٹ میں سے ہی ایک ارب ۲۴ کروڑ کی آمدنی میں سے پچاس کروڑ روپیہ ولایت میں خرچ کیا جائے گا۔ (اور اگر اس میں ۳۰ کروڑ اس قرضہ کے قرضہ میں سے ریلوے کے لئے یورپ میں خرچا جانے والا روپیہ شامل کر دیا جائے تو یہ رقم ۵۵½ تک پہنچ جائے گی) گویا محاصل کا ۵۰ فیصدی حصہ ہندوستان سے باہر خرچ ہو گا۔ ہر ایک گورنمنٹ اپنی آمدنی میں سے کچھ نہ کچھ روپیہ باہر خرچ کرتی ہے۔ اور یہ خرچ بذات خود کوئی بات نہیں

ہے۔ لیکن کسی ملک میں بھی آمدنی کا اتنا بڑا حصّہ باہر نہیں خرچ ہوتا ہے۔
آؤ دیکھیں اس کی کیا وجہ ہے:-

۱۔ اس خرچ کا ایک بہت بڑا حصّہ اس روپے کا سود ہے۔ جس سے کہ نہریں کھودی گئی ہیں۔ اور ریلیں بنائی گئی ہیں۔ ہندوستان کی تجارتی اور زراعتی ترقی کے لئے یہ دونوں چیزیں بڑی ضروری ہیں۔ اور دونوں ہی اب عام طور پر نہ صرف اپنی لاگت کا سود ہی نکال دیتی ہیں۔ بلکہ اپنی آمدنی میں سے کچھ نہ کچھ ہندوستان کے خزانے کو بھی نذر کر دیتی ہیں۔ لیکن سوال یہ نہیں ہے کہ اب یہ فائدہ مند ہیں یا نہیں بلکہ سوال ساتھ ہی یہ بھی ہے کہ کیا جتنا روپیہ اُن پر خرچ کیا جا چکا ہے وہ ضروری تھا یا نہیں۔ ہندوستانی ماہران علم اقتصادیات کی عام طور پر یہ رائے رہی کہ ہندوستان میں ریلوں پر جو روپیہ خرچ کیا جاتا رہا ہے وہ زیادہ تر ولایت کے کارخانہ داروں کے زور ڈالنے کا نتیجہ تھا۔ اور ملک کی ضروریات نہ ہی اس بات کی مقتضی تھیں۔ کہ اتنی ریلیں بنائی جائیں۔ اور نہ ہی یہ کہ ان پر اتنی اعلیٰ قسم کی مشینری استعمال کی جائے۔ عام طور پر ہندوستان کے وزیر مال بھی اس تیزی کے ساتھ ریلوں کے بنائے جانے کی مخالفت کرتے رہے ہیں۔ لیکن اُن بیچاروں کی آواز بھی خالی جاتی رہی ہے۔ ساتھ ہی جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے یہ خیال غلط ہے کہ ریلیں ہمیشہ فائدہ مند سود دار رہی ہیں ۱۸۹۸ء تک تقریباً ہر سال ایک کروڑ روپیہ کے قریب ریلوے پر گھاٹے کو پورا کرنے کے لیئے خزانہ ہندستان کو لگتا رہا ہے۔ اور ۱۸۹۹ء وہ پہلا سال تھا جس میں کہ ریلوے کو گھاٹا نہیں تھا۔ غرضیکہ ریلوے کے سود کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر محاصل ہند اور فوائد ہند کی اچھی طرح نگہبانی ہوتی تو ہمیں آج اس

قدر روپیہ اس سود میں دینا نہ پڑتا۔

نہروں کے متعلق معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ نہریں ہندوستان جیسے ملک میں زراعت کے لئے نہایت ضروری لوازمہ ہیں۔ لیکن ان پر بہت کم توجہ دی جاتی رہی ہے۔ جو روپیہ کہ ان پر لگایا جا چکا ہے اس کے متعلق تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ گورنمنٹ ہند کنجوسی سے کام لیتی رہی ہے۔ نہروں پر لگائے ہوئے روپے کا سود دیتے ہوئے ہندوستانی ٹیکس گذار کسی طرح بھی گھاٹے میں نہیں ہیں۔

خیر یہ تو پچھلی پالیسی کی نکتہ چینی ہوئی اس وقت اس کا کیا علاج ہے پچھلے قرضہ کا سود ہر طرح سے ہمیں دینا ہوگا۔ اور اس بارے میں ایک ہی علاج ہے۔ کہ ہندوستانی ساہوکار اس سرکاری قرضہ کے تمسک خرید لیں تاکہ ان کا سود بجائے ولایت کے لوگوں کے پاس جا کر ہماری قومی دولت پر ایک خراج ہونے کے ہمارے پاس ہی رہ کر اس میں ایک اضافہ کا ذریعہ بن جائے۔ اور نئے قرضوں میں پورے طور سے حصہ لیں تاکہ اور کوئی ایسا بوجھ ہمارے سر پر نہ پڑے۔ جو کہ غیر ضروری ہو ؎

اس بارے میں یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ ہر ایک ملک اپنی ضروریات کے مطابق غیر ملکوں میں قرضہ لیتا ہے۔ ہندوستانی نکتہ نگاہ یہ نہیں ہے کہ ہم لنڈن کی منڈی میں قرضہ لینا بند کر دیں۔ بلکہ یہ کہ وہاں غیر ضروری طور پر قرضہ لینے کے لئے نہ جائیں۔ اور ولائتی سرمایہ داروں کو ہندوستان کی گورنمنٹ خاص شرائط نہ دے ؎

(ب) دوسری بڑی بھاری رقم جو اس اخراج میں شامل ہے۔

وہ ہندوستان سے پنشن یافتہ انگریزوں کی پنشینں۔ رخصت پر گئے ہوؤں کی تنخواہیں۔ خاص ڈیپوٹیشنوں پر سیر کرنے۔ افسروں کا سفرخرچ وزیر ہند کے عملہ کی تنخواہ میں سے ہندوستان کے لیئے بھرتی کی ہوئی گورہ فوج کا ابتدائی خرچ۔ اس کو ہندوستان پہنچانے اور یہاں سے واپس لیجانے کا خرچ اور اسی قسم کی اور رقمیں شامل ہیں۔ یہ سب کچھ ہندوستان اور انگلستان کے ملکی تعلقات کی قیمت ہے۔ اور اس کو کم کرنے کا سوال علم معاشیات کی نسبت پالیٹکس سے زیادہ تعلق رکھتا ہے۔ ہندوستانی نقطۂ نگاہ (جس کو پبلک سروس کمشن کے تین ممبروں مسٹر دادابھائی نوروجی۔ سر ولیم ویڈربرن اور مسٹر کین انے اچھی طرح سے اپنی جدی رپورٹ میں واضح کیا ہے) یہ ہے کہ:۔

۱۔ ہندوستان میں انگریزافسروں (سول اور فوجی) کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ اور کہ اگر اس تعداد کو کم کرکے ہندوستانیوں کو ان کی جگہ دی جائے۔ تو خرچ میں ضرور ہی کمی ہو جائے گی۔

۲۔ اصلاحات سے پہلے وزیر ہند کے دفتر کا سارا خرچ ہندوستان کے سر پہ ڈالا جاتا رہا ہے۔ تیس پینتیس سال کی لگاتار جدوجہد کے بعد آخرکار انگلستان نے وزیر ہند کی تنخواہ کو خود دینا منظور کر لیا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی انڈین ہائی کمشنر کا دفتر تجارتی مطلب کے لیئے نیا کھولا گیا ہے۔ انڈین ہائی کمشنر کا عہدہ بذات خود ایک ضروری چیز ہے۔ لیکن اس کے ساتھ جو ایک Expert staff ولایت میں رہیگا۔ اور ایک ہندوستان میں سٹور ڈیپارٹمنٹ کے نام سے کھولا جائے گا۔ یہ خواہ مخواہ کا دگنا خرچ ہوگا۔ ہندوستان میں سٹور ڈیپارٹمنٹ کے کھلنے پر

(جو کہ جلدی ہی کھل جانا چاہیئے۔ اس کے Expert staff کو ہندوستان میں تبدیل کر دینا چاہیئے۔

۳۔ فوجی اخراجات میں بھی گورنمنٹ برطانیہ اپنا جائز حصہ دینے سے گھبرا رہی ہے۔ انگلستان کا محکمہ جنگ ہندوستان سے انگریزی فوج کی بھرتی کا خرچ وصول کرتا ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ محکمہ جنگ اس بارے میں بہت مہنگا سودا کرتا ہے۔ اور کہ وزیر ہند کے ماتحت اس کام کو کرنے سے یہ بھرتی کا خرچ بہت کم ہو سکتا ہے) تو کوئی وجہ نہیں کہ ہندوستان سلطنت برطانیہ کو ہندوستان میں چھ سال تک ملازمت کر چکنے والے سپاہی واپس دینے پر اُن کی تربیت کا خرچ وصول نہ کرے۔ اس کے ساتھ ہی اس فوج کو ہر سال ہندوستان میں لانے اور ہندوستان سے واپس لے جانے کے لیے جو رقم کہ سرکاری جہازوں کے بیڑے پر خرچ کی جاتی ہے اس سے بہت کم خرچ پر بھی پرائیویٹ کمپنیوں کے ذریعہ کرایا جا سکتا ہے +

ج۔ تیسرا حصہ اُن چیزوں کی قیمت کا ہے جو کہ ہندوستان کے مختلف محکموں کے لیئے ولایت سے خریدی جاتی ہے۔ ریلوں کے لئے مختلف سامان اور دوسری ایسی چیزیں بھی اس میں شامل ہیں۔ کوئی ملک بھی دوسرے ملکوں کے بین الاقوامی تجارت میں آزاد نہیں ہو سکتا۔ اور یہ امید کرنا کہ یہ خرچ کسی وقت میں بالکل اُڑ جائیگا فضول ہے۔ اس بات کو مانتے ہوئے بھی اس بارے میں دو شکائتیں ہیں۔

ا۔ صنعتی کمیشن کے سامنے شہادت دیتے ہوئے بہت سارے ہندوستانی تاجروں نے شکایت کی تھی کہ گورنمنٹ ہندوستان میں مال ملنے پر بھی خواہ مخواہ ولایت کے کارخانوں کی سرپرستی کرتی ہے۔ نامعلوم یہ صورت حالات کب تک

جاری رہتی۔ لیکن لڑائی نے یورپ سے مال کا آنا بند کر دیا۔ اس لیے گورنمنٹ کو مجبوراً ہندوستان کے کارخانوں کی سرپرستی کرنی پڑی۔ اور لڑائی کے بعد گورنمنٹ اس پالیسی سے انحراف نہیں کر سکی۔ اگر یہی پالیسی ہمیشہ برتی جاتی تو یہ نکاس پہلے ہی کم ہو جاتا۔ لیجسلیٹو اسمبلی نے سال گزشتہ میں اس بات کا ریزولیوشن پاس کیا تھا کہ حتی الامکان چیزیں ہندوستان میں خریدی جائیں گورنمنٹ ہند نے ابھی اس کو منظور کر لیا تھا (گو ولایت کے کارخانہ داروں کی طرف سے وزیر ہند پر زور ڈالا جا رہا ہے کہ وہ پھر ولایت کے کارخانوں کو ترجیح دیں) اگر گورنمنٹ اس بات کو عملی طور پر مان لے تو اس مد کے ماتحت نکاس میں کمی ہو جائے گی۔ مجوزہ سٹورز ڈیپارٹمنٹ (جو کہ ایک کمیٹی کی رپورٹ پر بنایا جانا تجویز ہوا ہے) اس بارے میں کافی کامیاب ہو سکتا ہے۔ لیکن ضرورت اس بات کی ہے کہ انڈین ہائی کمشنر کی جملہ خرید و فروخت بھی اس کے ہاتھوں سے نکلے۔ اور یہ جملہ سودے ہندوستان میں بھیج کر یہاں منظوری لینے کا دستور جاری کیا جائے ؎

۲۔ دوسری شکایت اس بارے میں یہ ہے کہ جب ممالک غیر سے چیزیں سستی قیمت پر مل سکتی ہیں۔ تو خواہ مخواہ انگلستان میں سودے کر کے ہندوستان کے بوجھ کو نہ بڑھایا جاوے۔ پچھلے سال ۱۹۲۱ء میں اس بارے میں ہندوستان کے فوائد کو بہت دفعہ قربان کیا گیا۔ اور آخر کار گورنمنٹ کو بھی اسمبلی کے زور دینے پر اس اصول کو خیرباد کہنے کا فیصلہ کرنا پڑا۔ اس کا علاج یہی ہے کہ سارے سودے ہندوستان میں بھیجے جائیں اور یہاں اُن کا فیصلہ ہو۔ اور ہائی کمشنر کو بطور خود سودے کرنے کا اختیار نہ دیا جائے ؎

اگر متذکرہ بالا مدوں میں یہ اصلاحات عمل میں آ جائیں تو یہ سالانہ نکاس

بہت کم ہو جائے گا۔ اور ہندوستان اس روپے کو یہاں ہی رکھ کر کچھ تو
گورنمنٹ کا خرچ کم ہو جانے اور قدرتاً ٹیکسوں کے کم ہو جانے سے اور کچھ
ان رقومات کو بجائے انگلستان کے تاجروں اور ساہوکاروں کو ادا کرنے
سے) اپنی صنعتی اور مادی ترقی میں کافی اضافہ کر سکیگا *
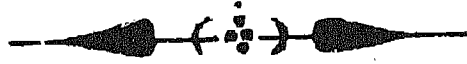
حصۂ پنجم
متفرق

ہندوستان کی مالی پالیسی

جس وقت برائیٹ اور کابڈن کی جدوجہد سے انگلستان کو آزاد تجارت
کی اجازت ہوئی اور اشیاء درآمد و برآمد پر سالانہ آمدنی کے خیال سے محاصل
خاص کا آغاز ہوا تو خیال کیا جاتا تھا کہ چند ہی دنوں میں ساری دنیا کھلی
تجارت کے ماتحت ہو جائے گی۔ بات یہ تھی کہ جن دلائل پر انگلستان
میں حفاظتی محاصل کے برخلاف آواز بلند کی جاتی تھی اُن کی نسبت خیال
کیا گیا تھا کہ وہ دنیا کے ہر ایک طبقہ اور زمانہ کے ہر دور کے لئے یکساں
مفید ہیں۔ ماہرین علم اقتصادیات کا بنایا ہوا قانون علم طبیعات کے قاعدوں
کی طرح ہر وقت یکساں اثر پذیر تھا۔ لیکن کھلی تجارت کے حامیوں کی حیرت
کی کوئی حد نہیں رہی جب کہ کچھ عرصہ کے بعد ہی فرانس جرمنی امریکہ کینیڈا
اور دوسرے بڑے بڑے ملکوں نے انگلستان کے ماہران علم اقتصادیات
کے شور و غل کے باوجود حفاظتی محصول لگانے شروع کر دیئے۔ لسٹ
نے جرمنی میں حفاظتی محصولوں کے حق میں "قومی اقتصادیات" لکھ کر علم
اقتصادیات میں کچھ نئے باب کا آغاز کیا۔ اور اس وقت سے اس علم کے ماہرین
نے محسوس کرنا شروع کیا کہ اس جگہ کی اقتصادی ضروریات یکساں نہیں ہیں
اور اس لئے عالمگیر اقتصادی قانون بنانا خطرہ سے خالی نہیں۔ انگلستان کے
ماہرین اقتصادیات پھر بھی اپنی پرانی پالیسی پر قائم رہے۔ اور گو حفاظتی
محاصلوں کا دور دورہ دنیا کے سارے بڑے بڑے ملکوں میں ہو گیا لیکن
انگلستان نے کھلی تجارت میں اپنے خودساختہ کلیے کو نہیں چھوڑا۔ اس کے
متعلق ایک بات یاد رکھنی چاہئے کہ گو انگلستان نے انیسویں صدی کے وسط

سے کھلی تجارت کی پالیسی بنائی تھی۔ لیکن اس سے پہلے ڈیڑھ سو سال تک
انگلستان بھی حفاظتی محصولوں کے سہارے ہی اپنی تجارت کو بڑھا رہا تھا۔
اسی حفاظتی پالیسی نے ہندوستان کی کاریگری کا ستیاناس کیا۔ اور اسی مضرت
رساں پالیسی نے اضلاع متحدہ امریکہ کے ساتھ نااتفاقی کا بیج بویا۔ کہا جاتا ہے
کہ اگر انگلستان اس پالیسی کو اختیار نہ کرتا تو ناممکن تھا کہ ہندوستان سے
گئے ہوئے سوتی کپڑوں کا مقابلہ کرکے اپنے کپڑوں کی صنعت کو آگے بڑھا
سکتا۔ غرضیکہ انگلستان نے ڈیڑھ سو سال تک اس پالیسی سے کامل فائدہ اٹھایا
اور اس پالیسی نے اُسے اس قابل بنا دیا کہ وہ انیسویں صدی کے وسط میں
دنیا کو کھلا چیلنج دے سکے۔ اور کسی قسم کی تجارت trade میں رکاوٹ نہ ڈالے۔
اب باقی قوموں کے لئے اس بات کی ضرورت تھی کہ وہ اپنی صنعتوں میں
ترقی کریں۔ اور اس لئے انہوں نے وہی طریقے اختیار کئے جو انگلستان نے
ڈیڑھ سو برس پہلے اختیار کئے تھے۔ لیکن وہاں کے ماہرین علم اقتصادیات
پچھلے حالات کو پس پشت ڈال کے اور اپنے نئے دریافت کردہ قانون کو
پیش کرکے ساری دنیا میں یہی وعظ دیتے رہے کہ کھلے بندوں تجارت ہونی
چاہیئے۔ بات یہ تھی کہ انگلستان کی صنعتوں نے اس درجہ ترقی کرلی تھی
کہ اُسے اب کسی اور ملک کے مقابلہ کا خوف ہی نہ تھا۔ لیکن رفتہ رفتہ
دوسرے ملکوں نے بھی صنعت کے میدان میں قدم جمانا شروع کیا۔ جرمنی
اور اضلاع متحدہ امریکہ نے اپنی قدرتی طاقتوں کا استعمال کرنا شروع کیا۔
جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ کچھ صنعتوں میں انگلستان کا مقابلہ کرنے کے قابل
ہوگئے۔ اب انگلستان کے کارخانہ داروں کو فکر دامن گیر ہوئی اور ماہران
علم اقتصادیات نے بھی صورت حالات کا حل طلب پایا۔ اور انگلستان

میں بھی حفاظتی محصولوں کے حق میں انیسویں صدی کے آخری حصہ میں عذراتِ
احتجاج بلند ہونے لگی - جوں جوں مقابلہ بڑھتا گیا یہ آواز بھی بلند ہوتی گئی
حتیٰ کہ مسٹر چیمبرلین نے سلطنت برطانیہ کے مختلف حصوں کو ترجیحی حقوق دینے
کی آڑ میں حفاظت کا ایک نیا طریقہ دریافت کیا - لڑائی سے پہلے تو اُن
کی آواز کا کوئی اثر نہ ہوا - لیکن لڑائی کے دنوں میں پچھلے سارے دلائل بھلا
دیے گئے - اور کچھ تو جنگ کی مجبوریوں سے اور کچھ حفاظت کے خیال سے
حفاظت کے اس نئے طریقے کی حمایت ہونی شروع ہو گئی - اور اس وقت یہ
سوال علم اقتصادیات کے ماہروں کے ہاتھ سے نکل کر ملکی مدبروں کے
ہاتھ چلا گیا +

قدیم ماہرانِ علمِ اقتصادیات کا یہ خیال کہ اقتصادی اصول ہر جگہ
یکساں طور پر استعمال کیے جا سکتے ہیں - ہندوستان کے لیے بہت نقصان دہ
ثابت ہوا - جب انگلستان کی بہتری اس بات میں تھی کہ باہر سے چیزیں آنی بند
کر دی جائیں تو ملکی مصلحتوں کی بنا پر یہ پالیسی اختیار کی گئی کہ ہندوستان
کی صنعتیں تباہ کر دی جائیں - جب انگلستان میں صنعتیں زور پکڑ گئیں اور کھلے
بندوں تجارت کا اصول فائدہ مند دکھائی دیا تو ہندوستان کو بھی اس
میں شامل کر لیا گیا اور اگرچہ ساری دنیا اپنی ترقی تجارت کے لئے حفاظتی
محصول بے تامل لگاتی ہو - لیکن ہندوستان کو اس بات کی اجازت نہ ملی اور اب
جبکہ پھر حفاظتی محصولوں کا سوال سامنے آ رہا ہے تو حالات کہہ رہے ہیں کہ
اگر ہندوستان نے کوشش نہ کی تو ہندوستان کو وہی راستہ اختیار کرنا
پڑے گا - جو کہ ایمپائر (علاوہ ہندوستان) کے لئے فائدہ مند ہے - خواہ
اس میں ہندوستان کو فائدہ ہو یا نقصان +

ہندوستانی مدبروں کا ہمیشہ یہ خیال رہا ہے کہ ہندوستان کی صنعتیں حفاظت کی محتاج ہیں۔ اور اگر ہندوستانیوں کا گورنمنٹ کے تجارتی قوانین میں کچھ اختیار ہوتا تو نہ ہندوستان کی صنعتیں اس طرح تباہ ہوتیں اور نہ اختراع و ایجاد کے رستہ میں رُکاوٹیں پیدا ہوتیں +

راناڈے۔ دادا بھائی ناروجی۔ گوکھلے۔ دت جوشی سارے کے سارے اس بات کے لئے چلاتے رہے کہ ہندوستان کے لئے اس بات کی اجازت ہونی چاہئے کہ وہ اپنی صنعتوں کو قائم کر سکیں۔ اور اس کے لئے اشیاء درآمد پر محصول قایم کرنا چاہئیے۔ اُن کی تو نہ سُنی گئی لیکن اب سلطنت برطانیہ کے فواید ؟ اس بات کو چاہتے ہیں کہ سلطنت کے اپنا ملک خیال کر کے اس کی صنعتوں کی حفاظت کی جائے۔ انگلستان بھی اپنی پالیسی چھوڑ بیٹھا ہے۔ اور جرمن مال کے مقابلہ میں ان صنعتوں کے لئے حفاظت کا انتظام کیا گیا ہے۔ جو کہ ابھی قائم ہو رہی ہیں۔ اور دوسرے ملکوں کی پیداوار سے مقابلہ نہیں کر سکتی ہیں۔ اب اس بات کے متعلق تو کسی کو شک ہی نہیں رہا کہ حفاظت اصولاً نقصان دہ ہے اس میں بھی شبہ نہیں کہ چند حالتوں میں اس کی ضرورت بھی ہے +

جب سلطنت برطانیہ کے لئے حفاظتی محاصل کی ضرورت ہے تو لازمی طور پر سلطنت برطانیہ کے مختلف ممالک لئے بھی فرداً فرداً حفاظت کی ضرورت ہو سکتی ہے۔ ترجیحی محاصل کا مسئلہ حفاظت کی ضرورت کو بذات خود تسلیم کرتا ہے۔ جیسا کہ پہلے کہا گیا۔ تقریباً سب کے سب ہندوستانی مدبر اس بات پر رہے ہیں کہ ہندوستان میں اشیائے درآمد پر محصول لگا کر ہندوستانی صنعتوں کو آگے بڑھنے کا موقعہ دیا جانا چاہئے۔ بات یہ ہے کہ ہندوستان نے مشینوں

کا استعمال ابھی ابھی شروع کیا ہے۔ اس واسطے ہماری خود ساختہ چیزیں ابھی مہنگی پڑتی ہیں۔ البتہ کچھ دنوں میں سستی تیار کریں گے۔ کیونکہ دوسرے ملکوں کی قیمتیں مدتوں سے قایم ہیں۔ اور زمانے نے جو ترقی کی گراہیں سکھا دی ہیں۔ انہیں ہم آہستہ آہستہ سیکھ لینگے۔ اگر حفاظتی محصول لگ جائے تو اُن کے مقابلے سے ہم فارغ ہو کر اپنی صنعت وحرفت کو بڑھانا شروع کر دیں گے۔ اور تھوڑے عرصہ میں ہم اُن کا مقابلہ کرنے کے قابل ہو جائینگے۔ دنیا کے سارے ملکوں نے اسی طرح ترقی کی ہے۔ اور ہندوستان کے لیئے بھی یہی ترقی کا ذریعہ ہے۔ ہندوستان میں ایک اور بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ یہاں کے لوگ عموماً زراعت کرتے ہیں۔ صنعت وحرفت کی نسبت زراعت میں آدمی کم کما سکتا ہے۔ اس لیئے ہندوستان میں فی کس آمدنی کم ہے۔ اس آمدنی کو بڑھانے کا سب سے آسان طریقہ ہندوستان میں صنعتوں کا جاری کرنا ہے۔ اگر ہماری آمدنی بڑھ گئی تو ہم پھر آئے دن کے قحط کا بھی مقابلہ کرنے کے لیئے تیار ہو جائینگے کیونکہ ہندوستان میں غلہ کی کمی کی وجہ سے قحط نہیں پڑتا۔ بلکہ غلہ خریدنے کے لیئے روپیہ نہ ہونے کی وجہ سے۔ غرضیکہ ہندوستان کو اس وقت حفاظت کی سخت ضرورت ہے

ایک بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ جس وقت ہم ہندوستان کے لیئے حفاظتی محاصل کا مطالبہ کرتے ہیں تو ہمارا یہ منشا نہیں ہوتا کہ ہم سب کچھ ہندوستان ہی میں کریں اور باقی ملکوں سے تجارت بند کر دیں۔ ہم صرف ان صنعتوں کے لیے حفاظت کا مطالبہ کرتے ہیں جو کہ ہندوستان کے طبعی اور معاشی حالات میں کامیاب ہو سکتی ہیں۔ یا جو کہ ہر ایک قوم کی زندگی کے لیئے ضروری ہیں۔ دنیا کا کوئی ملک بھی اس قابل نہیں ہے کہ ساری دنیا کی

ساری چیزوں کو پیدا کر سکے ۔ اس لیئے واجب ہے کہ مختلف ممالک ایک دوسرے
سے تجارت کر کے وُہ چیزیں حاصل کریں جو وُہ خود منافع پر پیدا نہیں کر سکتے
یا جن میں انہیں باقی چیزوں کی نسبت کم فائدہ ہے ۔ کہا جائیگا کہ ہندوستان
میں شاید یہ قابلیت ہو کہ وُہ سب کچھ پیدا کر سکے ۔ اس بات پر رائے زنی کرنا
فضول ہے لیکن یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ ہر ایک صنعت میں یکساں فائدہ
نہیں ہو سکتا ہے ۔ اگر ہمیں روئی کا کام کرنے میں ۱۵ فیصدی فائدہ ہے ۔
اور مشین بنانے میں ۵ فیصدی ۔ تو بہتر ہے کہ ہم امریکہ ۔ جرمنی یا انگلستان
سے مشین حاصل کر لیں ۔ اور خود کپڑا بننے کا کام کریں ۔ غرض کہ حفاظتی محاصل
کا مطلب ساری صنعتوں کو پیدا کرنا نہیں ہے ۔ بلکہ فائدہ مند اور ضروری صنعتوں
میں ترقی کرنا ہے ۔ لیکن سلطنت برطانیہ کے ساتھ ترجیحی سلوک کا معاملہ دیگر
ہے ۔ سنہ ۱۹۰۴ء میں لارڈ کرزن نے گورنمنٹ برطانیہ کو لکھا تھا کہ ہندوستان کے
ترجیحی سلوک کرنے سے سلطنت کو بہت کم فائدہ ہوگا ۔ ہندوستان کو تو بالکل
ہی فائدہ نہ ہوگا ۔ بلکہ زیادہ نقصان ہوگا ۔ لارڈ کرزن نے صاف صاف کہہ
دیا تھا ۔ کہ ہندوستان کی تجارتی پالیسی کا فیصلہ کرنے میں ہندوستان کی
نسبت انگلستان کے تاجروں کی آواز زیادہ سنی جاتی ہے ۔ پھر سنہ ۱۹۰۹ء میں
لارڈ کرزن نے دارالامرا میں اس سے بھی زیادہ صاف گوئی کی تھی ۔
اور کہہ ہی ڈالا تھا ۔ کہ وزیر ہند ہندوستان کی مالی پالیسی پر فیصلہ کرتے وقت
انگلستان کے مفاد کا زیادہ خیال کرتا ہے ۔ لیکن بدقسمتی سے سنہ ۱۹۱۲ء میں
ایک ہندوستانی ممبر نے اس سوال کو کونسل میں اُٹھایا ۔ اور آخر میں اُس
کو اپنا ریزولیوشن واپس لینا پڑا ۔ لڑائی کے بعد پرانی امپیریل کونسل کا غالباً
سب سے آخری کام اس سوال پر غور کرنا تھا ۔ اور ایک کمیٹی نے فیصلہ کیا کہ

کہ یہ سوال غور طلب ہے اور ایک کمیشن کے ذریعے اس کا فیصلہ ہونا چاہئیے
پچھلے مہینے سے مالی کمیشن دورہ کر رہا ہے۔ کچھ شہادتیں ہو چکی ہیں۔ اور کچھ
ہوں گی۔ اور غالباً پانچ چھ مہینے تک رپورٹ نکل جائے گی۔ کمیشن کے پریذیڈنٹ
مشہور سر ابراہیم رحمت اللہ ہیں۔ جنہوں نے پبلک سروس کمشن کی ممبر
کی حیثیت سے ایک زبردست اختلافی نوٹ لکھا تھا۔ اس لئے امید
کی جاتی ہے کہ آپ ہندوستان کے مفاد کا خیال رکھیں گے۔ اور کوئی
تجویز نہ کی جائیگی جو کہ ہمیں نقصان دہ ہو +

ترجیحی سلوک کے متعلق یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ اگر ہندوستان کی صنعتوں
کی حفاظت کرکے پھر ترجیحی سلوک کرنا ممکن ہو تو اس میں کسی کو بھی اعتراض
نہ ہوگا۔ سوال تو یہ ہے کہ آیا ایسا کرنا ممکن ہوگا۔ اُن صنعتوں کے لئے جن
کو ہندوستان میں ترقی دینا ہے۔ سلطنت کے مال کو ترجیح دینا بے معنی
ہوگا۔ لیکن یہاں بین الاقوامی التجارت کی ایک گرہ پڑ جاتی ہے۔ اگر ہم
نے باقی ممالک پر زیادہ محصول لگایا تو کیا وہ ہمارے ملک سے جانے
والی چیز پر اپنے اپنے ملک میں محصول نہ لگا دینگے۔ اور اس محصول
سے ہماری تجارت برآمد کو نقصان نہیں ہوگا۔ ہماری بین الاقوامی
تجارت کا بہت زیادہ حصہ سلطنت سے باہر کے ملکوں کے ساتھ
ہے۔ اس لحاظ سے کافی نقصان ہونے کا خطرہ ہے۔ غرضیکہ یہ سوال بہت
غور و خوض کا ہے۔ اور جو کوئی سکیم اس کے متعلق پیش کی جائے اُن میں
ان حل طلب باتوں پر بھی غور کر لینا ضروری ہے۔ لیکن معاملہ یہیں ختم
نہیں ہوتا۔ ایک ملکی سوال بھی سامنے آجاتا ہے کہ سلطنت کے حصول
کو ترجیحی سلوک دینا ایک طرح سے ان کو ایک تحفہ پیش کرنا ہے اور زبردستی

کا تحفہ بے معنی ہوتا ہے۔ اس لئے قبل اس کے کہ اس سوال کا فیصلہ کیا جائے
اس بات کا تصفیہ ضروری ہے۔ کہ ہندوستان کو مالی آزادی مل جائے۔ اگر
آزاد ہندوستان سلطنت کو یہ تحفہ پیش کرنا چاہے تو کسی کو اعتراض نہ ہوگا۔
لیکن انگلستان کی مجلس وزرا سلطنت کو ہندوستان کے نام سے تحفہ پیش
کرے تو یہ بے معنی زبردستی ہوگی۔ اس لئے پیشتر اس کے اس سوال پر
غور ہو لیجیسلیٹو اسمبلی اور کونسل آف سٹیٹ کو اس سوال کا کھلے بندوں فیصلہ
کرنے کی اجازت ملنی چاہئے " ملا

ملکی پہلو ابھی ختم نہیں ہوتا ہے۔ سر دوپر لیفیرج نے ہندوستان کے
کے لئے اس ترجیحی سلوک کو اختیار کرنے کی اس لئے بھی سفارش کی
ہے کہ اس کے ذریعے ہندوستان والے سلطنت کے مختلف حصوں سے
برابری کے حقوق لے سکیں گے۔ اگر صاحب مذکور اپنی تجویز پر ذرا غور
کرتے تو انہیں معلوم ہو جاتا کہ یہ تو ان حقوق کے خریدنے کا معاملہ ہو جائے
گا۔ جو حقوق کہ ہندوستانی ویسے ہی مانگ رہے ہیں۔ صاحب مذکور نے
شاید اس بات کو نظر انداز کر دیا کہ ان حقوق کے لئے معاوضہ دینے کی سفارش
کرنا ہندوستانیوں کی ہتک کرنا ہے " ما

رائٹ آنریبل مسٹر سری نواس شاستری نے لندن میں ایک
اخبار کے قائمقام سے کہا تھا کہ اگر آسٹریلیا کینیڈا اور افریقہ ہمارے ساتھ
مساوات کا سلوک نہ کریں گے تو کسی ایسی بحری فوج کے خرچ کے لئے
حصہ دینا جو کہ ان کی حفاظت کے لئے کام میں آئے سخت بے عزتی کی
بات ہوگی۔ اس طرح سے جب تک کہ سلطنت کے باقی حصے ہندوستان
کے ساتھ مساوات کا سلوک کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ اس وقت

تک اُن کے ساتھ کسی قسم کی رعایت کرنا اس سے بھی بڑی بے عزتی ہوگی
اس مضمون کو ختم کرنے سے پہلے ہم مختصر طور پر اُن دلائل کو یہاں درج کر دینا چاہتے ہیں جو حفاظتی محصول کے حق میں اور بر خلاف دی جاتی ہیں۔ جیسا کہ ہم مالی محاصلات کے بیان میں بتا چکے ہیں کسی ملک کی صنعتوں کی حفاظت کئی طریقوں سے ہو سکتی ہے۔ لیکن سب سے ہر دلعزیز طریقہ حفاظتی محصول لگانے کا ہے۔ کیونکہ ایسا کرنے سے باہر سے آنے والی صنعتی اشیاء کی درآمد میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہے۔ اس کی قیمتوں میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ اور اس طرح خریداروں کی توجہ اُن سے ہٹ کر اپنے ملک میں بننے والی اشیاء کی طرف ہو جاتی ہے۔ اپنے ملک کے کارخانہ داروں کے لئے موقعہ پیدا ہو جاتا ہے۔ جس سے کہ وُہ فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

سب سے زبردست دلیل جو تحفظ کے حق میں دی جاتی ہے اور جس کی تائید سٹورٹ مِل اور مارشل جیسے آزاد تجارت کے حامیوں نے بھی کی ہے۔ وُہ یہ ہے کہ نئے ملک میں یا پرانے ملک میں نئی جاری شدہ صنعتیں کبھی فروغ نہیں پا سکتیں۔ اگر ان کو اپنے ایام طفولیت میں ہی پرانی جاری شدہ صنعتوں کے ساتھ مقابلہ کرنا پڑے۔ مثلاً اگر ہندوستان میں کاغذ دیا سلائی یا فولاد بنانے کے کارخانے اب جاری کئے جاویں تو کئی سالوں تک خرچ زیادہ ہونے۔ تجربہ کی کمی اور چھوٹے پیمانہ پر جاری کرنے کی وجہ سے ان کارخانوں میں بننے والی اشیاء بڑی مہنگی پڑینگی۔ اور ان صنعتوں کے لئے یہ ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہوگا کہ وُہ ولایت سویڈن اور امریکہ میں پچاس پچاس اور سو سو سال سے جاری شدہ

کارخانوں کے ساتھ منڈی میں مقابلہ کر سکیں۔ یہ مقابلہ برابری کا مقابلہ
نہیں ہوگا۔ یہ تو گویا ایک ننھے دودھ پیتے بچے کی ایک توی ہیکل جوان کے ساتھ
کشتی ہوگی۔ اس لئے شروع کے چند سالوں میں اس بین الاقوامی مقابلہ
کے ضرر رساں اثر سے سودیشی صنعتوں کی حفاظت کرنی ضروری ہوگی
یہ حفاظت کتنی ضروری ہے اس بات سے بھی واضح ہوگا کہ مالی تواریخ میں مثالیں موجود
ہیں جب پڑتے ملکوں کے کارخانہ داروں نے دوسرے ممالک میں
نئی جاری شدہ صنعتوں کو اُن کے بچپن میں ہی ہر ممکن طریقہ سے کچلنے کی
کوشش کی۔ قیمت ساخت سے بھی کم دام پر بیچنا تو ایک معمولی ہتھیار
ہے۔ انگریزی میں اس کو dumping کہتے ہیں۔ محصول حفاظتی
لگانے سے یہ خطرات دور ہو جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر فرض کرو ایک
گز کپڑا بنانے کا خرچ لنکاشائر میں منافع شامل کرکے ۴/ گز آتا ہے اور کرایہ
جمع کرکے وہ ۴½ آنہ فی گز کے حساب سے ہندوستان میں فروخت ہوتا ہے
لیکن ہندوستان کی ملوں میں قیمت ساخت ہی ۵½ آنے فی گز پڑتی ہے۔
تو صاف ظاہر ہے کہ آزاد تجارت کی صورت میں سودیشی کپڑے کی منڈی میں
لنکاشائر کے کپڑے کے مقابلہ میں فروخت ہونا ناممکن ہے۔ اب اگر ۱½ آنہ
فی گز باہر کے کپڑے پر محصول لگا دیا جائے۔ تو اس کی قیمت بازار میں
۶/ فی گز ہو جائے گی۔ اور اس قیمت پر نہ صرف ہندوستان کے کپڑے
کی فروخت ہی شروع ہو جائے گی۔ بلکہ دو پیسہ فی گز خالص منافع عام
منافع سے اُوپر کارخانہ داروں کو بچ رہیگا۔ کپڑے کی صنعت ایک بڑی
فائدہ مند صنعت ہو جائے گی جس کا نتیجہ یہ نکلیگا کہ نئے کارخانے کھل جائینگے
سرمایہ میں اضافہ ہوگا۔ اور صنعت کو بہت فروغ ہوگا۔ اور اخیر پر جا کر قیمت

بھی گھٹ جائیگی۔

اس لئے حفاظت کے حامیوں کی طرف سے یہ مطالبہ کیا جاتا ہے کہ کم از کم نئی جاری شدہ صنعتوں کی حفاظت تھوڑے عرصہ کے لئے ضروری ہونی چاہئیے۔ دوسری دلائل جو حفاظت کے حق میں دی جاتی ہیں۔ وہ مختصراً یہ ہیں کہ اس سے ملک میں صنعتوں کی تعداد میں اضافہ ہوگا نئے نئے پیشے کھل جائینگے۔ ہنرمند کاریگروں کی تعداد بڑھ جائیگی۔ اور اس طرح زراعت پر موجودہ بھاری بوجھ ہلکا ہو جائیگا۔ آج برسات کے نہ ہونے یا بے موقعہ ہونے سے سارے ملک میں خطرناک قحط نمودار ہو جاتا ہے۔ اور اس کی وجہ زیادہ تر یہ ہے کہ ہندوستان کی دو تہائی سے زیادہ آبادی کا گزارہ صرف زراعت پر ہے۔ حفاظت سے ملک میں بیشمار صنعتوں کو فروغ حاصل ہوگا۔ اور آبادی کا کثیر حصہ زراعت سے ہٹ کر صنعت کی طرف مشغول ہو جائیگا جس سے قحط کا داشتہ اثر کم ہو جائیگا آج کل جو ملک میں پڑھے لکھے آدمیوں کی بھرمار ہے۔ اور جو سرکاری نوکریوں کے لیے سرگرداں پھرتے ہیں۔ ان کے لئے نئے روزگار نکل آئینگے۔

ان دلائل کا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ حفاظتی محصول سے ملک کی صنعتوں کی حفاظت تب ہی ہو سکتی ہے جب اشیاء کی قیمتوں میں اضافہ ہو۔ جیسا کہ اوپر دی ہوئی مثال سے ظاہر ہے۔ لیکن ہندوستان کی آبادی آگے ہی بڑی غریب ہے۔ اور اشیا گراں ہیں۔ اس پر زیادہ گرانی غریب اور متوسط درجہ کے لوگوں کی رہی سہی کمر توڑ دے گی۔ ہندوستان کے لوگ اپنا معیار زندگی Standard of Life اونچا کر رہے ہیں۔ اور غریب لوگ بھی آگے سے آسودہ ہیں۔ گرانی اشیاء کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ

وُہ پھر اپنی پرانی حالت پر مجبور ہو کر جا پڑیں گے +

نئی جاری شدہ صنعتوں کی حفاظت عارضی طور پر ضروری ہے لیکن ہندوستان میں یہ خطرہ ہے کہ عارضی حفاظت کہیں دائمی حفاظت میں نہ تبدیل ہو جائے۔ سرکار ہند کونسل کے آگے ذمہ دار نہیں ہے۔ اور یہاں امیر سرمایہ دار لوگ دوسرے ممالک کے سرمایہ داروں کی نسبت زیادہ طاقتور ہیں۔ اس لئے جب ایک دفعہ حفاظت کا اصول سرکار ہند نے مان لیا۔ تو وُہ سرکار کو مجبور کر دیں گے۔ کہ کوئی بھی صنعت اس کے دائرہ اثر سے باہر نہ رہے۔ دوسرے ملکوں کا تجربہ بھی بتلاتا ہے۔ ہمارے ملک کی موجودہ صنعتی ترقی تقریباً ساری کی ساری غیر ملکی سرمایہ اور دماغ سے ہوئی ہے۔ کپڑے کی صنعت کو چھوڑ کر کوئی بھی صنعت ایسی نہیں ہے جس کو ہم خالص سودیشی صنعت کہ سکیں۔ سارے کارخانے انگریز و غیر ملکی لوگوں کے ہاتھوں میں ہیں۔ اس لیئے اگر آج کل حفاظت اختیار کی گئی تو اس کا فائدہ کلیتاً غیر ملکی لوگوں کو پہنچیگا۔ لیکن اس سے بھی زیادہ خطرناک بات یہ ہے کہ باہر کے لوگ ہندوستان میں حفاظتی محصول لگ جانے کے بعد یہاں بوریا بستہ اُٹھا کر ڈیرہ آن لگائینگے۔ خام مصالحہ اور مزدوری کی کمی یہاں نہیں ہے۔ سرمایہ اور دماغ اُن کے پاس ہی ہے۔ اور اس کا نتیجہ یہ نکلیگا کہ ہم ابھی سوچ ہی رہے ہوں گے۔ کہ اس اثنا میں باقی ماندہ صنعتیں بھی اُن کے ہاتھ چلی جاوینگی۔ اور ہماری ہی مزدوری ہمارے ہی خام مصالحہ سے ہمارے اپنے ہی ملک کی چار دیواری میں ہمارے سودیشی کارخانوں کے ساتھ مقابلہ شروع کر کے اُن کو تباہ کر دیں گے۔ اس لئے جب تک ہندوستان کو غیر پسندیدہ و بن بلائے مہمانوں کو باہر رکھنے کا اختیار ساتھ نہیں ملتا حفاظتی

محصول لگانے کا کچھ فائدہ نہ ہوگا۔ آزاد تجارت اور حفاظتی محصول کے اصولوں پر ہم نے یہاں بحث نہیں کی۔ ہم نے یہاں پر صرف ہندوستان کے لیئے حفاظت کے حق میں جو دلائل دی جاتی ہیں اُن کا ذکر کیا ہے۔ یہ ہم ناظرین پر چھوڑتے ہیں کہ وُہ ان دلائل کی بنا پر اپنی کیا رائے قائم کرتے ہیں +

ہندوستان کی اقتصادی ضرورت

زراعت یا صنعت

ہندوستان کی اقتصادی ضرورت کے اصلی سوال کو چھوڑ کر ہم ایک اور طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ اور ایک ایسے سوال کو حل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جو کہ اقتصادی لحاظ سے بڑا ضروری ہے

کہا جاتا ہے "کہ قدرت نے ہندوستان کو زراعتی ملک کے سانچے میں ڈھالا ہے" اور صنعت و حرفت کا کام یہاں قدرتی طور پر ہی ناممکن ہے۔ ضروری ہے کہ اپنے ملک کی ضروریات پر بحث کرتے ہوئے ہم یہ بھی دیکھ لیں کہ ہمارا معراج کیا ہے؟ کیونکہ معراج کا قائم کرنا ہی سب سے بڑا کام ہے +

آؤ! ذرا دیکھیں مندرجہ بالا قول میں کہاں تک صداقت ہے سب سے پہلے لفظ قدرت کو لیجئے۔ کیا اس کے معنے یہ ہیں کہ ہندوستان معدنیات یا دوسرے کچے مصالحہ سے خالی ہے۔ جسکی وجہ سے یہاں

صنعت و حرفت کا پھیلنا ناممکن ہے۔ اگر کچے مسالہ کی بابت کہا جاوے تو اگر ہم
چیزیں بہم نہ پہنچائیں تو ولائت کی کئی صنعتوں میں ہڑتال ہو جائے۔ اور انگلستان
کی تجارت کا ستیاناس ہو جائے۔ معدنیات کی طرف توجہ کریں اور یہ
تو سوچنا چاہئے کہ ہندوستان کی معدنیات کو نکالنے کے لئے آج تک کتنا کچھ کیا گیا
ہے۔ بڑے ذمہ دار آدمیوں کی رائے ہے کہ جس وقت ہندوستان میں
ریلوے کی اتنی بھرمار شروع کی گئی تھی۔ اس وقت ہندوستان کے لوہے
کی تجارت کو فروغ دینے کا ایک سنہری موقعہ تھا۔ جس کو کہ ہاتھ سے کھو دیا
گیا۔ ٹاٹا صاحب کے لوہے کے کارخانہ کی کامیابی نے یہ ثابت کر دیا کہ
اگر گورنمنٹ اس بات کی طرف ذرا پہلے متوجہ ہوتی تو ہندوستان میں لوہے
کی کافی تجارت ہو جاتی۔ اور ممکن تھا کہ مشینیں بھی بنانے لگ جاتے۔
دوسری قسم کی معدنیات کی بھی یہاں کمی نہیں۔ لیکن افسوس کہ اس
بات کی طرف ابھی تک توجہ ہی نہیں کی گئی۔ تو پھر قدرت کے کیا معنے
رہ گئے۔ کیا یہاں پر مشینوں کے چلانے کے لئے طاقت کا ملنا مشکل ہے
چھ سال پہلے اگر ایسا خیال کر لیا جاتا تو شاید اس میں کچھ صداقت بھی ہوتی۔
لیکن اس وقت تو کارخانوں کو چلانے کے لئے سب سے بڑی اور سب
سے سستی طاقت آبشاروں سے حاصل کی ہوئی بجلی ہے۔ جس کا ہندوستان
میں ملنا مشکل ہی نہیں ہے۔ بلکہ آسان اور ساتھ ہی زراعت کے لئے
بھی فائدہ مند ہے تو آخر قدرت نام ہے کس بلا کا؟ کیا یہ سمجھا جاتا
ہے کہ ہندوستان کے آدمی قدرتاً ہی ایسے بنائے ہوئے ہیں۔ جو کہ
اس قسم کا کام نہیں کر سکتے۔ کوئی وقت تھا کہ جب یار لوگ
ایسی بے پر کی بھی اڑایا کرتے تھے۔ لیکن اس وقت وہ لوگ بھی جن

کو سرکاری طور پر ہندوستانی عہدہ داروں سے واسطہ پڑا ہے۔ یہ مانتے ہوئے پائے گئے ہیں۔ یہ کہ اگر ہندوستانی مزدور کے حالات کو ایسا ہی بنا دیا جائے جن میں کہ اس کے مغربی بھائی رہتے ہیں تو اس کا کیا کام کسی حالت میں بھی مغربی مزدوروں سے کم نہیں ہے۔ ہاں ایک بات رہ گئی۔ وہ ہندوستان میں صنعتوں کے لیڈروں کی کمی ہو سکتی ہے۔ بینکوں کے معاملہ میں مسٹر پوکھن والا صنعت و حرفت کے معاملہ میں ٹاٹا کمپنی تجارت کے معاملے میں سر راجندر ناتھ مکرجی کی مثالیں اس قسم کی ہیں جو یہ ظاہر کرتی ہیں کہ حالات کے غیر ہوتے ہوئے بھی ہندوستانیوں نے کیا کر دکھایا ہے۔

غرضیکہ کچا مسالہ معدنیات قدرت مزدوروں لیڈروں کے لحاظ سے کہیں بھی یہ نہیں پایا جائیگا کہ قدرت نے ہندوستان کی قسمت پر زراعتی ملک رہنے کی مہر لگا دی ہے۔

خیر قدرت کی تو تشریح ہو گئی۔ اب آگے ذرا فعل کی طرف آئیے۔ "ڈھالا" ہے۔ کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ جس وقت ہندوستان قدرت کی بھٹی سے نکالا گیا تھا اس وقت ہی صنعت و حرفت میں ناقابلیت کا سکہ لگا ہوا تھا۔ یا یہ کہ مدتوں بعد ہندوستان سے یہ قابلیت کافور ہو گئی ہے۔ ذرا تاریخ کے صفحے پلٹئے اور دیکھئے کہ جس وقت ہندوستان کی تجارت کے لئے یونان۔ مصر۔ ایشیائے کوچک۔ روما۔ روس۔ جینوا ہاتھ پھیلایا کرتے تھے اس وقت کیا ہم کچی روئی بھیجا کرتے تھے۔ یا ململ کے باریک کپڑے۔ آخر مغربی قوموں میں ہندوستان کی تجارت کے لئے دوڑ دھوپ شروع ہوئی تھی۔ اور جس دوڑ دھوپ میں امریکہ اور راس اُمید دریافت ہوئی

تھی۔ اس وقت کیا یہ لوگ اپنے صنعتی اور تجارتی مال کو یہاں بیچنا چاہتے تھے۔ یا ہندوستان کی صنعت و حرفت سے فائدہ اٹھانا چاہتے تھے۔ یہ ایسے سوال ہیں کہ جن کے دو جواب دیئے ہی نہیں جا سکتے۔ ذرا یہی بتاؤ کہ ہندوستان کی لوہے کی لاٹھیں جن میں سے ایک کی بابت ایک مشہور انگریز انجینیر کا خیال تھا کہ بیسویں صدی سے کچھ پہلے دنیا کے کسی بھی کارخانے میں ایسی لاٹھ نہیں بنائی جا سکتی تھی۔ ہندوستان میں بنائی گئی تھی۔ یا کہ جرمنی یا انگلستان سے بن کر آئی تھی؟ جس وقت اٹھارہویں صدی میں ہندوستان کے بنے ہوئے جہازوں نے انگلستان میں جا کر لنگر ڈالا تھا تو انگلستان کے جہازوں کے مالک دنگ رہ گئے تھے۔ اور آخر اپنی کمزوری کی وجہ سے اوچھے ہتھیاروں پر اتر آئے۔ انگریزی بندرگاہوں میں ہندوستان کے جہازوں کا آنا بند کر دیا۔ ہندوستان کے بنائے ہوئے کپڑے پر چار سو فیصدی محصول لگانا ہندوستان کے کپڑے کی خوبی کو ثابت کرتا ہے۔ اور یہ بتلاتا ہے کہ ہندوستان سدا ہی اس معاملہ میں کمزور نہ تھا اور کہ ہندوستان کا صرف زراعت پر دار و مدار رکھنا کل ہی کی بات تھی۔ لیکن ایک بات کہی جا سکتی ہے۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ ہندوستان کی آبادی سے ۳/۴ حصہ زراعت پر ہے۔ اس لئے اس بات سے صاف ظاہر ہے کہ ہندوستان زراعتی ملک ہے۔ بہت خوب لیکن پھر بھی ملک کا کسی خاص وقت میں زراعت پر دار و مدار رکھنا اور بات ہے۔ اور اس کا قدرتی طور پر زراعت کے لئے ہی موزوں ہونا کچھ اور بات ہے۔ اگر اس قسم کے جوتشی ۱۸۰۹ء میں اضلاع متحدہ امریکہ کی حالت دیکھتے تو ممکن تھا کہ یہ امریکہ کے لئے بھی یہی فتوی صادر کر دیتے۔ ۱۸۰۹ء میں وہاں کی آبادی کا ۸۵ فیصدی زراعتی کاروبار میں

مشغول تھا۔ اتنی دور کی بات جانے دو۔ سنہ ۱۸۴۰ء میں بھی وہاں کی آبادی کا ۷۰ فیصدی حصہ زراعت کے کام میں مشغول تھا۔ سنہ ۱۸۷۰ء کیا اگر کوئی سنہ ۱۸۴۰ء میں یہی پیشین گوئی کر دیتا کہ امریکہ زراعتی ملک ہے تو اس کی پیشینگوئی کتنی غلط ہوتی۔ اس وقت امریکہ کی آبادی کا صرف ۱/۴ حصہ زراعت میں مشغول ہے۔ امریکہ کی بابت جانے دو۔ ۵۰ سال پہلے جاپان پر بھی ایشیا میں ہونے کے سبب سے یہی فتویٰ عاید کیا گیا تھا۔ لیکن اس وقت جاپان انگلستان اور امریکہ تک کی منڈیوں پر قابو پا رہا ہے۔ ان حالات کے ہوتے ہوئے اقتصادی پیشینگوئی ٹھیک نہیں۔ نہ ہی اس کو کچھ وقعت ہو سکتی ہے۔

ہندوستان میں سب سے زیادہ درآمد روئی کے کپڑے کھانڈ اور لوہے کے مال کی ہے۔ کیا اس وقت بھی اس لڑائی کے سبق سیکھنے کے باوجود بھی یہ کہا جا سکتا ہے۔ کہ ہندوستان یہ چیزیں پیدا نہیں کر سکتا۔ اگر ذرا روئی کے کپڑوں کے ہندسوں کو سرکاری نقشوں سے مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ لڑائی کے دنوں میں ان کی درآمد گھٹتی رہی ہے۔ اور ہندوستانی کارخانوں کا مال زیادہ اور زیادہ مقدار میں یہاں کھپ رہا ہے۔ کون کہ سکتا ہے کہ اگر گورنمنٹ کی پالیسی ہندوستانی کارخانوں کی حفاظت کرنا ہو جائے تو بمبئی ہندوستان کا لنکاشائر نہیں بن سکتا؟

لوہے کو لیجئے کوئی سمجھدار آدمی بھی اس امر سے انکار نہیں کر سکتا۔ کہ اگر ٹاٹا کا لوہے کا کارخانہ نہ ہوتا تو گورنمنٹ کو مشرقی افریقہ اور عراق عرب کی ضرورت کو پورا کرنا تو ایک طرف ہندوستان کی ضروریات کو پورا کرنا بھی ناممکن ہو جاتا۔ اس وقت تو لوہے کے تین کارخانے کام

کر رہے ہیں۔ اور لوہے کی تجارت کے لئے ہندوستان میں بڑا بھاری میدان موجود ہے *

ہندوستان کی قابلیت کے بارے میں گورنمنٹ نے خود لڑائی کے دنوں میں ایک بڑا بھاری ثبوت بہم پہنچایا۔ میونیشن بورڈ نے محکمہ جنگ کو ہندوستان کی وُہ وُہ چیزیں مہیا کر کے دیں۔ جن کی کبھی توقع بھی نہیں کی جا سکتی تھی۔ لڑائی نے ہندوستان کی غیر ممالک پر بھروسا رکھنے کی عادت کو ایک زبردست دھکا لگایا ہے۔ اور گورنمنٹ بھی جہاں پہلے ولایت سے ہی ہر ایک قسم کا مال منگوایا کرتی تھی اور ہندوستانی کارخانہ داروں سے حسنا رکھنا شاید باعثِ ہتک سمجھتی تھی اب اپنی غلطی کو محسوس کر چکی ہے اور اس کی تلافی کرنے کے لئے کسی حد تک تیار ہے۔ لوگ کہ اُٹھتے ہیں اس بات میں ہرج ہی کیا ہے۔ اگر ہندوستان کو زراعتی ملک کا ہی درجہ عطا کیا جائے لیکن سوال یہ ہے کہ کیا یہ درجہ ہندوستان کے سچے واقعات کی بنا پر دیا جاتا ہے۔ جس سے وُہ لوگ جو کہ ہندوستان کی موجودہ ناقابلیت سے فائدہ اُٹھاتے ہیں اس غلط اصول کا پرچار کر کے اس ناقابلیت کو مستقل بنانا چاہتے ہیں۔ تو ہندوستانیوں کو قدرتاً ہی یہ بات ناگوار گزرتی ہے کہ ہندوستان کی دولت سے جو فائدہ اُٹھایا جاتا ہے اس کو جائز ثابت کرنے کے لئے اس اصول کا پرچار کیا جاتا ہے *

بھلا اگر ہندوستان کی قسمت میں ہی زراعتی ملک رہنا ہو تو اس میں کیا ہرج ہے کہ اگر ہندوستان اپنی چیزوں کے بدلے ولایت کا مال حاصل کر لیتا ہے۔ بس چھٹی ہوئی۔ کیا ضرورت ہے کہ اس بات کو بدلنے کی کوشش کی جائے۔ لیکن ذرا تو سوچئے کہ اس قسمت

کو پڑھنے والے جوتشی کون ہیں؟ وہی جن کو موجودہ حالات کے مستقل ہونے سے فائدہ ہے۔ یہ ان کی جوتش میں یقین رکھنے کے لئے تیار نہیں ہوں ممکن ہے کہ خود غرضی کی وجہ سے وہ سپیچر کو آٹھویں گھر ہٹاتے ہوں۔ دوسرے اس بات میں ہندوستانیوں کو مال استعمال کرنے والوں کی حیثیت سے خواہ نقصان نہیں ہو۔ لیکن ذرا ان مال پیدا کرنے والوں کی حالت کا خیال کرو تو معلوم ہو جائیگا کہ اکیلی زراعت پر بھروسہ رکھنے کی وجہ سے ہندوستان میں قحط کی اتنی بھرمار رہتی ہے۔ اگر لوگ دستکاری چھوڑ کر زراعت کے کام میں لگے تو گویا وہ کام سیکھے ہوئے مزدوروں کے درجے سے گر کر بدہوؤں کے درجے میں شامل ہو گئے۔ جس کے معنے یہ ہیں کہ ان کے رہنے سہنے کا معیار گر جائے گا۔ اس کا یہ بھی ثبوت ہندوستانیوں کی فرداً فرداً اوسط آمدنی کا اس درجہ تک نہ پہنچنا ہے جس درجہ تک کہ زراعتی اشیاء کی قیمت کے بڑھ جانے کی وجہ سے اس کو پہنچنا چاہئے تھا۔ مثلاً لارڈ کرزن نے ہندوستانیوں کی آمدنی تیس روپے شمار کی تھی۔ اس وقت سے اس وقت نرخ کوئی تین گنا ہیں۔ کیا کوئی آدمی یہ کہہ سکتا ہے کہ ہندوستان کی آمدنی اب ۹۰ روپے فی آدمی ہو گئی ہے۔ غرضیکہ ان وجوہات سے یہ ضروری ہو گیا ہے کہ خواہ قدرت نے بھی ہندوستان پر زراعتی رہنے کا ٹھپہ دیا ہو وہ پھر بھی ہمت کر کے صورت بدل دیں۔

ہندوستانی صنعت

ایک ملک کی صنعتی کامیابی اور ترقی کا اندازہ کرنے کے کئی ایک طریقے ہیں۔

(۱) آبادی کی تقسیم مختلف پیشوں میں اور خصوصاً مزدوروں کی طاقت کی حالت جو کہ صنعتی کاموں میں مصروف ہوں ٭

(۲) کوئلے کی پیداوار یا طاقت کا استعمال ٭

(۳) ملک کے بینکوں کی حالت ٭

(۴) ملک کی درآمد و برآمد کی حالت ٭

ایک ملک کی صنعتی ترقی یا تنزل کا اندازہ کرنے کے لئے یہ چند بڑے بڑے اور ضروری طریقے ہیں۔ اور یہ طریقے انکم ٹیکس کے اعداد سیونگ بینک کے حساب کلیرنگ ہاوس کے اعداد۔ اندرونی بیوپار کی مقدار اور باربرداری والی تجارت کے علاوہ ہیں ٭

اب جب ہم مندرجہ بالا طریقے ہندوستان پر آزماتے ہیں تو ایک خطرناک حالت نظر آتی ہے۔ اور وہ رائے جو کہ ایک منصف مزاج قائم کر سکتا ہے یہ ہے کہ ہندوستان ابھی نہ صرف مغرب کے پرانے اور اور تجربہ کار ملکوں کے مقابلہ میں بلکہ اس طرف کے نئے اور نوجوان ملکوں کے مقابلہ میں بھی ابھی پیچھے ہے۔ ہم ان کسوٹیوں کو یکے بعد دیگرے لیتے ہیں

۱۔ انگلینڈ کی ۱۹۰۱ء کی مردم شماری کے مطابق کل آبادی کا ۵۸ فیصدی حصہ صنعت میں مشغول تھا۔

۱۳ فیصدی حصہ تجارت میں مشغول تھا ٭

۸ فیصدی حصہ زراعت میں مشغول تھا ٭

۱۴ فیصدی حصہ خانگی معاملات میں مشغول تھا ٭

مگر ہندوستان میں۔

۷۱ فیصدی حصہ زراعت اور چراگاہوں میں مصروف تھا۔

۴ فیصدی حصہ تجارت میں (جس کا نصف حصہ تجارت اشیاء خوردنی ہے) +

۲۳ فیصدی حصہ دیگر پیشوں میں +

ان اشخاص کی تعداد جو کہ کارخانوں میں کام کرنے والے تھے ۲۱۰۰۰۰۰ تھی +

اب دوسری کسوٹی پر غور کرکے معلوم ہوتا ہے +

۴ — انگلینڈ میں کوئلے کی پیداوار ۱۹۱۱ء میں ۲۷۲۰۰۰۰۰۰ ٹن تھی مگر ہندوستان میں صرف ۱۲۰۰۰۰۰۰ ٹن +

کوئلے اور پیٹرولیم کی کانوں میں مصروف اشخاص کی تعداد ۱۹۱۸ء میں ۲۶۳۵ لاکھ سے بڑھ کر ۲۱۷ ۵ لاکھ ہوگئی یعنی کہ ۱۹۰۱ء کی تعداد سے تین گنا زیادہ ہوگئی - اور کوئلے کی پیداوار بھی ایک کروڑ اسی لاکھ ٹن تک بڑھ گئی ہے - مگر پھر بھی پیداوار میں بڑا بھاری فرق صاف ظاہر ہے - اور یہ بڑا بھاری فرق اور بھی بڑھ جاتا ہے جب ہم ان دونوں ملکوں کی آبادی کا مقابلہ کرتے ہیں +

تیسرے طریقے کے متعلق -

مختلف مشہور ملکوں کے بینکوں اور ان کی مختلف شاخوں کے سرمایہ کی تعداد ذیل کے نقشہ سے ظاہر ہوتی ہے +

یونائیٹڈ سٹیٹ امریکہ :-	۲۸-۱۳	بینک مع	۲۲ ۴۸	کروڑ روپیہ سرمایہ	
یونائیٹڈ کنگڈم	،،	۹۳۵۷	،،	۸۴۸	،، ،، ،،
جاپان	،،	۲۲۲۷	،،	۴۲۰	،، ،، ،،
مگر ہندوستان صرف		۳۵۹	،،	۲۰۵	،، ،، ،،

ہندوستان کے اس سرمایہ میں وہ سرمایہ بھی شامل ہے جو کہ ایکسچینج بینکوں کا ہے۔ اور غیر ملکوں کے ساتھ بھی بیوپار کرنے کے کام میں آتا ہے +

کنیڈا کی ۷۰ لاکھ کی قلیل آبادی میں بھی ۲۰۳۲۷ بینک ہیں + اور ان کا سرمایہ ۳۲۲ کروڑ پونڈ ہے +

۴ – اب چوتھی حالت درآمد برآمد کی ہے۔ اور دیگر تجارت کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ بات خیال میں لانی ہے کہ ایک ملک کی درآمد اس ملک کی صنعتی حالت کو ٹھیک اور درست طور پر ظاہر کرنے والی ہے۔ کیونکہ اگر درآمد کثرت سے خام اشیاء کی ہے تو یہ صاف ظاہر ہے کہ ہم اُن کو سوائے اس کے اور کسی طرح استعمال نہیں کر سکتے کہ اُن سے چیزیں تیار کریں۔ جو یا تو اپنی ملکی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے ہونگی یا غیر ملکی ضروریات کو لہذا خام اشیاء کی درآمد کا بڑھ جانا ایک ملک کی صنعتی ترقی اور کامیابی کی نشانی ہے +

اعداد درآمد و برآمد

اس بارے میں وہ اعداد جن کا تعلق ہندوستان اور انگلستان سے ہے حسب ذیل ہیں :-

انگلینڈ - اشیاء درآمد [illegible]

۷۴ کروڑ کی اشیاء درآمد میں سے ۵۵۱۲۳ کروڑ کی اشیاء خوردنی اور خام اشیاء تھیں۔ جن میں کچھ کسی درجہ تک تیار شدہ تھیں اور باقیماندہ

۵۵ء۱۵ کروڑ کا ایک حصّہ اس مسالہ کا ہے جو کہ کارخانوں کے لئے تھا۔ اور یہ حصّہ علاوہ اس حصّے کے ہے جو کہ ذاتی استعمال میں خرچ ہوتا ہے۔ مگر ہندوستان میں تجارت درآمد کا ایک بڑا حصّہ ان اشیاء کا تھا جو یا تو مکمل طور پر تیار ہو کر آئی تھیں یا تیاری کے مختلف مدارج میں تھیں۔ چنانچہ ۱۹۱۳ء اور ۱۹۱۴ء کی اشیاء درآمد کا یہ فیصدی ۷۵ء۴۲ حصّہ تھیں۔

اب انگلستان کی تجارت برآمد کو لیں تو معلوم ہوگا کہ اس کی کل میزان ۷۲ کروڑ پونڈ میں سے ۴۲ کروڑ پونڈ کی اشیاء کارخانوں کی تیار کی ہوئی تھیں۔

برخلاف اس کے ہندوستان انیسویں صدی سے لے کر خام اشیاء پیدا کرنے والا ملک سمجھا جاتا ہے۔ یہ صنعتی ملکوں کے لئے خام اشیاء کی پیداوار اور بہم رسانی کے لئے ایک بڑا زراعتی میدان سمجھا جاتا ہے۔ ایک دفعہ امریکہ کے مشہور پروفیسر کیرے (Carey) نے کہا تھا کہ وہ نہیں چاہتا کہ امریکہ صرف ایک زراعتی اور کاشت کا ملک بن جائے جو کہ صرف اشیاء خوردنی اور اشیاء خام (Raw Meterial) ہی پیدا کرے۔ اور انگلینڈ ورکشاپ کے لئے ایک Plantation کا کام دے۔ لیکن ہندوستان کی عین یہی حالت بنی ہوئی ہے۔

ہماری چیزیں جو کہ باہر بھیجی جاتی ہیں زیادہ تر اناج۔ کپاس، سن۔ چمڑا اور روغنی اجناس وغیرہ ہیں۔ جو کہ تقریباً ہر سال برآمد کے نصف حصّہ سے زیادہ ہوتی ہیں۔

اگر باہر جانے والی سن کی بنی ہوئی اشیاء کو جو کہ تقریباً ۲۴ کروڑ

روپے کی لاگت کی ہیں۔ نکال دیا جائے تو خام اشیاء کا حصہ اور بھی زیادہ ہو جائے گا۔ باربرداری یا ایک جگہ سے دوسری جگہ اشیاء کو پہنچانے کے ذریعے اور جہازرانی وغیرہ (Carrying trade) کے متعلق جتنا تھوڑا کہا جائے اتنا ہی بہتر ہے۔

یہ بالکل غیر ملکوں کے ہاتھ میں ہے۔ اس جنگ عظیم سے پہلے انگلینڈ جرمنی اور آسٹریلیا نے اس باربرداری کا اجارہ لے رکھا تھا۔ مگر اب جاپان آگے بڑھا ہوا ہے۔ جو کہ اس امر واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جنگ سے پہلے ہندوستان کے ساتھ جاپان کی زیادہ تجارت انگلینڈ کے جہازوں کے ذریعے ہوتی تھی۔ مگر اب یہ باربرداری کی تجارت خاصکر تجارت متعلقہ روئی جاپانی جہازوں کے ہاتھ میں آگئی ہے۔ مگر ہندوستان کی جہازسازی فی الواقعہ کوئی ہستی نہیں رکھتی۔

انکم ٹیکس کے حساب سے ہم ایک ملک کی دستکاری صنعت وحرفت وتجارت کی آمدنی کا پورا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ لیکن یہ حساب ہندوستان کی مفلسی کو پورے طور پر واضح کرتا ہے۔ ہر ۷۵۰ اشخاص میں سے ایک شخص انکم ٹیکس دیتا ہے۔ یعنی کہ صرف ۱/۵ حصہ آبادی کی آمدنی ایک ہزار روپیہ سالانہ سے اوپر تھی۔ پھر ۲۳۱۰۰۰ آمدنیوں میں سے ۵۴ فیصدی اُن لوگوں کی تعداد ہے۔ جو کہ ایک ہزار اور دو ہزار روپیہ سالانہ کے درمیان کماتے ہیں۔ اگر ہم انکم ٹیکس کی کل آمدنی کو دیکھیں تو وہ صرف تین کروڑ روپیہ ہے۔ جو صرف ۲ر فی کس بیٹھتی ہے۔

اب اسی سال کی انگلینڈ کی انکم ٹیکس کی آمدنی کا مقابلہ کریں۔

اس سال انگلینڈ کی آبادی چار کروڑ ساٹھ لاکھ تھی۔ اس آبادی میں بارہ لاکھ آدمی انکم ٹیکس دیتے تھے۔ اور یہ ٹیکس صرف ۲۰۰ ۲ روپیہ سالانہ سے زیادہ کی آمدنی پر لگتا تھا۔ اس حساب سے ہر ۴۴ اشخاص میں سے ایک شخص ٹیکس ادا کرتا تھا۔ کتنا بھاری فرق ہے۔

ہندوستان میں تو ۷۰۰ آدمیوں میں سے ایک ۱۰۰۰ روپیہ سالانہ سے زیادہ کماتا ہے اور انگلستان میں ۷۴ آدمیوں میں سے ایک آدمی دو ہزار چار سو روپیہ سالانہ سے زیادہ کماتا ہے۔

ہندوستان کا انگلستان کے مقابلہ میں کتنا خستہ حال ہے۔

اگرچہ یہ بات سچ ہے کہ ہندوستان کا سرمایہ صنعت کے میدان میں ہر روز بڑھتا جا رہا ہے تاہم یہ کہ دینا کہ ہندوستان بہت جلد ایک صنعتی ملک بن رہا ہے مبالغہ کرنا ہے۔ چنانچہ کوئلے کی کھپت اور خرچ کو اگر صنعت کی ترقی آزمانے کا ایک طریقہ مان کر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ ۱۸۹۸ء میں ہندوستان اور جاپان میں کوئلے کی کھپت برابر تھی۔ جاپان میں پہلے کوئلہ کا خرچ ہندوستان سے تھوڑا ساٹھ تھا۔ مگر بعد میں ایک بڑے وسیع پیمانے پر بڑھ گیا۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی خیال رکھنا چاہیئے کہ ہندوستان کی زیادہ آبادی کے باعث کوئلہ کی کھپت کی ایک خاص مقدار مقابلتاً ہندوستان کی نسبت جاپان میں زیادہ صنعتی ترقی کو ظاہر کرنے والی ہوتی ہے۔ ساتھ ہی ہندوستان میں ½ حصہ کوئلے کی کھپت کا ریلوں اور جہازوں میں استعمال ہو جاتا ہے۔

اس سے ظاہر ہے کہ ہندوستان کی تجارت میں متناسب جاپان

کی تجارت سے کم ترقی ہوئی ہے۔ ایک تو ہندوستان کی صنعت کی ترقی کی رفتار ہی بہت کم ہے۔ دوسرے ہندوستانیوں نے اس صنعتی ترقی میں بہت کم حصہ لیا ہے۔ چنانچہ بڑے بڑے کارخانے زیادہ تر یورپین سرمایہ سے چل رہے ہیں۔ اور کل انتظام وغیرہ بھی انہیں کے ہاتھ میں ہے۔ ہندوستانی صرف نگرانی کا یا کلرکوں کا کام کرتے ہیں۔ یا قلیوں کا کام کرتے ہیں۔ چنانچہ آسام میں ۵۴۹ چائے کے باغات کے مالک انگریز ہیں۔ اور ہندوستانی صرف ۴۰ باغوں کے مالک ہیں۔ یہی حال قہوہ کی کاشت کا ہے۔ بنگال میں سن کے ۷۴ کارخانے انگریزی سرمایہ سے چلائے جاتے ہیں۔ اور منتظم بھی انگریز ہیں۔ کلکتہ کے مارواڑی یا تو دوکاندار ہیں یا سٹے باز +

یہ صرف روئی کی صنعت ہی ہے جس میں کہ ہم دیکھتے ہیں کہ بہت سے ہندوستانی مالک ہیں۔ ان ہندوستانیوں میں بہت سے پارسی ہیں۔ اونی۔ کاغذی۔ کھانڈ کی اور چمڑے وغیرہ کی صنعتیں بھی یورپین ہاتھوں میں ہے۔ اور بہت سی کانوں کے بھی یہی یورپین ہی ٹھیکے دار ہیں۔

ان حالات کو سامنے رکھتے ہوئے یہ کہہ دینا کہ ہندوستان صنعت میں ترقی کر رہا ہے ناوانی ہے۔ یہ سچ ہے کہ کسی کسی جگہ کوئی صنعت پھیلائی گئی ہے مگر یہ سوال نہیں ہے کہ خود ہم کہاں تک ترقی کر رہے ہیں بلکہ ہم نے دیکھنا ہے کہ آیا ہم صنعتی دنیا میں وہ جگہ لینے کے لئے ترقی کر رہے ہیں۔ یا کہ نہیں جو کہ ہندوستان کا اپنی قدرتی دولت کی بنا پر حق ہے۔ اس سوال کو سامنے رکھتے ہوئے کوئی شخص اس نتیجہ پر

پہنچے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ہم مقابلۃً دن بدن پیچھے ہی جا رہے ہیں۔ یہ بات کسی اور طرح سے پایہ ثبوت کو نہیں پہنچتی جیسی کہ اموات کے اعداد کو دیکھنے سے معلوم ہو سکتی ہے۔ اموات اور پیدائش میں تفاوت روز بروز کم ہوتی جا رہی ہے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ہم دنیا کی جد وجہد کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ جیسا کہ ہمارے بزرگ کر سکتے تھے۔ اوسط عمر کم ہو رہی ہے۔ ہماری جسمانی حالت روبتنزل ہے۔ اگر کسی چیز پر اب ہماری امید ہو سکتی ہے۔ تو وہ صنعتی انقلاب پر ہو سکتی ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ یہ انقلاب ہوگا یا نہیں؟

ہندوستان کی اقتصادی ضروریات

مشترکہ سرمایہ کی ہندوستانی کمپنیاں

موجودہ تجارتی دنیا کی پیداواروں میں سے ایک مشترکہ سرمایہ کی کمپنی بھی ہے۔ جیسا کہ بینکوں کے معاملہ میں صرافوں کا زمانہ سے اٹھ گیا ہے۔ ویسے ہی بڑے بڑے تجارتی اور صنعتی کاروبار میں انفرادی تاجروں کے دن پورے ہو چکے ہیں۔ مشینری کے استعمال نے بڑے پیمانہ پر چیزوں کا بنانا ممکن کر دیا۔ اور مختلف قسموں کی اشیاء اب بڑی بہتات میں پیدا ہو سکتی ہیں۔ ایک مشین ایک دن میں جتنا کام کر سکتی ہے شاید اتنا کام کئی ہزار آدمی ایک سال میں کر سکتے ہوں۔ لیکن جہاں پہلے ایک جولاہا اپنی معمولی سی کھڈی کے ذریعے کام کر

سکتا تھا۔ وہاں لنکاشائر کے کپڑے بڑی بڑی عالیشان مشینوں کے ذریعے تیار ہو کر آتے ہیں۔ اُن مشینوں کے بنانے کے لئے قیمت اور روپیہ دونوں درکار ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ کپڑوں کے لئے مشینوں کے تیار ہونے سے اُن کے بِکنے تک ایک بڑا فاصلہ ہو گیا ہے۔ اس فاصلہ کو کافی سرمائے کے ذریعے سے ہی عبور کیا جا سکتا ہے۔ دوسری طرف چونکہ مال بڑی بھاری تعداد میں بنایا جاتا ہے۔ اس لئے بھی کافی سرمایہ کی ضرورت ہے۔ ان دونوں باتوں کی وجہ سے سرمایہ کا سوال موجودہ تجارتی دنیا میں ایک خاص وقعت رکھتا ہے۔

کھڈی خریدنا آسان کام تھا اور اب بھی آسان ہے ہندوستانی جولاہے بھی اسے مول لے سکتے ہیں۔ لیکن خرید کر اُن کو چلانے کے لئے جیسا کہ اوپر ظاہر کیا جا چکا ہے۔ بڑے بھاری سرمائے کی ضرورت ہوتی ہے۔ سرمائے کے سوال کو حل کرنے کے لئے مشترکہ سرمائے کی کمپنیاں بنانے کا ذریعہ سوچا گیا ہے۔ اور اس قسم کی کمپنیوں کے اور بھی کئی فائدہ مند پہلو ہیں۔

سب سے پہلے تو سرمایہ کا مہیا ہو جانا ہے۔ یہ سرمایہ کئی طریقوں سے اکٹھا کیا جا سکتا ہے۔ اگر کمپنی کسی ایسے کاروبار کو ہاتھ میں لینا چاہتی ہے جس میں کچھ خطرہ تو ہے لیکن وہ عام آدمیوں کی بھی اپیل کر سکتا ہے۔ تو اس کے حصے تھوڑی قیمت کے رکھے جا سکتے ہیں۔ اگر کام ناکامیاب بھی ہو تو اگرچہ مجموعی طور پر نقصان کافی ہو گا لیکن انفرادی نقصان بہت تھوڑا ہو گا۔ اور لوگوں کے دل ٹوٹینگے نہیں۔ کمپنی انفرادی کاروبار پر ایک فوقیت رکھتی ہے۔ کہ چونکہ اس کے

حصے خریدے اور بیچے جا سکتے ہیں۔اس لئے اگر کوئی حصہ دار کام چھوڑ بھی دے تو بھی کمپنی چلتی رہیگی۔ انفرادی کاروبار میں اگر کرشن داس کام چھوڑ دے تو دوکان کا نام بدلنا پڑیگا۔ اور نئے سرے سے سارا حساب کتاب کرنا ہوگا۔ ایک اور بڑا فائدہ جو کمپنی کے طریقہ پر کاروبار کرنے میں ہے وہ یہ ہے کہ ہر ایک حصہ دار اپنے حصے کی قیمت کے لئے ہی یا ایک اور خاص تعداد کے لئے جو ہر ایک حصہ کے لئے پہلے ہی سے مقرر ہوتی ہے ذمہ دار ہوتا ہے۔ یوں سمجھئے کہ جب پیپلز بینک ٹوٹا تھا تو اگر یہ انفرادی طور پر چلایا ہوا کام ہوتا تو ہر ایک شریک کاروبار کو پیپلز بینک کے سارے قرضوں کے لئے ذمہ دار ٹھہرایا جا سکتا تھا۔ لیکن چونکہ بینک ایک مشترکہ سرمایہ کی محدود ذمہ داری کی کمپنی تھی۔اس لئے کسی حصہ دار سے اُس کے حصہ کی قیمت کی بقایا قسطیں ہی طلب کی جا سکتی تھیں۔ اور وہ بینک کے قرضوں کے لئے اور کسی حالت میں جواب دہ نہیں ٹھہرایا جا سکتا تھا۔ ذرا سوچئے اس محدود ذمہ داری کا کتنا بڑا فائدہ ہے ایک کروڑپتی یا معمولی آدمی ہی اپنے سرمائے کو مختلف کمپنیوں میں تقسیم کر سکتا ہے۔ اگر ان میں سے ایک کمپنی ناکامیاب نکلے تو اس کا وہ سرمایہ جو باقی کمپنیوں میں ہے محفوظ ہی رہیگا۔ ساتھ ہی انتظام کے معاملے میں کمپنی والے اپنے کام کے لئے بڑے کامیاب تاجروں کو معمولی تنخواہ پر ڈائرکٹر منتخب کر سکتے ہیں۔ ایسے آدمیوں کو کام میں کبھی کبھی ہی حصہ لینا پڑیگا۔ اور اس لئے اُن کی خدمات کی قیمت بھی نسبتاً تھوڑی ہوگی لیکن ہر ایک کام اُن کے صلاح و مشورے کی اسے ضرورت ہے تو اُسے ڈائرکٹر منتخب کرکے اُسے ہر ایک اجلاس میں شامل ہونے کا معاوضہ

دیا جائیگا ؁

اگر دو چار گھنٹے کے کام کے لئے یہ سو روپیہ رکھ لیا جائے اور اگر مہینے میں ڈائرکٹروں کے پانچ یا چھ اجلاس ہوں تو پانچ چھ سو روپیہ ماہوار پر ایک بڑے قابل آدمی کی خدمات کمپنی کو مل گئی ہیں۔ کمپنیاں ایک اور پہلو میں بھی انفرادی کاروبار سے بالاتر ہیں۔ ایک آدمی کا سرمایہ تھوڑا ہوتا ہے اور اس لئے اس کی ساکھ بھی نسبتاً کم ہوتی ہے۔ کمپنیوں کا سرمایہ بھی کافی ہوتا ہے۔ اس لئے ان کی ساکھ بھی بڑی ہوتی ہے۔ اس کا فائدہ یوں سمجھئے کہ گورنمنٹ ہند کی ساکھ گورنمنٹ برطانیہ سے کم ہے اس وقت تک گورنمنٹ ہند کی ساکھ پر قرضہ لیا جاتا ہے اس وقت تک شرح سود اس شرح سے زیادہ تھی جس پر کہ گورنمنٹ برطانیہ قرضہ لیتی تھی۔ لیکن جب سے گورنمنٹ برطانیہ کی ساکھ ہندوستان کے غیر ملکی قرضہ کے لئے استعمال کی گئی ہے۔ ہندوستان کے غیر ملکی قرضہ کی شرح سود گر گئی۔ جو آدمی کاروبار کو چلانے ٹھیک رستے پر لانے اور انتظام کرنے کی قابلیت کو رکھتے ہوں۔ لیکن جن کے پاس روپیہ نہ ہو وہ بھی کمپنی کی شکل کے کاموں میں حصہ لے سکتے ہیں۔ کیونکہ یہاں اس قسم کے آدمیوں کی خاص ضرورت ہوتی ہے۔ تھوڑے سرمایہ کے آدمی جو تجارتی کاروبار سے ناواقف ہوں وہ بھی مشہور کمپنیوں میں روپیہ لگا کر اس کا فائدہ اٹھا سکتے ہیں غرضیکہ کمپنیاں کئی طرح سے فائدہ مند ہیں۔

ہندوستان میں اس محدود ذمہ داری کی مشترکہ سرمایہ کی کمپنیاں کھولنے کی بڑی ضرورت ہے۔ بلا شبہ اس وقت کمپنیاں بڑی بھاری تعداد میں چل رہی ہیں۔ جون ۱۹۲۰ء میں ہی سیاسی کمپنیوں کے نام درج رجسٹر کئے گئے تھے۔ جن کے منظور شدہ سرمایہ کی مقدار کوئی ۱۶½ کروڑ روپے کے

قریب ہے - یہ نہ سمجھ لینا چاہئے کہ یہ سارا سرمایہ ادا کر دیا گیا ہے - یا اتنی مالیت
کے حصے خرید ے جا چکے ہیں - بلکہ ان کمپنیوں کا سرمایہ اس رقم تک بڑھایا جا
سکتا ہے - کمپنیاں ہر ایک قسم کے کاروبار کو ہاتھ میں لیتی ہیں - ہندوستان میں
مختلف قسم کی معدنیات اور دوسرے قدرتی ذریعے لامحدود مقدار میں پائے
جاتے ہیں - لیکن اس وقت تک ان سے فائدہ اٹھانے کا خیال بہت کم
ہندوستانیوں کو آرہا ہوگا - پچھلی لڑائی میں ہندوستان کے لئے ایک بہترین
موقعہ تھا - چونکہ باہر کے ملکوں سے چیزوں کا ملنا بڑا مشکل تھا - اس لئے
ہندوستان کی خام اشیاء کو صنعتی اور حرفتی پیداوار میں بدلنا آسان تھا - لیکن
اس وقت مشینری کا ملنا بھی مشکل تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جاپان نے بڑی
حد تک اس موقع سے فائدہ اٹھایا - اور اس وقت جاپان ہندوستان
کی تجارتی منڈیوں پر کافی قابو جمائے ہوئے ہے - لڑائی کے بعد ہندوستانی
سرمایہ داروں نے اس بات کی طرف توجہ دی ہے - اور مختلف قسم کی کمپنیاں
کھل رہی ہیں - بینک - چائے کی کمپنیاں - چمڑا کمانے کے کارخانے - انشورنس
کمپنیاں - غرضیکہ ہر ایک قسم کا کاروبار ہاتھ میں لیا جا رہا ہے - یہ ممکن ہے
کہ اگر اس قسم کے کاروبار اندھا دھند چلائے جائیں تو یہ جلدی ہی ناکامیاب
ہو کر حصہ داروں کو نقصان پہنچائیں - کیونکہ ان میں کام کرنے والے تو عموماً اپنا
کام نکال ہی لیتے ہیں - لیکن ہندوستان کی قدرتی دولت بڑی دیر تک
نظر انداز کی جا چکی ہے - اس وقت یہاں اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ
اس کو کام میں لانے کا کام بڑے بھاری پیمانے پر جاری کیا جائے - اس
کام کے لئے ہر ایک قسم کے ذریعے عمل میں لانے چاہئیں - ہندوستان میں
ہندوستانی کمپنیوں کے کھولنے کی ایک اور لحاظ سے بھی بڑی ضرورت ہے -

ہندوستانی سرمایہ دار خواہ کیسی فائدہ کے موقع کو نظر انداز کر جائیں۔ لیکن یورپین سرمایہ دار ہر ایک موقع کی تاک میں رہتے ہیں۔ ہندوستان کی کئی بڑی بڑی تجارتیں اس وقت اینگلو انڈین اور یورپین لوگوں کے ہاتھ میں ہیں۔ میسور کی کانوں سے سونا نکالنے کا کام۔ بہار میں نیل کی کاشت بنگال میں جوٹ کی تجارت۔ برما کا تیل۔ ہندوستان کی بڑی بڑی ریلیں یہ سارے کام ولائتی سرمایہ کے ذریعے سے ہی کئے جا رہے ہیں۔ جس وقت یہ کام شروع کئے گئے تھے۔ اس وقت ہندوستانی سرمایہ کی حالت خواہ کچھ ہی کیوں نہ تھی۔ اس وقت اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ ہندوستانی خود اپنی قدرتی طاقتوں کو ہندوستانی سرمائے کے ذریعے سے کام میں لائیں۔ ان ولائتی کمپنیوں کے منافع انگلستان کے لوگوں کو فائدہ پہنچاتے ہیں۔ اور ہندوستان کی قومی آمدنی میں یہ اتنا گھاٹا ہے کہ ان کے سالانہ نفعوں کے ذریعے سے ہی یورپین لوگ نئی نئی تجارتوں پر قبضہ کر رہے ہیں۔ دوسرے اس وقت لڑائی کی وجہ سے انگلستان کا اتنا سرمایہ ضائع ہو چکا ہے کہ کئی سالوں تک انگلستان ہندوستان کے لئے روپیہ بہم پہنچانے کے ناقابل ہوگا۔ یہ یاد رکھنا چاہئے کہ لڑائی سے پہلے انگلستان کے سرمایہ کا اسی فیصدی حصّہ غیر ملکوں میں لگایا جاتا تھا۔ اس وقت اس حصّے کا عشر عشیر بھی ہندوستان کو نہیں مل سکیگا۔

غیر ملکی سرمایہ کے ملکی نقصانات بھی کم نہیں ہیں۔ لوگ کہتے تو ہیں کہ تجارت کا امن کے ساتھ تعلق ہے۔ لیکن موجودہ تواریخ میں تجارت کا ملک گیری کے ساتھ تعلق رہا ہے۔ مصر پر انگریزی قبضہ انگریزی سرمایہ کی حفاظت کے لئے ہونا شروع ہوا تھا۔ چین سے جو لوٹ کھسوٹ روا رکھی گئی تھی وہ بھی

تجارتی مفاد کی خاطر تھی۔ ہندوستان کو بھی غیر ملکی سرمایہ کی خاطر خواہ قیمت دینی پڑی ہے۔ ولایت کے جو لوگ نئی اصلاحات کے بڑے مخالف تھے ان کی سب سے بڑی دلیل ہندوستان میں لگے ہوئے انگریزی سرمائے کی حفاظت تھی۔ اس وقت بھی بنگال میں اینگلو انڈین لوگوں کو ہندوستانیوں کے مقابلے میں حق رائے دہندگی بہت زیادہ دیا گیا ہے۔ ہندوستان کی ریلوے چونکہ غیر ملکی سرمایہ سے بنی تھی اس لئے ہندوستان میں ہندوستانی تاجروں کو کسی قسم کی رعایت کا ملنا بڑی بھاری مشکلات میں سے تھا۔ ہندوستان کی مالی پالیسی کو بھی بڑی حد تک اس تکلیف کا مقابلہ کرنا پڑا ہے۔ لارڈ لارنس نے جب ایک لائسنس ٹیکس لگانے کا ارادہ کیا تھا تو اُسے یہ ٹیکس آخر کار یورپین مخالفت کی وجہ سے چھوڑ دینا پڑا۔

غرضیکہ تجارتی اور ملکی دونوں پہلوؤں سے مشترکہ سرمایہ کی ہندوستانی کمپنیوں کا قائم ہونا بڑا ضروری امر ہے۔ اس وقت جاپان بھی مقابلہ کے میدان میں داخل ہو رہا ہے۔ اور یہ ضرورت بہت ہی بڑھ گئی ہے۔

دیہاتی قرضہ

وجوہات اور علاج

ہندوستان کی ۷۰ فیصدی زراعتی آبادی میں سے ۲۵ فیصدی بڑے بڑے زمیندار اور ۱۳ فیصدی زراعتی مزدوروں کو چھوڑ کر باقی ۵۲ فیصدی چھوٹے چھوٹے زمیندار ہیں۔ ان میں بہت سے مقروض رہتے ہیں۔ اور ان پڑھ بے بس ہونے کے سبب سے بڑی بھاری شرح

سود دینی پڑتی ہے۔ ایک دفعہ جو ساہوکار کے ہاتھ چڑھ جائیں تو بیچاروں
کو اس کے چنگل سے چھٹنا محال ہو جاتا ہے۔ یہ بات اس تعلق میں قابل
نوٹ ہے کہ ساری دنیا میں اوسط درجے کے زمینداروں کا یہی حال ہے
جرمنی۔ اٹلی۔ ڈنمارک وغیرہ ممالک میں بھی چند سال پہلے زمینداروں کی حالت
بڑی خستہ تھی۔ اور وہ سدا مقروض رہتے تھے۔ قرض لینا زمینداروں میں
ہمیشہ فوری ضرورت پورا کرنے کے لئے نہیں ہوتا۔ بلکہ بسا اوقات وہ
اسی لئے قرض لیتے ہیں کہ وہ قرض لے سکتے ہیں۔ کیونکہ ان کی مہاجن کے
ساکھ ہے۔ یہ دیکھا گیا ہے کہ جوں جوں زمیندار کی زمین کی قیمت
یا آمدنی میں اضافہ ہوتا جاتا ہے توں توں وہ قرض زیادہ لیتا جاتا ہے۔
زمیندار کے مقروض پن کے کئی اسباب ہیں۔ ان کی فضول خرچی
رسومات پر۔ بیجا تصرف۔ آبادی کے بڑھنے سے ناقص زمین کی کاشت
ایسی زمین کاشت کرنے والا کسان کبھی فارغ البال نہیں ہو سکتا۔
قحط سالی ہر سال ملک میں ہزاروں نئے زمینداروں کو ساہوکار اور مہاجن
کے پنجے میں پھنسا دیتی ہے۔ اور جو پہلے ہی مقروض ہیں اُن کی پشت پر
اور بوجھ ڈال دیتی ہے۔ پچھلے چند سالوں میں زمین کی قیمت و قدر میں بہت
اضافہ ہوا ہے جس سے کہ نہ صرف زمیندار کی ساکھ اور قرضہ لینے کی طاقت ہی
بڑھ گئی ہے بلکہ مہاجن لوگ جن کے پاس فالتو روپیہ کافی مقدار میں ہے
زمین لینے کو بہت خواہشمند ہو گئے ہیں۔ اور اگر ایک پارٹی زمین لینے کی خواہشمند
ہو اور دوسرے کو جس کے پاس زمین ہو پہلے ہی خواہ مخواہ قرضہ لینے کی
عادت ہو تو ضروری طور پر ایسے قرضہ جات کی مقدار میں اضافہ ہوتا ہوا۔
ہمارا انتہائے دیوانی بھی قصوروار ہیں۔ دوسری پارٹی کا بیان سننے۔

اور بغیر اس بات کی تحقیقات کئے کہ شروع میں کتنا قرضہ لیا گیا تھا۔
یک طرفہ فیصلہ صادر کر دیتی ہیں۔ یہ ایک کھلا ہوا راز ہے کہ ساہوکار لگ
۵۰ روپیہ دیکر سو کا اسٹامپ لکھوا لیتے ہیں۔ جو سود در سود اور سوائے
ڈیوڑھے وغیرہ کے حساب سے ایک ہی سال میں بڑھ کر کئی سو ہو جاتا
ہے۔ دکن میں دیہاتی آبادی نے جو ۱۸۷۵ء میں بڑے فساد کئے تھے
اور جن کی بعد ازاں تحقیقات کی گئی اُن کی تحقیقات سے مذکورہ بالا امر
کی کافی شہادت ملتی ہے۔ لیکن ہماری رائے میں اصلی سبب اس مقروض
پن کی بیماری ہندوستانی رعیت کی غربت ہے۔ ہندوستانی کسان
جیسا محنتی دنیا بھر میں اور کوئی کسان نہیں ہے۔ دن رات کام میں
ایک کر دیتا ہے۔ سارے کنبے کے آدمی اس کو کام میں مدد دیتے ہیں۔ اگر
اس پر بھی سال کے بعد فصل کے آنے سے اس کو سال بھر کھانے کو نہیں
ملتا تو اس میں اس کا کیا قصور ہے۔ معمولی معمولی سی ضروریات کو پورا کرنے
کے لئے ساہوکار کے پاس دوڑے جانے سے صرف یہ ظاہر ہوتا ہے
کہ پس انداختہ یا جمع کیا ہوا سرمایہ اُس کے پاس بالکل نہیں جس سے وہ
مشکل وقت کو عبور کر سکے۔ فضول خرچی کا الزام کچھ حد تک راست ہے۔
لیکن اس میں بھی مبالغہ سے کام لیا گیا ہے۔ دنیا کا کون ملک ہے جس
میں بیاہ شادی کے موقعہ پر غیر معمولی خرچ نہیں کیا جاتا۔ اس لئے
غریبی ہی ہماری رائے میں ہندوستانی کسان کی مصیبتوں کا سبب ہے
اور اس غریبی کی تہ میں جیسا کہ مشہور مصنف اور ارتھ شاستر کے گیاتا
رومیش چندر دت کی رائے ہے گورنمنٹ ہند کی لینڈ ریونیو یا
لگان زمین کی پالیسی ہے۔ دنیا کے کسی ملک میں کسی بھی مصنف نے

اتنا بھاری ٹیکس نہیں لگایا جاتا جتنا کہ ہندوستان میں زمین کی کاشت پر سرکاری بیان کے مطابق خالص بچت کا ۵۰ فیصدی سرکار لیتی ہے۔ اگرچہ باور کرنے کی کافی وجوہات ہیں کہ خالص بچت نکالتے وقت سرکاری افسر زمیندار کی محنت وخرچ کا الاؤنس دیتے وقت کافی کنجوسی سے کام لیتے ہیں۔ افسر بندوبست ایک خود مختار بادشاہ سے کم درجہ نہیں رکھتا۔ اس کا لفظ قانون ہے۔ جس کی عدالت میں یا صوبہ کی قانونی کونسل میں اپیل نہیں ہو سکتی۔ اور ہر بیس سال کے بعد جیسا کہ پنجاب میں رواج ہے نت نیا بندوبست شروع ہو جاتا ہے۔ اور اگر اس اثنا میں زمیندار کی حالت بہتر ہو گئی تو یہ بھی ایک زبردست دلیل سمجھی جاتی ہے کہ آئندہ کے لئے اس پر لگان زمین بڑھا دیا جاوے۔

بندوبست کے ساتھ ماتحت تو کیا اعلیٰ افسروں کی رشوت اور بھی غضب ڈھاتی ہے۔ ان ساری باتوں کا قدرتی نتیجہ یہ ہے کہ ہندوستان کا اوسط کسان ساری عمر بیل کی طرح مشقت کرتا ہوا اپنی عمر گزار دیتا ہے۔ حیرانی کی یہ بات نہیں کہ وہ مقروض رہتا ہے۔ بلکہ یہ کہ وہ زندہ کس طرح ہے۔

خیر یہ باتیں تو جملہ معترضہ کے طور پر تھیں۔ سرکار ہند نے اصلی سبب کو ٹھکرا کر اپنے خیال میں ایک فرضی مہاجن کو پیدا کر لیا جو دن رات جونک کی طرح کسان کا خون چوستا رہتا ہے جس کے چنگل میں زمیندار بری طرح پھنسے ہوئے ہیں۔ اور جس سے کہ چھٹکارا دلانا سرکار نے اپنا فرض اولین سمجھ رکھا ہے۔ چنانچہ ۱۸۸۳ء میں قانون تقاوی پاس

کیا گیا جس کا منشا یہ تھا کہ زمینداروں کو کاشت زمین، کنواں کھودنے یا بیل لینے کے لئے سرکار کی طرف سے قرضہ دیا جایا کرے جو قسطوں میں واجب الادا ہو یہ طریقہ اب تک جاری ہے لیکن اس میں چنداں کامیابی نہیں ہوئی کیونکہ قرضہ لینے میں دیری اور دقت۔ واپس کرنے میں سختی۔ اور تحصیلدار سے لے کر پٹواری تک اور تحصیل کے چپڑاسی تک کی خوشامد اور رشوت یہ ساری دقتیں اس سرکاری قرضہ کے لینے میں اُٹھانی پڑتی ہیں۔ جب گورنمنٹ نے دیکھا کہ اس طریقہ سے مہاجن نہیں مرے تو ۱۹۰۱ء میں قانون انتقال اراضی پاس کیا جس سے مہاجن تو کیا وہ تمام ہندو جن کو گورنمنٹ نے غیر زراعتی قرار دیا ہے۔ زمیندار سے زمین لے ہی نہیں سکتے۔ آخری حالت میں زمیندار کی ضمانت اُس کی زمین ہی ہے اور جب کوئی مہاجن کسی زمیندار کو قرضہ دیتا ہے تو اُس کی مرضی زمین پر قبضہ کرنے کی نہیں ہوتی۔ لیکن اس کو یہ تو حوصلہ ہوتا ہے کہ اُس کے روپے کے ضائع ہو جانے کا خطرہ نہیں ہے۔ کیونکہ یہ عمدہ ضمانت پر دیا ہوا ہے۔ سرکار کا مطلب اس قانون کے پاس کرنیکا یہ تھا کہ وہ ضمانت ہی نہ رہے جس پر مہاجن قرضہ دینے کو تیار ہو جاتا ہے اور اس طرح سے اس کا کاروبار بند ہو جاوے سرکار کا بیان ہے کہ اس کا مدعا یہ تھا کہ پنجاب کے چھوٹے چھوٹے زمیندار یعنی زمین کے مالک اپنی زمینوں سے بیدخل نہ ہو جاویں۔ لیکن اگر یہ مطلب ہوتا تو بڑے بڑے زمینداروں کو جو کہ زراعت پیشہ قرار دے گئے ہیں چھوٹے چھوٹے زمینداروں

کی زمین لینے سے روکنے کیلئے۔ کیوں نہ ایک دفعہ قانون میں ایزاد
کردی گئی؟ اور پھر زراعت پیشہ قومیں قرار دینے میں جس
طرفداری اور بے انصافی سے کام لیا گیا ہے۔ وہ پنجاب کا ہر
ایک ہندو بچہ جانتا ہے۔ ۱۹۱۳ء میں پنجاب کے چوہڑے جو عیسائی
ہو گئے ہوئے ہیں زراعت پیشہ قرار دیئے گئے جس سے
زیادہ طرفداری اور پاس مذہب کی مثال ملنی مشکل ہے۔

خیر قانون انتقال اراضی ایک منفی قانون (negative
measure) تھا جس سے زمیندار کو بانیا سے قرض لینے کے برخلاف
تو اکسایا گیا لیکن اس کو مدد دینے کا انتظام نہ کیا گیا۔ اس حالت
میں جیسا کہ اس مضمون کے شروع میں کہ آئے ہیں سرکار ہند کو
ہندوستان میں کواپریٹو سوسائٹیاں اور بینک جاری کرنے کا
خیال آیا۔ اور اس کو عملی صورت دینے کے لئے قانون پاس کیا
گیا۔ اس قسم کی سوسائٹیاں پہلے پہل دیہاتی علاقہ میں جرمنی میں
جاری کی گئیں۔ اور ان کا بانی مشہور نیک آدمی ریفین Rai
ffeisen ہوا ہے ان سوسائٹیوں کا بنیادی اصول یہ ہے کہ
فرداً فرداً قرضہ کی بجائے اگر پانچ آدمی ایک ہی جگہ کے رہنے والے
اپنی اکٹھی ذمہ داری پر قرضہ لیں تو ان کو قرضہ سستا اور زیادہ
مل سکتا ہے۔ اس اصول پر ریفین صاحب نے جرمنی کے دیہاتی
علاقہ میں کواپریٹو سوسائٹیاں بنائیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ
تحریک نہ صرف جرمنی بلکہ فرانس سوئٹزرلینڈ اٹلی ڈنمارک
وغیرہ یورپین ممالک میں بھی پھیل گئی۔ اور ان ممالک کے

زمینداروں کو مقروض بن اور ساہوکار کے پھندے سے بہت حد تک نجات ملی +

ہندوستان میں بھی اس وقت تک حیرت انگیز ترقی ہوئی ہے۔ چنانچہ اس وقت تک ۳۲۴۳۹ کواپریٹو سوسائٹیاں ملک میں بن چکی ہیں۔ جن کے ممبروں کی تعداد ۹۶۷۳۱۸ ہے مجموعی کاروباری سرمایہ ½۱۷ کروڑ روپیہ سے تجاوز کر گیا ہے۔ کیسی جگہ بھی سوسائٹی بنانے کا طریقہ بڑا سیدھا سادھا ہے۔ دس سے زیادہ اشخاص ایک ہی گاؤں کے رہنے والے جو ایک دوسرے سے اچھی طرح واقف ہوں اکٹھے ہو کر ایک مقررہ رقم آپس میں جمع کر لیں۔ اور اس میں سے ایک دوسرے کو بوقت ضرورت تھوڑا تھوڑا قرض دے سکتے ہیں جب ارد گرد کے چند دیہات میں اس قسم کی سوسائٹیاں بن جائیں تو وہ دیہات ایک یونین سوسائٹی بنا سکتے ہیں یعنی ہر ایک گاؤں کی سوسائٹی ایک مقررہ رقم دے کر اس یونین کی ممبر بن سکتی ہے۔ اور اسی طرح بہت سے یونین مل کر ضلع کے ہیڈ کوارٹر میں ایک Central بینک کی حصہ دار بن سکتی ہیں یہ سینٹرل بینک بوقت ضرورت یونین کو قرض دیگا۔ اور گاؤں کی سوسائٹی اس یونین سے قرض لے سکتی ہے۔ اور اپنے ممبروں کو کچھ زیادہ شرح سود قرض دے سکتی ہے سوسائٹی و یونین کے فنڈ جمع رکھنے وغیرہ کا کام Commercial بینک کر سکتا ہے۔

ہر ایک صوبہ میں سرکار کی طرف سے ایک رجسٹرار سوسائٹیوں کی نگرانی کے لئے مقرر ہے۔ اور اس کے ماتحت اسسٹنٹ رجسٹرار ہے

انسپکٹر اور مفت کام کرنے والے غیر سرکاری ہندوستانی ہیں۔

۱۹۱۴ء میں سر ایڈورڈ میکیگن موجودہ گورنر پنجاب کے ماتحت ایک کمیٹی کا تقرر کیا گیا۔ جس نے کہ کئی مفید سفارشات سرکار ہند کے پاس کیں۔ انمیں سے کئی ایک پر عملدرآمد کیا گیا ہے۔

باوجود وسیع ترقی کے یہ کہنا مشکل ہے کہ یہ تحریک مضبوط بنیاد پر قائم ہو گئی ہے۔ زمینداروں کی لاعلمی اور جہالت ایک بڑی مشکل ہے۔ بسا اوقات قرضہ دینے میں اپنے دوستوں اور رشتہ داروں سے رعایت روا رکھی جاتی ہے۔ اور قرضہ واپس لینے میں کوتاہی برتی جاتی ہے۔ کئی ایک دیہات میں تو کوآپریٹو سوسائٹی گاؤں کا نمبردار یا بارسوخ زمیندار اسی لئے قایم کرتا ہے کہ وہ سمجھتا ہے کہ اس تحریک کا تعلق سرکار کے ساتھ ہے۔ اور ایسا کرنے سے وہ سرکاری افسران کو خوش کر سکیگا۔

ہندوستانی مہاجن کے ساتھ جو سرکار ہند کو خداواسطے کی ضد ہے اُس کا اظہار اس تحریک میں بھی کیا گیا ہے۔ اور کوشش کی گئی ہے کہ مہاجن کو اس میں شامل ہونے کا موقع نہ دیا جاوے جس سے مہاجن بھی اس تحریک کو ناکامیاب کرنے کے درپے رہتا ہے۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ یہ تحریک محبت کی پالیسی پر مبنی ہوتی اور مہاجن کو ہندوستانی دیہاتی زندگی کا ایک ضروری فرد سمجھ کر اس کو بھی اس تحریک میں شامل کر کے اُس کی ہمدردی اور سرمایہ کا فائدہ اٹھایا جاتا۔ اس سے نہ صرف تحریک کو تقویت ہی ملتی بلکہ ایک شریف جماعت کو جس کا انگریزی راج سے پہلے ہندوستانی

زمیندار اور کسان کے ساتھ خون و پوست کا رشتہ رہا ہے۔ بگڑے ہوئے حالات میں بھی روزی کمانے کا وسیلہ مل جاتا۔ کیا "گرو بنا گت نہیں اور شاہ بنا پت نہیں"۔ کی پنجابی کہاوت کو برقرار نہیں رکھا جا سکتا تھا؟

قانون انتقال اراضی۔ کواپریٹو سوسائٹی اور تقاوی قرضجات پر اکتفا نہ رکھتے ہوئے سرکار ہند نے سود خوری کا قانون بھی پاس کیا ہُوا ہے۔ جس کی رو سے منصف کو اختیار ہے۔ کہ لکھے ہوئے اسٹامپ کی پروانہ کرتے ہوئے اصلی رقم معلوم کر کے حسب مرضی کسی رقم کی بھی ڈگری دیدے۔ جس میں سود کی رقم و شرح وُہ اپنی حسب مرضی مقرر کرے ۔

مقروض کو منصف کے ان اختیارات سے فائدہ ہُوا ہو۔ یا نہ ہو۔ اس میں شک نہیں کہ یاروں کی چاندی کھری ہے۔ اور رشوت کے بازار کو تیزی حاصل ہو گئی ہے ۔

ان تمام تدابیر پر نظر ڈالتے ہوئے بھی ہم یہ نتیجہ نکالے بغیر نہیں رہ سکتے کہ ہندوستانی زمینداروں کی بیماری کا اصلی علاج سرکار ہند سے نہیں ہو سکا اور ہندوستان کے بیشمار کسان اب بھی اتنے ہی مقروض ہیں جتنے کہ وُہ ان تدابیر کے اختیار کرنے سے پہلے تھے۔

اصلی علاج زمین کا لگان کم کرنے اور اس کو ہمیشہ کے لئے مقرر کر دینے سے ہے۔ یعنی بندوبست دوامی کر دینے

سے ہیں سے کہ زمیندار کو سانس لینے کی فرصت ملے گی۔
اور وہ دلجمعی سے اپنا کام کرلے گا ✤

گورنمنٹ کو ہر سال بیس لاکھ روپیہ زائد آمدنی نئے بندوبست کرنے سے ہوتی ہے۔ امید نہیں کہ آئندہ کے لئے اس مزید آمدنی کو سرکار چھوڑنے کو رضامند ہو۔ زمین کے بندوبست لگان کی پالیسی وغیرہ پر ہم ایک علیحدہ پچھے مضمون لکھ چکے ہیں۔ اس لئے یہاں دُہرانا بے فائدہ ہوگا ✤

تمت